balkalmati.blogsp

بانو قدسیہ

ناقابلِ ذکر

www.iqbalkalmati.blogspot.com

دو رنگی

جب میں نے اُسے پہلی بار دیکھا تو شام کی بوندا باندی میں مال روڈ بھیگ رہی تھی۔

میں جوتوں کی دوکان میں داخل ہوا، اس کے بڑے دروازے پر بیرونی جانب پل اور اندر کی طرف پُش لکھا ہوا تھا۔ دوکان میں ایئر کنڈیشنر کی وجہ سے خنکی اور ٹھنڈ تھی۔ میں اندر پہنچا تو میری نظر سب سے پہلے اس کے پیروں پر پہنچی، وہ کرسی پر بیٹھی تھی۔ سٹول پر اس کا برہنہ پاؤں تھا۔ ناخنوں پر آڑو کے شگوفوں جیسی کیوٹکس لگی تھی۔ اور سٹول کے پاس پانچ نمبر کی سینڈلوں کا انبار دھرا تھا۔ اس پاؤں کو دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ کچھ عورتوں کی ساری زینت اُن کے پاؤں ہوتے ہیں۔ اُن کا چہرہ بے نقاب ہے تو کوئی قیامت برپا نہیں ہوتی لیکن اگر اُن کے پاؤں بے حجاب سامنے آجائیں تو دل فور سٹروک سکوٹر کی طرح دوڑنے لگتا ہے۔

میں جوتوں کی دوکان میں تفریحاً داخل ہوا تھا۔ میری جیب میں اس قدر پیسے نہ تھے کہ نائیلون کی جرابیں ہی خرید سکتا۔ لیکن میں نے اس کے سامنے بیٹھ کر سابر اور پیٹنٹ لیدر کے بوٹ پہننے اور اُتارنے شروع کر دیئے۔ تھوڑی دیر بعد اُس نے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ایک سفید سینڈل پیروں میں پھنسایا اور جوٹ کے قالین پر اُٹھ کر چلنے لگی۔ گہرے نیلے قالین پر سفید سینڈلوں میں اُٹھتے اور پڑتے سفید پاؤں! میرے دل کو یک دم بریک لگ گئی۔

اس کی ایک ٹانگ میں کچھ نقص سا تھا۔ غیر واضح سا نقص۔ شاید بچپن میں پولیو ہوا ہو اور اس کے کچھ اثرات باقی رہ گئے ہوں۔ وہ کولہے پر بوجھ ڈال کر اور ایک پاؤں دبا کر چلتی تھی —— سفید سینڈلوں میں سفید ڈونگے میری نظروں سے فیڈ آؤٹ ہوگئے۔ میں نے آنکھ کا کیمرہ بند کیا اور نیا سیکونس شروع کرنے کے لئے بڑا آئینہ رو دروازہ کھول کر اس برآمدے میں نکل آیا۔ جہاں بے بی چپس بیچنے والا بارش کے رکنے کا منتظر کھڑا تھا۔

دوسری مرتبہ جب میں گھر والوں کے لئے کاغانی بکروں کے پائے خریدنے لوہاری تک پہنچا تھا تو وہ مجھے نظر آگئی۔ آج اُس نے برقعہ پہن کر نقاب اُلٹ رکھا تھا۔ مجھے پہلی بار اُس کی چال پر اعتراض ہوا تھا۔ لیکن اس بار اس اعتراض پر ہلکی سی گرد پڑ گئی اور میں کچھ فاصلے پر رہ کر اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ وہ ایک چھوٹی سی بچی کے ساتھ مسلسل باتیں کئے جا رہی تھی۔ ان باتوں کے علاوہ اُن دونوں کے منہ میں پان تھا۔ جس کا رنگ اُن کے ہونٹوں پر اس طرح اُتر آیا تھا۔ جیسے شہد میں کسی نے زعفران گھول کر ملا دیا ہو۔ بالآخر وہ ایک ایسے مکان کے سامنے جا کر رک گئی جس کے باہر ایک مشتبہ سے بورڈ پر لکھا تھا۔ نشاط آرا ریڈیو اور سٹیج فیم بچی نے دروازہ دھڑدھڑایا، ایک قوال صورت آدمی نے دروازہ کھولا اور وہ دونوں اندر داخل ہوگئیں۔ میں نے دل ہی دل میں لاحول پڑھی اور سوچنے لگا کہ کون جانے اس کا نام بے بی مشتری ہو اور یہ مویشیوں کے میلے پر لگنے والے تھیٹر میں ناچتی گاتی ہو؟ ٹانگ میں نقص رکھنے والی طوائف کا تصور آتے ہی میں نے کاغانی پائے سے بھرا تھیلا کھولا۔ جیب کی ریزگاری گنی اور گھر کی طرف چل پڑا۔

تیسری مرتبہ میری ملاقات اُس سے دن کے ساڑھے دس بجے ایک لمبے برآمدے میں ہوئی۔ میں اپنی بہن کو ایف اے میں داخل کروانے کی غرض سے کالج کے برآمدے میں بیٹھا تھا۔ یہ برآمدہ پرنسپل صاحبہ کے دفتر سے ملحق تھا اور دفتر سے بار بار گھنٹی بجنے کی آواز آتی تھی۔ برآمدے میں لڑکیوں کے ہجوم کے ساتھ ساتھ ان رشتہ داروں کا انبوہ بھی موجود تھا جو بطور سفارشی آئے ہوئے تھے۔ ایک بار جب اس گھبرائے ہوئے گروہ سے میری نظر چیر کر آگے نکلی تو میں نے دیکھا وہ پروفیسروں والا سیاہ گاؤن پہنے سیاہ تختے پر کوئی نوٹس لگانے میں مشغول تھی۔ کاغذ پر غالباً گوند لگی تھی جو بورڈ پر چپکانے کے باعث اس کی انگلیوں پر اُتر آئی تھی۔ اس چپچپاہٹ کو چھوٹے سے چیک رومال سے پونچھتی وہ میرے پاس سے گزری تو خوشی کا ایک ہلکا سا جھونکا اِدھر اُدھر پھیل گیا۔ میں نے جسارت کرتے ہوئے آواز دی ——

"مس! ——"

وہ ذرا سی گردن پیچھے کو موڑ کر رکی اور انگریزی میں بولی۔ "یس میں آپ کے لئے کیا کر سکتی ہوں ——"

اس کی انگریزی پر کونونٹ کا مانجھا چڑھا ہوا تھا۔ آواز میں ایک ترنم تھا۔ جو غالباً نشاط آرا ریڈیو اور فلم فیم سے ورثے میں ملا تھا۔

میں نے اپنی بہن کے داخلے کی مشکل بیان کی تو وہ خالصتہً سرکاری لہجے میں بولی۔ "دیکھئے اگر ان کی فسٹ ڈویژن نہیں آسکی تو انہیں کسی اور کالج میں کوشش کرنا چاہیئے داخلے کے لئے۔ یہاں تو ہم سیکنڈ ڈویژن کو بھی ENTERTAIN نہیں کر رہے۔" یہ جواب سن کر میری بہن کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

"اور اگر کوئی لڑکی اسی کالج میں پڑھنا چاہے، تھرڈ ڈویژن کے باوجود —— تو؟"

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں: www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"دیکھئے چاہتا تو انسان بہت کچھ ہے لیکن عموماً بہت کچھ مل نہیں جاتا"۔
وہ یہ جواب دیتے ساتھ ہی آگے کی جانب بڑھ گئی۔

"لنگڑ دین! بجائیے بین! — اُتراتی کس قدر ہے" — میری بہن کی آواز آئی۔

جس وقت میری بہن پرنسپل صاحبہ کے دفتر سے بھیگی ہوئی آنکھیں پونچھتی باہر نکلی تو مجھے عجیب قسم کی خوشی ہوئی۔ مجھے یوں لگا کہ جیسے لنگڑ دین پکارنے والی کو کالج میں داخلہ نہ دے کر پرنسپل صاحبہ نے مجھ پر کوئی احسان کیا ہو۔

ملاقاتوں کا سلسلہ یہاں سے یوں پھیلا کہ پاؤں تو اس کے دھنک کی طرح دھرتی پر جمے رہے اور رنگ اس کے آسمان تک تن گئے۔ ان ہی رنگوں کا جادو تھا کہ میں ہر شام ہوسٹل کے سامنے نواڑی کرسی پر بیٹھتا اور مس دلبری حیدر کی راہ تکتا رہتا۔ ایسی ہی ایک ملاقات کے دوران میں نے ایک دن دلبری حیدر سے کہا — "تمہارا نام دلبری کس نے رکھا ہے۔ بڑا واہیات نام ہے —"

اس نے میری صاف گوئی پر بُرا مان کر جواب دیا "میری چچی جان نے میرا نام رکھا تھا"

"چچی جان نے —؟"

"اُن کی چھوٹی بہن کا نام دلبری تھا، بیچاری کی ابھی نتھنی بھی نہ اُتری تھی کہ مر گئی —"

نتھنی کا ذکر ایک پروفیسر قسم کی عورت کے منہ سے سن کر میرے کان ہلنے لگے۔

"نتھنی —؟ — لیکن — نتھنی تو کنواری کوٹھے والیاں پہنتی ہیں —"

"تو میری چچی وہیں کی ہیں ناں — نشاط آرا نام ہے اُن کا چچا جان سے

شادی کر لی ہے انہوں نے اب" میں محجوب سا اس کا منہ تکنے لگا — خدا قسم آپ نہیں جانتے وہ کس قدر نیک اور پاکباز عورت ہے، ساری عمر کی کمائی میرے چچا کے پیروں میں لا ڈالی، گریٹ عورت ہے گریٹ — مجھے تو جو کچھ نشاط چچی کہہ دیں میرے لئے پتھر پہ لکیر ہو جاتی ہے"

لیکن میرے دل کے سنگِ مرمر پر اتنی جلدی لکیر نہیں پڑتی اسی لئے میں بد دل ہو کر وہاں سے اُٹھ آیا۔

اس واقعے سے پہلے ہمارے گھر کی نائین دلبری خانم کے گھر میرا رشتہ لے کر جا چکی تھی۔ واپسی پر علم ہوا کہ دلبری خانم کی ماں تو رشتہ کرنا چاہتی ہے لیکن باپ چونکہ چھ برس سے اس کی کمائی کھا رہا ہے اس لئے اسے بہت پس و پیش ہے اور وہ کہتا ہے کہ ...وں سے باہر ہرگز شادی نہ کرے گا اور سید بھی بخاری ہوں، تبھی شادی ہو سکتی ہے۔

ابھی ملاقاتیں شوکیس کی طرح آراستہ اور جگمگاتی تھیں اس لئے مجھے اپنے گھر والوں پر بہت جائز غصہ چڑھا اور میں نے گھر میں وسعتِ قلب پر وہ لیکچر دیئے کہ پنڈال میں اور کسی کو بولنے جوگا نہ چھوڑا۔ منگنی ہو جانے کے دسویں روز پتہ چلا کہ دلبری کے گھر والے سید نہیں ہیں۔ مراثی ہیں اور اُن کا شجرۂ نسب جھوٹا ہے — گھر والے مونچھ اکاتے ہوئے کووں پر تبصرہ کرتے رہے اور میں ہوسٹل پہنچا۔ دلبری چند پروفیسر نما سہیلیوں کے ساتھ فلم دیکھنے جا رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر لان کی طرف آئی۔ مجھے تھوڑی دیر کے لئے اس کی کیدو نما چال پر بہت غصہ آیا۔

"مزاج بخیر ہیں آپ کے، کچھ تیوری چڑھی ہے آج —" دلبری نے نواڑی کرسی پر پاؤں رکھ کر سینڈل کا بکل لگایا اور میری جانب دیکھنے لگی۔

"کچھ جواب نہ دیجئے گا؟"

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

میں پھر بھی چپ رہا۔

"دیکھئے میری سہیلیاں منتظر کھڑی ہیں، پہلے ہی بہت دیر ہو چکی ہے آپ وجہ تو بیان کیجئے منہ تھتھانے کی۔"

"آپ وجہ نہ پوچھئے، فلم دیکھئے۔ پہلا، دوسرا اور تیسرا شو۔" یہ کہہ کر میں اٹھا اور موٹر سائیکل کی جانب چل دیا۔

"خیر پہلا شو تو اب تک ختم ہو چکا ہوگا آپ کہیں تو دوسرا شو بھی چھوڑ سکتی ہوں۔"

اُس کی آواز میں ایک دبی سی التجا تھی۔ میں واپس لوٹ آیا۔

"آپ کے گھر والے سچ کیوں نہیں بولتے ___؟"

"اور آپ کے گھر والے سچ کا اس قدر مطالبہ کیوں کرتے ہیں ___؟"

"سچ کے بغیر کوئی رشتہ قائم نہیں ہو سکتا ہے ___"

اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک آ گئی اور وہ آہستہ سے بولی ___ "خیر میں آپ کے ساتھ یہاں اتفاق نہیں کر سکتی، میرے نزدیک جو رشتہ سچ پر قائم ہوتا ہے۔ ہمیشہ شکست و ریخت سے دوچار ہوتا ہے۔ کوئی شخص بھی سچ کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ عزیز سے عزیز شخص کو بھی ہمیشہ کونین CAPSULE میں بند کر کے پلانا پڑتی ہے۔"

اب ہم دونوں بڑی گرما گرم بحث کرنے لگے۔ جیسی بحث عموماً دو تازہ تازہ ایم اے پاسوں میں ہوا کرتی ہے۔ اس بحث میں برٹنڈ رسل اور ہکسلے کے نام بلا تکلف آنے لگے ڈیوما اور یوجین اونیل کے اقتباسات پیش کئے جانے لگے۔ ہماری بحث کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی پروفیسر سہیلیاں راہ دیکھ دیکھ کر رخصت ہو گئیں اور لان کی سبز گھاس رات کے پہلے اندھیرے میں کائی مائل نظر آنے لگی۔ جب اندھیرے نے اپنی نرم ستر پوش چادر پھیلا دی اور بحث میں ہم دونوں کی تمام بھاپ نکل گئی تو میں نے دل برداشتہ ہو کر کہا۔

"لیکن اگر آپ لوگ سید نہیں تھے تو پھر آپ نے کیوں کہا کہ"

"میں سید ہوں ماں کی طرف سے ___"

"گوت ہمیشہ باپ کی چلتی ہے ___"

"لیکن روزِ محشر ہر انسان ماں کے نام سے پکارا جائے گا۔"

معاملہ پھر روزِ محشر، صورِ اسرافیل اور معجزوں کی طرف جا نکلا اور اصل موضوع کی چھان پھٹک نہ ہو سکی۔ اتنا ضرور ہوا کہ مجھے اُس سے ملنے کے بعد اُس کی ذات سے کوئی علاقہ نہ رہا۔

شادی کی اولین تیاریوں کے دن تھے۔ میرے گھر والے چونکہ اس شادی میں اپنے آپ کو مجروح پارٹی تصور کرتے تھے اس لئے تمام اخراجات ابا جان کی طرف سے ہونے کے بجائے مجھ ناتواں کے کندھوں پر آ پڑے۔ میں نے اپنی کمپنی سے چھ مہینے کی تنخواہ ایڈوانس لی۔ لیکن اخراجات کی فہرست اتنی طویل تھی کہ چھ ماہ کی تنخواہ تو کنارا چھ سال کی پیشگی بھی اس کی متحمل نہ ہو سکتی تھی۔ میں پیسوں کے جوڑ توڑ میں لگا رہتا تھا اور ہر نرم دل آدمی سے زمانے کی مہنگائی کا ذکر اس لئے لے کر بیٹھ جاتا تھا کہ اس کے تلوں کا تیل جانچ سکوں۔ لیکن شاید ان دنوں تلوں میں تیل ہی نہیں رہا، یہ بھی مصنوعی ہی بننے لگے ہیں۔ کسی نے میری مدد گوارا نہ کی۔

جس روز میں نے دلبری سے ایک ہزار روپے مانگے اُس روز میری والدہ بری کا زیور لینے سوہے بازار جانا چاہتی تھیں، وہ روپے کا ذکر سن کر ہکی بکی رہ گئی۔

"میں تم سے ایک ہزار روپے مانگ رہا ہوں خدا قسم ادھار، پائی پائی لوٹا دوں ___!"

وہ تنکے سے دانت کریدتی رہی اور منہ سے کچھ نہ بولی۔

"ایک دوست نے چار ہزار دینے کا وعدہ کیا ہے۔ جتنی جلدی وہ رقم مل گئی ہمارے روپے لوٹا دوں گا۔"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"میرے پاس ہوتے تو کیا میں انکار کر دیتی؟"

"آخر اتنے سال کی سروس ہے تمہاری، کچھ نہ کچھ تو پس انداز کیا ہی ہوگا"

اب وہ بڑے بجھے ہوئے لہجے میں بولی۔ "اگر تنخواہ میں پوری پڑتی تو شادی کون کافر کرتا ———؟"

اس کے انکار نے گویا پہلے ہی چھپکلی کی دم کاٹ دی تھی۔ اب دھڑ بھی مفلوج ہو گیا میں بھڑک کر بولا ——— یعنی تم محض پوری ڈالنے کے لئے شادی کر رہی ہو ——— تمہیں مجھ سے محبت نہیں ہے۔"

"آپ میرا غلط مطلب نہ لیجئے ———"

"آپ کا کبھی کوئی صحیح مطلب نہیں ہوتا ورنہ میں اسے آج تک سمجھ گیا ہوتا"

وہ بھی انگریزی کی پروفیسر تھی، انگریزوں کا سا غصّہ تھا اس کا۔ فر فر انگریزی میں محققانہ قسم کا غصّہ اُتارنے لگی۔

"آپ اتنی ساری انگلش بول کر مجھے مرعوب نہیں کر سکتیں۔ ایک ہزار کی تو آپ مدد کر نہیں سکیں۔ ساری عمر کیونکر آپ میرا ساتھ دیں گی۔"

"آپ کیا مجھ سے اسی لئے شادی کر رہے ہیں کہ میں ساری عمر آپ کی مدد کروں۔ مالی مدد"

"اب فقط مالی مدد کے لئے تو انسان شادی نہیں کرتا" میں غرّایا۔

"میرے کالج کی تین پروفیسروں کی شادی اسی طرح ہوئی ہے۔ بیچاریوں نے شادی اس لئے کی تھی کہ ملازمت سے چھٹکارا ہو گا۔ اگلوں نے دم نہیں مارنے دیا۔ بیچاریاں تین تین بچوں کے باوجود پڑھانے آتی ہیں۔ ہر روز ———"

"خیر اگر میاں بیوی دونوں کام کریں تو کچھ ایسی قیامت نہیں ٹوٹتی"

"ٹوٹتی ہے ——— عورت پر ———" وہ بھرائی آواز میں بولی ———

"اخراجات بہت ہو چکے ہیں۔ ایک بیچارہ آدمی ان کی کفالت نہیں کر سکتا ———"

حالانکہ میں دلبری کو شادی کے بعد پروفیسرنی کے روپ میں نہ دیکھنا چاہتا تھا۔ لیکن اس وقت اُس کے انکار نے ہمیں پھاڑ دیا۔ پانی میں شگاف پڑ گیا ——— ہم دونوں بحث میں بُری طرح اُلجھ گئے اور اس وقت تک جھڑپیں ہوتی رہیں جب تک ان کا رنگ کافی مائل نہ ہو گیا۔

اس وقت جب درختوں سے رین بسیرا لیتی چڑیوں کی آوازیں آنی بند ہو گئی تھیں اور لڑکیاں ٹینس کے بلّے اٹھائے سفید کپڑوں میں ملبوس ہوسٹل کی جانب جا چکی تھیں۔ ہم دونوں سمجھوتے پر آمادہ ہو گئے تھے۔ بحث میں سے تمام تر بھاپ نکل چکی تھی اور اس کی اور میری آواز میں پشیمانی کا عنصر غالب تھا۔ وہ مجھے کچھ اپنی مجبوریاں اور میں اُسے اپنی مجبوریاں سمجھانے پر آمادہ تھا کہ ہیڈ گرل اچانک آ گئی اور آتے ہی بولی۔

"مس حیدر ——— ایکس کیوز می ——— آپ کا فون آیا ہے۔ جلدی آئیں ———"

"آپ میرا انتظار ضرور کریں ———" دلبری یہ کہہ کر جلدی سے آڑوؤں کے جھنڈ کی طرف چل دی۔ اس کے جانے کے بعد صرف اس کا پرس کرسی پر پڑا رہ گیا۔

اندھیرا تھا اور ایک عورت کا پرس سامنے پڑا تھا۔ میں اسے کھولنے کی رغبت پر قابو نہ پا سکا۔ پرس کھولتے ہوئے ایک بار مجھے ہلکی سی ملامت کا احساس ہوا جیسے اپنے دوست کی چغلی کرتے وقت ہوا کرتا ہے۔ پھر جب پرس کھلا اور سستے یوڈی کولون کی خوشبو اٹھی تو میں ندامت بھول کر سارے خانوں کی کنسوئیاں لینے لگا۔ اندر کچھ غیر ضروری خط، تین لپ سٹکیں دو ٹوٹی ہوئی کنگھیوں کے علاوہ ریزگاری سے بھرا ہوا ایک چھوٹا بٹوہ اور سو سو کے دس نوٹ تھے۔ میں نے پرس کو ان مانے جی سے بند کر دیا۔

جب دلبری حیدر واپس آئی تو اس کے چہرے کی لپ سٹک بالکل تازہ تھی اور چہرہ دھلا دُھلایا تھا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"سیدھی فون کر کے آرہی ہوں خدا قسم فون تو ٹیلی گرام سے بھی بدتر ہے۔ خون خشک ہو جاتا ہے میرا تو ——"

"دلبری ——"

"جی ——"

"شام کے دھندلکے آڑے آتے اور میں نے از سرِ نو مٹھا کر کہا "مجھے ایک ہزار کی ضرورت ہے"

"خدا قسم میرے پاس دس روپے بھی نہیں۔ پرس خالی ہے۔ بالکل آپ ایک ہزار کہہ رہے ہیں"

"تمہیں پچھلے دو سال کے AREARS نہیں ملے؟ —— ابھی؟"

"ابھی کہاں جی ابھی تو سٹیٹ بنک سے خط ہی نہیں آیا"

میں نے چپ چاپ اس کا پرس سامنے کیا اور سلام کر کے چلا آیا۔

منگنی نہیں ٹوٹی تھی۔ لیکن سرد جنگ دونوں طرف جاری تھی۔ ہمیں اپنا اپنا مورچہ مضبوط کرتے دوسرا ہفتہ تھا کہ ایک روز مجھے اپنے دفتر میں اس کا خط ملا لکھا تھا۔

"خدا قسم میں اس روز کی حرکت پر نادم ہوں۔ دراصل آپ کی مدد نہ کرنے کی ایک بڑی گہری اور نفسیاتی وجہ ہے۔ میری ایک دوست جو میرے ساتھ یہاں جغرافیہ کی پروفیسر ہے۔ تین سال تک ایک آدمی کی مدد کرتی رہی ہے۔ اب جبکہ اس آدمی کی حیثیت قابلِ رشک ہو چکی ہے اس نے میری دوست سے شادی کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ روپے کو درمیان میں لا کر روپیہ بھی گنواؤں اور آپ کو بھی ویسے آپ مجھے ملنے آئیں تو مجھے چشم براہ پائیں گے —— دلبری

دلبری کو اپنے لئے چشم براہ دیکھنے کا شوق مجھے سٹاف ہاؤس لے گیا۔

میں پورے دو گھنٹے لان پر بیٹھا رہا۔ شام کی سیاہی میں لان کافی مائل ہوئی پھر سیاہ نظر آنے لگی۔ لیکن دلبری نہ آئی حالانکہ وہ اندر موجود تھی۔

دوسری صبح دفتر میں مجھے اس کا فون ملا۔ ہیلو کے ساتھ ہی وہ شروع ہو گئی —— "ذرا دیکھئے جو قدم میں نے اٹھایا تھا۔ دراصل وہ آپ کو اٹھانا چاہیئے تھا۔ اگر آپ شادی سے پہلے مجھے نہیں منا سکتے تو غالباً شادی کے بعد تو آپ کا رویّہ اور بھی سخت ہو جائے گا ——"

میں نے بات کا سلسلہ توڑنے کے لئے کچھ کہنا چاہا۔ لیکن وہ فون آپریٹروں کی سی خوبصورت آواز میں بولتی گئی۔ "میں کل شام آپ کو بلا کر نہ ملنے کی معافی چاہتی ہوں۔ لیکن یہ قدم میں نے بہت سوچ سمجھ کر اٹھایا تھا۔ غالباً آپ مجبوراً آئے تھے میری خوشی کی خاطر —— آپ کو اپنی خوشی کے لئے آنا چاہیئے تھا"

اب میں کڑک کر بولا —— "اور اس بات کو کیسے پایۂ ثبوت تک پہنچایا جا سکتا ہے کہ میں اپنی ہی خوشی کے لئے آیا تھا ——"

وہ شستہ آکسفورڈ کے لہجے میں بولی —— یہ ثبوت تو آپ کو بہم پہنچانا چاہیئے۔"

نشاط آرا کی بھتیجی ایک ایسا اونٹ تھی جو کسی کروٹ نہ بیٹھ رہا تھا۔

"میرے پاس ایسے ثبوت کے لئے کوئی مؤثر طریقہ نہیں ہے"

"دیکھا —— دیکھا —— دیکھا ——"

فون میں یک دم کسی آدمی کی آواز آنے لگی وہ جھینگا مچھلی کا بھاؤ پوچھ رہا تھا۔

میں نے فون بند کر دیا اور دلبری کی لنگڑی شخصیت کو بھلانے میں مصروف ہو گیا۔

اسی تناتنی میں شادی کی تاریخ ٹھہر گئی اور ہم میں سمجھوتے کی صورت نہ نکل سکی۔ تیاریاں دونوں جانب بری طرح جاری تھیں۔ ایک روز وہ اچانک مجھے سینما گھر کے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سامنے سٹلز دیکھنی نظر آگئی۔ اس کے ساتھ گدی پر بڑا سا جوڑا بنائے ایک اور پروفیسر صورت لڑکی موجود تھی۔ دونوں ایک وجیہہ صورت ہالی وڈ ایکٹر کو دیکھنے میں محو تھیں جو مجھے بالکل احمق نظر آرہا تھا۔ میں اُس کی پشت پر کھڑا رہا اور جب وہ پلٹی تو مجھے اس قدر نزدیک پا کر ڈولی ہوا کے جھونکے سے یوکلپٹس کی کونپل۔

دلبری نے زرد سوٹ پہن رکھا تھا۔ ہاتھوں میں زرد چوڑیاں تھیں۔ بازو پہ زرد سا بر کا پرس تھا۔ ساری نشانیاں معہ چہرے پر ہوائیاں اُڑنے کے، مائیوں بیٹھی ہوئی لڑکی کی سی تھیں۔

"آپ ——"

میں نے شائستگی سے اس کی دوست کو سلام کیا اور خوش خلقی سے پوچھا۔ "آپ پنجابی فلم دیکھنے آئی ہیں؟" اس کی دوست جو غالباً جغرافیہ کی پروفیسر تھی اور دلبری کی روحانی پیشوا تھی اور جو غالباً کسی قسم کے مرد کی تین سال مدد بھی کر چکی تھی۔ مسکرا کر بولی۔ "جی جب ہم دونوں بہت اُداس ہوتی ہیں تو ہمیشہ پنجابی فلم دیکھتی ہیں۔ ہنسنے کا موقع ملتا ہے ——"

میں نے کنکھیوں سے دلبری کی طرف دیکھا۔ وہ لاتعلقی سے ابھی تک پوسٹر دیکھے جا رہی تھی۔

"ٹکٹ خرید لئے ہیں آپ نے ——؟" میں نے روحانی پیشوا سے پوچھا۔

"کھڑکی نہیں کھلی ابھی ——"

"آپ میرا انتظار اوپر چل کر کریں۔ میں ابھی ٹکٹیں لے کر آتا ہوں۔"

جب میں ڈریس سرکل کی تین عدد ٹکٹیں لے کر پہنچا تو وہ اوپر والے برآمدے میں دیواروں کے ساتھ لگی ہوئی سٹلز دیکھ رہی تھیں۔ اُن کی ہنسی کا مجھ پر خوشگوار اثر ہوا اور میں نے پاس جا کر کہا۔ "آئیے چلیں۔"

روحانی پیشوا درمیان میں، دلبری اور میں اس کے دائیں بائیں چلنے لگے۔ اسی طرح ہم سینما ہال کے اندر پہنچے اور پھر جغرافیے کی پروفیسرنی کو درمیان والی سیٹ پر بٹھا کر بیٹھے۔ جب انعامی بونڈز خریدیئے، کی سٹلز نیم اندھیرے میں سکرین پر آئی تو میں نے اپنا بازو روحانی پیشوا کی سیٹ کی پشت پر رکھا۔ جب قومی بچت کے ہفتے کا اشتہار آیا تو میرا ہاتھ دلبری کی پشت پر تھا۔ جب سگریٹ پینا منع ہے کی سٹلز دکھائی جانے لگی تو میں نے اپنی انگلیاں دلبری کے جوڑے پر رکھیں۔ لیکن جب اصلی فلم کے سنسر کا سرٹیفکیٹ دکھایا گیا اور ٹائیٹل شروع ہوا تو یکدم دلبری سیٹ پر بالکل آگے کو ہو بیٹھی اور میرا بازو اس کی سیٹ کی پشت پر لشکارہ گیا۔ سوکھی ہوئی توری منڈیر پر سے لٹک آئی۔

اس کے بعد فلم کی ہیروئن پہلی ملاقات میں ہیرو سے دوچار ہوئی۔ دو چار لمحے بعد وہ ملکِ خدائے ماست سمجھ کر ساری سکرین پر ہڑونگے بھرتی، درختوں سے لٹکتی، بچوں کی طرح ٹخنے زمین پر رگڑتی بسورتی آنکھیں بناتی محبت کا گیت گانے لگی۔ ہال میں پورا فلمی ماحول طاری ہوگیا۔

انٹرول تک پورے پانچ گانے ہو چکے تھے۔ کہانی جہاں سے چلی تھی وہیں آرکی تھی۔ البتہ ہیرو اور ہیروئن دو ڈوئیٹ گا چکے تھے۔ گاؤں کی کنواریاں گھڑے بجا بجا کر ناچ چکی تھیں اور ویلن ہیرو اور ہیروئن کو محبت کرتے دیکھ چکا تھا۔ یہ بات البتہ اُمید افزا تھی۔ کیونکہ روحانی پیشوا کا خیال تھا کہ اب فلم میں ڈراما اور سسپنس پیدا ہو گیا ہے۔ میلو ڈراما اور لمبے لمبے مکالموں کا روشن مستقبل نظر آنے لگا تھا۔

انٹرول کے دوران میں نے چائے منگوائی۔ روحانی پیشوا نے چائے بنائی۔ میں نے دلبری کی نقل میں ایک عدد کریم رول کھایا۔ جس کی کریم سے باسی ہونے کی وجہ سے کھٹی لسّی کی بو آ رہی تھی۔ انٹرول کے بعد سارا وقت گھوڑے دوڑتے رہے۔ دو چار بار لڑائیاں ہوئیں۔ ہر بار ہیرو کا پلہ بھاری رہا۔ ہیروئن نے ایسے گھر میں جہاں بہت سارے غیرت مند

www.iqbalkalmati.blogspot.com

لوگ برچھیاں اور بلم لئے غیرت کے ڈائیلاگ بولا کرتے ہیں۔ ایمن کے راگ میں بھرپور گلے کے ساتھ سیڈ سونگ گایا۔ انٹرول کے بعد میں اور روحانی پیشوا باتیں کرتے رہے۔ مایوں بیٹھی دلبری نے ایک بار بھی ہم سے کلام نہ کیا۔ جغرافیہ کی پروفیسر فلموں کی کافی رسیا لگتی تھی اور مختلف ایکٹروں کے نام اور اُن کے گھریلو حالات بھی اچھی طرح جانتی تھی۔ اس لئے وہ مجھے ساتھ ساتھ ایسی باتیں بتاتی گئی جو مجھے معلوم نہ تھیں۔

جب سکرین پر چاند تارے والا سبز جھنڈا آیا اور ہم پاک سرزمین کی تعظیم میں اُٹھے تو دلبری روئی روئی سی نظر آ رہی تھی۔ لمحہ بھر کو میں حیران سا رہ گیا۔ انگریزی پڑھانے والی پروفیسر اور پنجابی فلم دیکھ کر روئے۔ یہ بات کچھ عجیب سی لگی۔ بہرکیف دلبری کے ساتھ عجیب باتوں کا رونما ہونا عام سی بات تھی۔

جب ہم سیڑھیوں سے اُتر کر برآمدے میں آئے تو رش کی زیادتی کے باعث میں آگے آگے ہو لیا، میرے بعد روحانی پیشوا اور اُس کے بعد میں دلبری تھی۔ ایک بار دائیں بائیں سے اس قدر لوگوں کا دباؤ پڑا کہ جغرافیے کی پروفیسر نے میرے بازو پیچھے سے پکڑ کر سہارا بھی لیا۔ جب ہم ٹیکسی میں داخل ہوئے اور ٹیکسی مال روڈ پر پہنچی تو دلبری نے پرس کھولا اور ہتھیلی میری طرف بڑھا کر بولی "لیجئے ٹکٹوں کے پیسے"

"معاف کیجئے میں آپ کی طرح نہیں ہوں کہ اپنے اور آپ کے پیسوں کو الگ الگ سمجھوں" میں نے کہا۔

"حساب حساب ہوتا ہے" وہ کہنے لگی۔

"دوستی میں حساب بے معنی چیز ہے ——" میں نے پنجابی میں جواب دیا۔

وہ چپ ہو گئی پھر دونوں کالج کے بڑے پھاٹک پر آہستہ آہستہ انگریزی میں کھسر پھسر کرتی رہیں۔ تھوڑی دیر بعد روحانی پیشوا اندر چلی گئی اور دلبری پھاٹک میں آدھی اندر اور آدھی باہر ہو کر بولی "میرا خیال ہے کہ .... یہ شادی جو ہونے والی ہے

کامیاب نہیں ہو سکتی ——"

"کیا کہہ رہی ہیں آپ ——؟"

"میری اور آپ کی سوچ میں بہت فرق ہے ——"

"آپ اپنی اس دوست کو چھوڑ دیجئے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا"

وہ لمحہ بھر کو سوچنے لگی اور پھر بولی "دراصل میں کسی ایسے آدمی کے ساتھ خوش نہیں رہ سکتی جو —— دیکھئے میں ہوسٹل میں رہتی ہوں —— کیونکہ میری طبیعت گھر والوں سے مختلف ہے"

"دیکھئے میری پیدائش نومبر کے مہینے میں ہوئی ہے۔ نومبر میں جنم لینے والے لوگ عموماً ہر طرح کے لوگوں کے ساتھ نباہ کر لیا کرتے ہیں"

اب وہ ابرو چڑھا کر بولی "لیکن میرے نزدیک نباہ کرنا خوشی کی معراج نہیں ہے"

یہاں سے پھر انگریزی میں بحث کا آغاز ہوا۔ خوشی پر جو جو تھیوریاں موجود تھیں، ان پر بحث اس قدر پھیلی کہ بیچارہ ٹیکسی والا ہارن بجانے پر مجبور ہو گیا۔ میں واپس چلنے لگا تو وہ بولی۔

"دیکھئے میں سمجھتی ہوں کہ میں کسی آدمی کے ساتھ رہ ہی نہیں سکتی۔ میں MAN HATER ہوں ——"

"ایسی کوئی جنس موجود نہیں ہے ——"

"مجھے بڑے کومپلکس ہیں۔ ٹانگ کی وجہ سے"

"سب دور ہو جائیں گے ——"

اب اُس نے نظریں جھکا کر کہا —— "جس سے بھی شادی کروں گی اُسے پنجرے میں بند کر کے رکھوں گی۔ اُس کی نظروں کو باندھ کر رکھوں گی اور چونکہ ایسا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ممکن نہیں اس لئے بہتر یہی ہے کہ ——

"دیکھو دلبری کوئی واضح وجہ ہو تو مَیں پیچھے ہٹ جاؤں یہ جو تم شاخسانے چھوڑتی ہو بلاوجہ ....."

"آج ہی کی مثال لیجئے۔ آپ جب مس ترمذی سے باتیں کر رہے تھے تو مجھ سے برداشت نہیں ہوتا تھا۔ حالانکہ میں خوب جانتی ہوں کہ مس ترمذی کے ساتھ آپ کو کیا؟ میں اپنی نیچر کو کیا کروں۔ مجھ سے برداشت نہیں ہوتا ——"

"تم اپنی ترمذی کو طاق پر رکھو —— خدا قسم مجھے دیسی صورتوں سے وحشت ہوتی ہے"

اب وہ پھاٹک سے سر لگا کر بولی —— "ایک بات اور بھی ہے ——"

"اب اور کیا بات ہے؟ ——"

"آپ نے میری کرسی پر بازو رکھا اور —— دیکھئے میں شادی سے پہلے آزادیوں کی قائل نہیں ——" پھر وہ فر فر انگریزی بولنے لگی۔

اب جنسی بے راہ روی اور اس کی روک تھام پر دھواں دھار بحث ہونے لگی۔ ٹیکسی والا پہلے ہارن بجاتا رہا پھر وہیل پر سر رکھ کر سو گیا۔

جب عورت بے پناہ خوبصورت ہو تو اسے معاف کرنا بہت سہل ہوتا ہے۔ لیکن جب عورت میں صرف کشش ہو تو کئی بار یہ کشش تلاش کرنے میں مشکل در پیش ہوتی ہے۔ دلبری بحثوں میں ہمیشہ مجھ سے جیت جایا کرتی تھی۔ شاید اس کی وجہ اس کا مطالعہ تھا یا شاید اس کی وجہ اس کی وہ آواز تھی۔ جس میں نشاط آرا ریڈیو اور فلم فیم کے سُرگو بجتے تھے۔ میں ہار تو جاتا تھا۔ لیکن خوش خلقی کے ساتھ ہارنا مرد کی فطرت میں شامل نہیں ہے۔ اس بار جو دلبری نے امریکی کلچر سے حوالے دے دے کر باتیں کیں اور بیٹلز اور ہپیز HIPPIES BEATLES کا ذکر کیا تو مجھے جواب نہ بن پڑا۔ اگر وہ خوبصورت ہوتی تو میرا فیصلہ کچھ اور ہوتا۔ لیکن اس وقت اس کی کشش کچھ ماند پڑ چکی تھی۔ مجھے اس کی ٹانگ کا نقص صاف نظر آ رہا تھا۔ اس پر سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اس کے پڑھے لکھے پن سے مجھے اللہ واسطے کا بیر پیدا ہو چکا تھا۔ میں نے ٹیکسی کی طرف مڑتے ہوئے کہا "آپ ٹھیک ہی کہتی ہیں۔ مس حیدر۔ میرا اور آپ کا گذر بہت مشکل سے ہو گا۔ در اصل جس شیر کے منہ کو آدمی کا لہو لگ جائے وہ آدم خور ہو جاتا ہے اور جس عورت کے منہ کو CAREER لگ جائے وہ آدم بیزار ہو جاتی ہے۔ آپ شوق سے ساری عمر پروفیسری کریں۔ زندگی میں بڑا عہدہ پائیں اور بڑی موٹی پنشن پر ریٹائر ہوں۔ بندہ ایک سیدھی سادی ان پڑھ عورت کے ساتھ زندگی بسر کرے گا"

اس کے بعد میرے گھر تو شادی کے انتظامات جاری رہے خدا جانے دلبری کے گھر کیا ہوا۔ وہاں کوئی نیا دولہا دستیاب ہو سکا کہ نہیں۔ ہاں میرے لئے گھر والوں نے ایک خوش شکل کم پڑھی لکھی نہایت اطاعت گذار محبت کرنے والی بیوی مجھے تلاش کر دی۔ ایسی بیوی پا کر پہلے میں خوش ہوا پھر مطمئن ہوا اور بالآخر ایک ایسی زندگی گذارنے لگا۔ جس میں کوئی اشتہا موجود نہ تھی۔ ایک ذہین عورت سے شادی کرنے میں ایک خطرہ موجود ہے۔ جس طرح وہ ہر وقت آپ کو چوکنا رہنے پر مجبور کرتی ہے، وہ بذاتِ خود ترقی کی ٹریننگ ہے۔ شخصیت کی جلا کا بڑا کارآمد نسخہ ہے۔ سپر آزما آدمی کے ہتھیار کبھی زنگ آلود نہیں ہوتے۔ شادی کے بعد میں اس طرح اپنے شب و روز سے لطف اندوز ہونے لگا۔ جیسے بے نمک کی دعوت در پیش ہو۔

اس دعوت کو کھاتے کھاتے اچانک ایک شام عجیب واقعہ ہوا۔

میری بیگم نے مجھے دفتر فون کیا کہ میں چار سیٹیں شمع سینما میں بک کرا لوں۔

وہ اپنی دو سہیلیوں سمیت پونے چھ کے قریب گیلری کے پاس دائیں ہاتھ کی سٹلز دیکھ رہی ہوں گی۔ وہیں میں انہیں تلاش کر لوں۔ میں پورے پونے چھ اومنی بس سے آگے والے پل پر تھا۔

مار دھاڑ سے بھرپور ایک پنجابی فلم کا بائیسواں ہفتہ تھا۔ میں نے سٹلز کے پاس اپنی بیوی کو تلاش کیا پھر برآمدے میں دیکھا، سیڑھیاں چڑھ کر اوپر ڈھونڈا۔ اسی تلاش اور انتظار میں ساڑھے چھ ہو گئے تو میں گیٹ کیپر کے پاس پہنچا اور اسے سمجھا دیا کہ ابھی تھوڑی دیر میں کچھ خواتین آنے والی ہیں۔ اُن کی ٹکٹیں میرے پاس تھیں میں اندر اُن کا انتظار کروں گا۔

ہال میں ابھی اندھیرا نہ ہوا تھا۔ موسیقی جاری تھی۔ مجھے سگریٹ پینے کی طلب ہو رہی تھی۔ لیکن ہال کی خنکی نے ایسا سکون پہنچایا کہ میں اپنی سیٹ میں جا بیٹھا۔ پاس کی پانچ سیٹیں خالی تھیں اور سامنے والی قطار میں ایک جانا پہچانا سر نظر آ رہا تھا۔ وہی نیم سنورے نیم بکھرے بال وہی گردن پر بڑا سا جوڑا ——— میرا دل بجھ گیا۔

پھر دلبری نے مڑ کر مجھے سلام کیا اور مسکرا دی۔

میں اپنی سیٹ چھوڑ کر اگلی قطار میں پہنچا اور اس کے پاس والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ مجھے اسے دیکھ کر ایسی خوشی ہوئی جیسے اپنا کوئی ہم وطن دیارِ غیر میں مل جائے۔

"کیسی ہیں آپ ———"

"ٹھیک ہوں ———"

"اسی کالج میں ہیں ابھی تک ———"

"ابھی تک وہیں ہوں ———"

"اور کوئی قابلِ ذکر بات؟" ——— میرا اشارہ اس کی شادی کی طرف تھا۔

"کوئی قابلِ ذکر بات نہیں ——— ہوئی فی الحال۔"

"آپ ——— نے شادی نہیں کی ابھی تک؟"

وہ مسکرا دی۔ بتیاں بجھ گئیں اور سکرین پر پہلی سلائیڈ آئی ——— "پاک وطن کو پاک صاف رکھئے۔"

اندھیرے نے باتوں کو آسان کر دیا۔

"لیکن آپ نے شادی کیوں نہیں کی ابھی تک؟"

ہلکی سی آہ بھر کر وہ بولی ——— "زندگی میں بار بار اپنی پسند کا آدمی بھی تو نہیں ملتا۔"

"یعنی آپ ——— آپ ———"

"فی الحال تو میری بس چھوٹ چکی ہے۔"

اس وقت نیم اندھیرے میں انعامی بونڈز کی سلائیڈ کے ساتھ میری بیوی اپنی دو سہیلیوں کے ساتھ گیلری کے دروازے پر برآمد ہوئی۔ یکدم اندھیرے میں آ جانے کے باعث وہ سب سُن سی گیلری کے شروع میں کھڑی تھیں۔ میں چپکے سے اُٹھا اور پچھلی قطار میں آ کر بیٹھ گیا۔ جب سگریٹ پینا منع ہے کی سلائیڈ جاری تھی تو ایک لمبا سا آدمی میرے پاس سے گزرا اور سامنے دلبری کے پاس والی سیٹ پر جا بیٹھا۔ پھر اس نے اپنا بازو پھیلا کر دلبری کی سیٹ پر رکھا۔ دونوں کے ہنسنے کی آواز مجھ تک کوڑیالے سانپ کی طرح لہرائی۔

دلبری نے اپنا سر اس بازو پر ٹیک لیا۔

جس وقت فلم کے سنسر کا سرٹیفکیٹ دکھایا جا رہا تھا۔ میں نے اپنی بیوی سے معذرت طلب کی اور ہال سے باہر نکل آیا۔

خدا جانتا ہے کہ آج تک پھر کسی سینما گھر میں گھسنے کا حوصلہ ہی نہیں پڑتا خدا جانے کیوں؟

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پابند

ڈی سی ٹن بیگانہ وار اُڑتا جا رہا ہے۔ اس وہیل مچھلی کو کیا معلوم کہ اس کے سفید پیٹ کے اندر حضرت یونسؑ کی طرح کئی ذی روح رہائی کی آرزو میں تڑپ رہے ہیں۔ اُن کے دلوں میں کسی اور ساحل پر اُگلے جانے کی آرزو ہے اور وہ کسی اور سمت میں اس کھال کے اندر سوار چلے جا رہے ہیں۔ چلے جا رہے ہیں۔ کوئی نکل نہیں سکتا، اتر نہیں سکتا، سمت بدل نہیں سکتا!

مصیبت اس ہوائی جہاز کی وجہ سے پیدا نہیں ہوئی۔ ہوائی جہاز کا تو محض اتنا قصور ہے کہ وہ مجھے ایک ایسی سمت اڑائے لئے جا رہا ہے۔ جدھر میں جانا نہیں چاہتی۔ اصلی خرخشہ تو کسی اور بات سے پیدا ہوا، ساری تباہی تو اُس وقت آئی جب میں نے اپنے اندر جھاڑو پھیر کر اگر بتیاں سلگائیں، عرق گلاب چھڑکا۔ پھر کسی پوست پوش فقیر کی طرح زانو ٹیک آسن میں بیٹھی اور اپنے آپ سے قسم کھالی.....

قسم انسانی دل کو عجیب طور پر شکنجے میں کس دیتی ہے۔ قسم جھوٹی بھی ہو تو بھی بیگانہ پکڑ لیتی ہے۔ وعدہ چاہے توڑنے کی آرزو سے ہی کیوں نہ کیا جائے آخر کو بے تقصیرا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہی آدمی پکڑا جاتا ہے۔ قسم چاہے اندر کھائی جائے کسی کے روبرو، یہ ہمیشہ جی کا جنجال بن جاتی ہے۔ آدمی بوتل میں بند ہو جاتا ہے اور انسان کب تک بوتل میں بند رہ سکتا ہے۔ چاہے وہ بوتل کٹ گلاس کی ہی کیوں نہ ہو؟

قصور اس سفید وہیل مچھلی کا نہیں جو مجھے کراچی کی طرف اڑائے لئے جا رہی تھی ..... بلکہ سارا ٹنٹا اسی قسم کا ہے۔ اس گھر کے بھیدی نے مجھے ایسے اپنی گرفت میں لے رکھا ہے۔ جیسے بڑا اژدہا سرخ بندر کو اپنے بلوں میں بلوتا ہے۔ جس وقت میں نے اپنے آپ سے قسم کھائی تھی بارہ بارہ کلومیٹر پر کوئی انسان گواہی کے طور پر موجود نہ تھا۔ کوئی ثبوت، سٹام، کاغذ ایسا نہیں جو مجھ پر میری قسم کا دعویٰ کر سکتا ہو۔ لیکن کسی انہونی قوت نے مجھے پوری طرح دبوچ رکھا ہے اور میں اس جھنور جال سے نکل نہیں سکتی۔

پتہ نہیں کیوں قسم سے آدمی تعویذا جاتا ہے؟ ـــــ وہ لوگ بھی جو بار بار قسم کھا کر توڑنے کے عادی ہیں، وہ بھی قسم توڑتے وقت اپنے ثقل سے ضرور ہل جاتے ہیں۔ قسم میں سب سے بڑی قباحت یہ ہے کہ اس میں دعویٰ کی شکل پیدا ہو جاتی ہے۔ پھر اس دعویٰ پر نظرثانی، تخفیف و اضافہ، کسی قسم کی تحریف و تصرف کا مجاز نہیں رہتا یا یوں سمجھ لیجئے کہ انسان جو محرک پیدا ہوا ہے۔ یکدم منجا جاتا ہے۔ جو چیز طبعاً سیال ہے۔ ٹھوس میں بدل جاتی ہے۔ ثقل سے آزاد رہنے کی خاصیت ختم ہو جاتی ہے اور آدمی دعویٰ کی سمت کا پابند ہو جاتا ہے۔ قسم کھاتے ہی وعدے کی متوازی پٹڑیاں بچھ جاتی ہیں اور ان پر قسم کا سیاہ ڈیزل انجن بڑے تکدر سے ان مانے جی سے رک رک کر چلنے لگتا ہے۔ قسم کھاتے ہی پابندی کا حصار خود بخود راہ کھوٹی کرنے کو کھڑا ہو جاتا ہے۔ جس طرح ماڈرن چھوٹا بچہ اپنے بے بی واکر میں چلتا تو ضرور ہے لیکن وہ دائرے سے آزاد نہیں ہو پاتا۔ ایسے ہی قسم کھاتے ہی وعدے کا ہالہ کہیں سے آکر گھیرا ڈال لیتا ہے۔ چاند کے گرد بھی ایسا ہی ہالہ ہوا کرتا ہے۔ جہاں کہیں بھی چاند خوش خرامی کرتا چلا جائے ہالہ رسی ٹاپتا ساتھ ہی پہنچ جاتا ہے۔

چھوٹے موٹے وعدے، چھوٹی چھوٹی قسمیں ـــــ سب ریگال کی طرح دل کے ہونٹوں پر پھرتی رہتی ہیں؛ اور جب تک زندگی دل کے اوپر ہاتھی کے چمڑے کا کیس نہیں بن جاتی ... ہرا دیتی تکلیف دیتی ہیں۔

ہوائی جہاز نیلے آسمانوں کو چیرتا آگے بڑھ رہا ہے۔ مجھے وہ دعائیں یاد نہیں جو اس وقت پر پڑھنی چاہئیں صرف میرے اندر کی قسم مجھے ایسے گھسیٹے لئے جا رہی ہے جیسے میں ایک باد پا رہوار کی کاٹھی سے گر کر صرف ایک پاؤں اس کی رکاب میں پھنسائے گھسٹتی جا رہی ہوں۔

جب میں نے قسم کھائی تھی تو مجھے معلوم نہ تھا کہ حصول وعدہ دنیا کی مشکل ترین شے ہے۔ حاسد اور بدخواہ حالات ہمیشہ اس تاک میں رہتے ہیں کہ وعدہ کرنے والے اپنے ضابطے ... اپنی راہ ریت سے ہٹ جائیں۔ آپ آزمائش کے طور پر کسی سے وعدہ کر لیں اور پھر وعدے کو پختہ کرنے کے لئے کوئی ادنیٰ سی قسم بھی کھا لیں کہ آپ پورے آٹھ بجے اسے یونیورسٹی کے بس سٹاپ کے سامنے ملیں گے۔ اس کے بعد آپ تجربہ کریں گے ہر نوعیت کی رکاوٹ، ... دیاتی، منہ زور اپن حالات کا جزو بن جائے گا۔ اس روز جب آپ آٹھ بجے کا وقت ... کے مرتکب ہوئے ہیں، عین اس روز صبح آپ کا الارم دغا دے جائے گا۔ آپ ازل ... نماز پڑھنے کے عادی ہوں گے۔ لیکن اس روز نہ سورج آپ کو جگا سکے گا نہ مکھیاں اور آپ پونے آٹھ بجے تک سوتے رہ جائیں گے۔ پھر آپ بھاگم بھاگ غسل خانے جائیں گے اور ... وقت آپ کا سارا جسم جھاگوں جھاگ ہو جائے گا۔ کمیٹی کے نلکے سے پانی آنا بند ہو جائے گا۔ ہمسائے کے ہینڈ پمپ سے پانی کی بالٹی لانے تک کئی اور مزاحمات درپیش ہوں گی۔ پھر آپ ایک پیالی چائے کی خاطر جب میز کے کنارے بیٹھیں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ نہ گجر ... آج صبح آیا ہے نہ گھر پر چینی ہے ـــــ آپ خالی قہوہ پی کر جس وقت بس سٹاپ پر پہنچیں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

گے تو اِرد گرد کی تمام گھڑیوں میں ...... پونے نو کا وقت ہوگا اور جن صاحب سے آپ نے وعدہ فرمایا ہوگا وہ آپ پر وعدہ فراموش کا لیبل لگا کر رخصت ہو چکے ہوں گے۔

جس طرح شیشے کے اندر ایک اندرونی سٹرین ہوتا ہے۔ بظاہر بہت مضبوط اور ثابت نظر آتا ہے لیکن ذرا ٹھنڈے گرم کا تحمل نہ پا کر اپنے ہی انجر پنجر ڈھیلے کر لیتا ہے' ایسے ہی وعدے کے اندر بھی ایک انٹرل سٹرین ہوتا ہے۔ قسم کے اندر بھی ایک خاص قسم کا سدِ باب موجود ہوتا ہے جو ناکامی کو ہر وقت ماحول سے یوں اخذ کرتا ہے جیسے بہتے پانیوں کے نیچے خود بخود روڑے پتھر جمع ہو جاتے ہیں۔

یہ سچی بات ہے کہ جس وقت میں عامر سے ملی میرا آسمان بالکل صاف تھا۔ جون کے تپتے مہینے میں اس پر کوئی بدلی نہ تھی۔ بی اے کئے مجھے چار سال ہو چکے تھے۔ شادی ہونے کی کوئی اُمید نہ تھی۔ نوکری سے خوف آتا تھا۔ میری زندگی مکمل طور پر روزمرہ کی پابند ہو چکی تھی اور جیسے گویئے لوگ ریاض کے چکر سے نہیں نکل سکتے میں بھی ہر دن اکتاہٹ' بدمزگی، لاپرواہی کے دائرے سے نہ نکل سکتی تھی۔ میں گھر کے پھاٹک کو اپنا اُفق سمجھتی تھی۔ ان دنوں میں نیوٹن کے قانون کی بہترین تفسیر تھی۔ بقول نیوٹن میں INERTIA تھی۔ بیرونی طاقت کے بغیر کوئی چیز میری سپیڈ یا مومینٹم توڑ نہ سکتی تھی ——— اور اگر عامر میری زندگی میں قوت بن کر نہ آیا ہوتا تو میں بغیر کسی چیخ چلہاڑ کے اپنی زندگی کے بقیہ دن ایسے ہی گزار دیتی جیسے انجن کا کرینک شافٹ۔ آگے پیچھے ——— آگے پیچھے ———

لیکن جالِ خدا نما بن کر عامر آیا اور پھر ہر گوشہ ہر سمت منوّر ہو گئی۔ اندھیرے میں یہ وصف ہے کہ آنکھ اُس میں کچھ نہیں دیکھتی اور اُجالے میں یہ خوبی ہے کہ جس چیز پر پڑے اس کے تمام زاویے، رنگ، شیپ واضح ہو جاتے ہیں۔ جونہی عامر کی گوہر دار کرنیں مجھ پہ پڑیں۔ میں سب کو نظر آنے لگی۔ اس سے پہلے میرا مسئلہ یہ تھا کہ کاش میں کسی کو دکھائی دے جاؤں، کسی شادی پر، کسی ماتم کی گھڑی، سینما گھر میں، چاٹ کھاتے ہوئے، کپڑا خریدتے

سمے، کار سے اُترتے ہوئے، ٹرین پر چڑھتے ہوئے ——— پر میں اندھیرا تھی اور انسانی آنکھ کے راڈ اور کونز اندھیرے کے آگے معذور تھیں۔ مجھ پر عامر کی روشنی پڑی تو میں سب کو نظر آئی۔

میرا رنگ پکا سانولا اور قد چھوٹا تھا۔ جسم میں اُن جگہوں پر گوشت نہیں تھا۔ جہاں ہونا چاہیے اور وہاں وافر تھیں تھیں۔ جہاں لوگ عموماً نشیبوں کے آرزومند ہوتے تھے۔ اس پر آواز میں قدرتی میٹھاپن بوتل سے پانی نکلنے کی آواز سے کوسوں دور ——— ناک چھدی ہوئی تھی پر لوگوں کے تمسخر کی وجہ سے ناک میں کچھ ڈالنے کی ہمت نہ تھی۔ چوڑیاں، انگوٹھیاں نکلس سب مجھ پر بیکار رہتے۔ کاسنی، سبز، گلابی، نیلا ——— لڑکیوں والے یہ تمام رنگ مجھ پر آتے ہی بارِ حیات ہو جاتے ——— مجھے کالج میں تمام لڑکیاں کچھ نہ کچھ مشورے دیتی رہتی تھیں۔

"ہائے سمن بازوؤں پر ویکس ہی کر لیا کرو ——— اتنے بھالو بال تم کیسے برداشت کرتی ہو ———"

"سمن ہلکے رنگ پہنا کرو ——— تمہارے جیسی رنگت پر ہلکے پھلکے رنگ اچھے لگتے ہیں"

"اے سمن جی گہرے رنگ پہنا کریں۔ ڈارک براؤن، میرون، نیوی بلو، ان گلابی پیلے رنگوں کو چھوڑ دیں۔ یہ شفاف رنگتوں کے لئے رہنے دیں آپ ....."

اپنے آپ کو سجانے بنانے کے مرحلے سے میں جلدی فارغ ہو کر بادامی، اودے اور سفید کپڑے پہننے لگی۔ کبھی کبھی جی چاہتا کہ کانوں میں سفید موتیا کی کلیاں پہن کر کالج جاؤں لیکن دونوں بالے پرو کر میں فریج میں رکھ دیتی اور انہیں پہن کر کالج نہ جا سکتی۔ شروع سے مجھے چھیدنا آسان تھا۔ کیونکہ بدقسمتی سے میں لوگوں کی رائے کے سہارے زندہ تھی۔ میری آرزو تھی کہ میری سہیلیاں اور گھر والے کم از کم اس قدر سچ کہنے کے مرتکب نہ ہوں۔ لیکن عامر نے مجھے کچھ ایسی نظروں سے دیکھا کہ پھر میری ذات کے سارے کیچڑ میں کنول کے پھول اُگ آئے اور میں شفاف تال کی طرح نظر فریب ہو گئی۔ یہی نظر کا سب سے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بڑا معجزہ ہے۔ اگر نظر میں سرزنش ہو تو یہ دھنیے کی طرح دھنک کر دھر دیتی ہے۔ اگر نگاہ میں محبت ہو تو اس کے پڑتے ہی تہذیب ہونے لگتی ہے اور گدھے کی کھال اُتر کر گھوڑے کی پشم اُگنے لگتی ہے۔ شاید اسلام میں اسی لئے نظر نیچی رکھنے کا حکم ہے کہ لوگ اس کی باڑ سے محفوظ رہیں اور توڑے کو آگ نہ دکھائیں کہ پھر انسان کمزور ہے اور دنیا میں سب سے زیادہ معجزے پر ہی مرتا ہے۔

عامر سے میری ملاقات ڈاکٹر قاسم کے کلنک پر ہوئی ـــــ بائیس برس کی عمر میں دو داڑھیں نکلوا چکی تھی۔ میں ڈینٹل سرجن کے ویٹنگ روم میں بیٹھی تھی۔ میرے چہرے کے عین سامنے غسل خانے کا دروازہ تھا جس پر موٹے موٹے بلاک لیٹرز میں لکھا تھا ـــ "یوز می" ـــــ ہر بار جب میری نگاہ دروازے پر پڑتی مجھے لگتا۔ جیسے دروازے پر کسی نے میری ضرورت کو بے نقاب کر دیا ہے۔ میں سیاہ پلکوں کو سیاہ گالوں پر چسپاں رکھنا چاہتی تھی۔ جب عامر اندر سرجن کے کمرے سے نکلا اور غسل خانے میں داخل ہو گیا۔ اُس نے دروازہ بند کرنے کی زحمت نہیں کی اس لئے سنک پر جھکے ہوئے اس کو میں بخوبی دیکھ سکتی تھی۔ جو سنک پر کھڑا کلیاں کرنے میں مشغول تھا۔ میں نے ٹائم رسالہ پڑھنے کی کوشش کی۔ گرد آلود پلاسٹک کے پھولوں کو دیکھنے میں جت لگانا چاہا دیوار میں لگے ہوئے اگزاسٹ فین کو کئی بار دیکھا۔ صوفے سے نکلنے والے چھوٹے چھوٹے پھونسڑوں کو کھینچا۔ لیکن سفید پینٹ قمیض اور کالی بلٹ میں کسی ہوئی چیتے کی کمر پر لوٹ لوٹ کر نگاہ گئی۔ جیسے بچے سکول سے لوٹتے ہوئے پولیس چوکی سے ڈرتے ہوئے بھی بار بار اُسی کی طرف دیکھتے رہتے ہیں۔ ایسے ہی تمام خوف کے باوجود اس جادو کا توڑ میرے پاس نہ تھا۔

کچھ دیر کے بعد وہ میرے پاس آکر بیٹھ گیا۔ اس کا چہرہ بہت سرخ ہو رہا تھا۔ پی آئی اے کی ایئرہوسٹس کی مصنوعی مسکراہٹ کے ساتھ اس نے میری طرف دیکھا اور

پھر جیب سے سفید رومال نکال کر کہنے لگا "میں ٹیکہ نہیں لگوا سکتا۔ سرنج دیکھ کر ہی نروس ہو جاتا ہوں ـــــ"

پتہ نہیں یہ بات اُس نے مجھ سے کہی تھی کہ اپنے آپ سے کیونکہ ہم دونوں کے علاوہ ویٹنگ روم میں اور کوئی نہ تھا۔

"بچپن میں تو ٹیکہ دیکھ کر میں بیہوش ہو جایا کرتا تھا۔"

میں نے اس کی طرف دیکھا ـــــــــــ چھ فٹ قد کے باوجود وہ اب بھی بچپن کی منزل میں تھا۔

"ڈاکٹر قاسم نے کہا ہے میں کچھ دیر بیٹھا رہوں شاید ری ایکشن نہ ہو کہیں ـــــ"

کاش وہ مجھے بیٹھے رہنے کا کوئی جواز نہ دیتا یا پھر اُٹھ کر چلا جاتا چپ چاپ۔

"مجھے دانت کی فلنگ کرانی ہے۔ میں تو کہتا ہوں دانت نکال دیں پر وہ مانتے ہی نہیں ڈاکٹر قاسم ـــــ اور درد اس قدر ہو رہا ہے"

ابھی تک میں نے ایک لفظ منہ سے نہ نکالا تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ میری آواز سے ڈر کر کہیں وہ بھاگ نہ جائے۔

"یہ جو لیڈی ابھی اندر گئی ہے آپ کی ممی ہے؟" ـــــ اس نے سوال کیا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ اسی وقت کلنک کا دروازہ کھلا اور ڈینٹل سرجن کے اسسٹنٹ نے آواز لگائی "مس سمن شیخ؟ ـــــ"

میں نے جلدی سے اُٹھ کر سرجن کے کمرے کا رُخ کیا، اندر سے دروازہ بند کرنے سے پہلے میں نے ایک نگاہ پھر عامر پر ڈالی۔ وہ بچوں کی طرح حیران بیٹھا اپنے گال پر رومال رکھے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

عشق نو یافتہ سے میرا تن بدن جلنے لگا..... جتنی دیر ڈاکٹر فلنگ کرتا رہا میرے دل سے ایک ہی صدا بلند ہوتی رہی کہ میرے باہر نکلنے تک وہ وہاں موجود ہو۔ مجھے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جتنے وظیفے آتے تھے۔ تمام کے تمام میں نے پڑھ ڈالے۔ مجھے خوف تھا کہ جب میں باہر نکلوں گی وہ جا چکا ہو گا۔

کہتے ہیں بڑے سے بڑا بند بھی جب ٹوٹتا ہے تو سب سے پہلے اُس میں انگلی بھر شگاف پڑتا ہے اور پھر پانی کی چھوٹی سی پنسل برابر موری سے پانی رستا ہے۔ غالباً جب انسان کی ذات کے حصار میں سب سے پہلے محبت کی سرنگ لگتی ہے۔ تو ایک نظر سے زیادہ لمبی نہیں ہوتی۔ آدمی صرف ایک نظر اور دیکھنے کا آرزو مند ہوتا ہے۔ اسے یہ علم نہیں ہوتا کہ نظروں کی آرزو وہ ڈائنامائٹ ہے جو ایک بار اکٹھی ہو کر ذات کے سارے حصار کو بلاسٹ کر سکتی ہے۔ میں نے پوری بنتی کے ساتھ اللہ کی درگاہ میں عرض کی کہ اگر میں عامر کو ایک نگاہ پھر دیکھ پاؤں گی تو پھر میں ساری عمر..... کبھی کسی مرد کی آرزو نہ کروں گی میری شادی چاہے کسی سے ہو..... مجھ پر سوائے عامر کے ہر مرد کی محبت حرام ہو گی.... اگر میں کسی اور کی محبت میں گرفتار ہو جاؤں تو جو چور کی سزا وہ میری.....

اس لمحے جب میں ڈاکٹر کے سامنے منہ کھولے نیم دراز تھی اور وہ لونگ کی خوشبو بھرا مسالہ میری داڑھ میں بھر رہا تھا، میں نے اپنے دل کو جھاڑو پھیر کر صاف کیا، اگربتیاں سلگائیں اور اپنے آپ سے قسم کھائی ـــ اپنے اوپر تمام مردوں کی محبت کو حرام قرار دیا۔

جب میں کلنک کا دروازہ کھول کر ویٹنگ روم میں آئی تو وہ ابھی ویسے ہی بیٹھا تھا ـــ ناچار ـــ نمانا۔ لیکن اوس چاٹے پیاس نہیں بجھتی۔ کسی کو دیکھ لینا ایک عرصے تک تسکین دیتا ہے پھر کچھ قدم آگے بڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ بڑھنے کی منزلیں اور حدیں بڑھتی جاتی ہیں حتیٰ کہ پھر پسپائی کا وقت شروع ہو جاتا ہے اور آخر میں کھلا چاقو اپنے ہی دستے کے ساتھ لگ کر پھر بند ہو جاتا ہے۔

عامر کی محبت اُن واقعات سے عبارت نہیں جو اُس کی اور میری ملاقاتوں میں پنہاں تھے بلکہ اس کی محبت میں ایک گپت چھپواں راستہ ایسا تھا جس نے میرے جسم، روح دل و دماغ کی ماہیت کو بدل دیا، یوں سمجھئے اُس کی ذات نے نہ صرف میری شخصیت کو بدل دیا بلکہ میری ساری بلڈ کیمسٹری ہی مختلف کر دی۔

اس کی محبت ایسی حرف ساز تھی کہ میری ساری عبارت جو بے معنی تھی۔ دلآویز غزل بن گئی پھر جو پڑھتا گیا۔ سوز و گداز سے بھر گیا۔

عامر کی عنایتوں کے پہلے اثرات میرے جسم پر مرتب ہوئے۔ جسم جو بے ڈھنگا تھا۔ زنبور سرخ کی طرح سڈول ہو گیا۔ اس سے پہلے میں بے اختیار کھایا کرتی تھی۔ میری COMPULSIVE EATING مجھ پر حاوی تھی۔ مرغن کھانے کاربوہائیڈریٹ مجھے مرغوب تھے۔ خود بخود میں کھیروں پر گذارا کرنے لگی۔ جوس اور دودھ میری غذا بن گیا۔ عامر مجھے بال کٹوانے لے گیا۔ اس سے پہلے مجھے اپنی لمبی لیکن پتلی چوٹی سے بڑا پیار تھا۔ لیکن جب چوٹی کاٹ کر ہیئر ڈریسر آئینے کے سامنے رکھی تو مجھے آئینے میں نظر آیا کہ چٹیا تو ایسی نہ تھی۔ جس کا افسوس کیا جاتا۔ میں نے بالوں کو پرم کروایا۔ بازوؤں اور ٹانگوں پر ویکسنگ کروائی، چہرے پر اُگے ہوئے سیاہ بور کو تھریڈنگ سے صاف کرایا، ناخن مینی کیور کروائے، پیروں کے گھٹنوں پر مالش کروائی، پیٹ کی ورزشیں معلوم کیں، کھڑی سائیکل چلائی، میک اپ کیا اور جب میں بیوٹی کلنک سے باہر نکلی تو عامر نے میرا سواگت بڑی مدھم سی گنگناتی سیٹی سے کیا۔

آپ نے وہ کہانی ضرور سنی ہو گی۔ جس میں ایک شہزادی کی شادی ایک مینڈک سے ہو گئی۔ شہزادی کی محبت کے کھل سم سم سے یہی مینڈک ایک خوبصورت دلآویز شہزادے میں بدل گیا۔ محبت میں یہ قوت موجود ہوتی ہے کہ وہ گدھے کو گھوڑا، کینچوے کو سانپ بلی کو چیتا اور چھپکلی کو گلہری میں بدل دے۔ ہر مینڈک محبت کی انگنائیوں میں شہزادہ بننے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ ہر انسان جس پر پیر کی کامل توجہ پڑ جاتی ہے۔ اس کا قلب

www.iqbalkalmati.blogspot.com

روشن ہو جاتا ہے — ایسے ہی میرے جسم، روح، ذات کی ڈالی ڈالی میں سیب کے شگوفے لگ گئے — میں لڑکیوں میں نمایاں نظر آنے لگی یوں سمجھئے کہ میں لڑکیوں میں سٹینڈرڈ ٹمپریچر اور پریشر کی لڑکی شمار ہونے لگی۔ یہی وہ دن تھے جب عامر ایم فل کرنے کے لئے لندن روانہ ہونے کی تیاری کرنے لگا اور مجھے پکڑ دھکڑ اس نے بینک کی نوکری دلوادی۔

دراصل مجھے نوکری کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ مجھے نوکری کا کوئی شوق بھی نہ تھا۔ لیکن عامر کے بڑے فلسفے تھے۔ جس روز اماں جی سے اس نے نوکری کا ذکر کیا، اس روز باہر خوب بارش ہو رہی تھی۔ ہماری چھ کنال کی کوٹھی کے برآمدوں میں اولے تھے۔ لان پر درختوں کے تھال چھوڑ کر سارے میں فینائل کی گولیوں جتنے اولے بکھرے ہوئے تھے۔

"آپ اسے نوکری کرنے دیں اماں جی پلیز — ایک دو سال کے لئے —"

اماں اندر ہی اندر میری شادی کے پروگرام سیٹ کر رہی تھیں، فٹ بولیں۔

"ناں عامر اسے کیا ضرورت ہے نوکری کرنے کی۔ اس کے دونوں بھائی سلامت رہیں۔ اچھا بھلا خرچ بھیجتے ہیں ٹورانٹو سے —"

"تو کیا کرے گی یہ پورا سال —؟"

"تم چاہو تو یہ تمہارے ساتھ چلی جائے —"

"نہیں اماں جی — ایک تو میں نہیں پڑھ سکوں گا۔ ایک یہ اچھی طرح فیصلہ کر لے کہ یہ کیا چاہتی ہے — فیصلہ اس کا اپنا ہونا چاہیئے۔"

اماں کو بیوہ ہوئے دس سال ہو چکے تھے وہ اپنے دو ڈاکٹر بیٹوں کی کمائی پر نال کی کائی جیسی منجمد زندگی بسر کر رہی تھیں۔ انہیں نے عہد کی باتیں، ارادے، خیال، سوچ فیصلے بالکل سمجھ نہیں آتے تھے..... میں کھڑکی میں کھڑی باہر گرتے ہوئے تڑکے دار

اولے دیکھ رہی تھی۔ اماں چلی گئیں تو عامر اٹھ کر میرے پاس آ گیا "کیا ہوا ہے —"

"تم مجھے ساتھ لے جانا نہیں چاہتے —" بڑی دیر بعد میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

عامر نے محبت سے میرے چہرے پر آئی ہوئی لٹ کو اوپر اٹھایا اور بولا

"دیکھو سمن! تم نے جلدی میں بہت سے فیصلے کر لئے ہیں۔ تم اتنی دیر تک لیڈی آف شیلاٹ کی طرح اس کوٹھی میں بند رہی ہو کہ تم واقف نہیں ہو کہ باہر کیا ہو رہا ہے میں تمہیں ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔ لیکن یہ فیصلہ تمہارا ہونا چاہیئے — میرا نہیں"

"تو یہ فیصلہ میرا ہی تو ہے —"

"یہ فیصلہ تمہارا نہیں ہے —"

"کیوں؟ — یہ تم نے کیسے اندازہ کر لیا۔

"کیونکہ تم ابھی میچور نہیں۔ ابھی تم محض اپنی IMPULSES کی وجہ سے بچوں کی طرح فیصلے کرتی ہو۔ آئس کریم کھانا چاہی کھا لی، نہ ملی تو رو دیئے، زیادہ ضدی ہوئے تو روٹھ گئے — تمہیں میرے ساتھ رہنے کا فیصلہ ایسے کرنا چاہیئے جیسے ایک انسان کرتا ہے — بچہ نہیں —"

باہر گراؤنڈ میں اولے گرنا بند ہو گئے تھے اور بڑی بڑی بوندوں والی بارش پڑ رہی تھی۔ جامن، آم اور امرودوں کے درخت ان بوندوں میں سروں کی طرح بج رہے تھے۔ میں نے مڑ کر پہلی بار عامر کی طرف دیکھا۔ اس سے پہلے میں نے عامر کو نہیں دیکھا تھا۔ اس سے پہلے میں ایک ایسے شخص کو دیکھتی آئی تھی جو فلموں میں، ڈراموں میں، مشاعروں میں، کرکٹ میچوں میں نظر آ جاتا ہے۔ اب مجھے محسوس ہوا جیسے وہ مجھے تراش خراش کر میری محبت کا امتحان لینا چاہتا ہے۔ غالباً اس کے اندر بھی کہیں کوئی مونو میٹر ایسا لگا تھا جو اسے بتا رہا تھا کہ پیچھے سے وولٹیج درست نہیں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

آ رہی ..... میں نے اپنا ہاتھ بڑھا کر اس کے کندھے پر رکھا اور آہستہ سے بولی ——

"سنو عامر! —— مجھے آج کل —— بلکہ ہمیشہ تم سے محبت رہے گی —— میں کبھی نہیں بدلوں گی —— کبھی نہیں"

"یہ بڑا مشکل سا دعویٰ ہے ثمن —— اور دعویٰ نہیں کرنا چاہیئے کیونکہ پھر ثبوت بہم پہنچانا پڑتا ہے"

"مجھے تمہاری قسم —— مجھے —— مجھے اپنے ایمان کی قسم میں تمہارے علاوہ کسی مرد سے کبھی محبت نہ کروں گی (میں کر ہی نہیں سکتی ایسے —— یہ ناممکن ہے"

کاغذ پر دستخط ہو گئے میں نے اپنی مہر لگا دی —— اب تک میں کلنک میں کھائی ہوئی قسم ہی کی پابند تھی - اب میں نے اُس قسم کا اعلان بھی کر دیا —— اپنے آپ کو امتحان میں ڈال دیا -

ساری مصیبت اسی اعلان سے شروع ہوئی ، یا یوں سمجھئے کہ سارا ٹنٹا اُس قسم سے شروع ہوا جو میں نے اپنے آپ سے کھائی تھی - اگر میں عامر کے چلے جانے کے بعد گھر پر آرام سے بیٹھ کر اس کا انتظار کرتی ، کسی میوزک ماسٹر سے شدھ راگ سیکھتی رہتی ، فرصت کے اوقات میں عورتوں کے رسالے سے نمونے نکال کر کشیدہ کاری کرتی ، ایسی غزلیں لکھتی جو کسی رسالے کی زینت نہ بنتیں - ریڈیو کے پروگرام سن کر ریڈیو سٹیشن خط لکھتی - آدھی رات گئے تک عامر کی واپسی کے لئے دعا مانگتی رہتی اور اپنے آپ کو مالدیپ کے جزیرے میں جلا وطن رکھتی تو اور بات تھی لیکن میں تو بنک کی آفیسر تھی - لکی کبوتری کی طرح میری اُڑانیں دور دور کی تھیں - صبح بنک پہنچتی ، شام تک رنگ رنگ کے لوگوں سے واسطہ پڑتا - اور ڈرافٹ لینے والے ، دوبئی ، مسقط ، دمام کا پیسہ جمع کرانے والے ، کرنٹ اکاؤنٹ سے دن میں کئی چیک بھنوانے والے ، سیونگ اکاؤنٹ کی کاپی بنوانے والے ، روز کے گاہک سرکاری دفتروں کے ماہ بماہ آنے والے سرکاری

کلرک جن کو پورے پورے دفتر کی تنخواہیں لے جانی ہوتیں - بزنس مین اور اُن کے بنک ڈرافٹ ، امیر عورتیں اور اُن کے لاکر .... لاتعداد سکیمیں اور اُن کے مشورے ..... اوورسیز کاروبار اور اس کی عملی اڑچنیں .... اس ماحول میں جہاں روپیہ دن میں سارا وقت نظر آتا ہو آدمی بہت جلد اپنے آپ کو مشین سمجھنے لگتا ہے - سائن کرنے ، دستخط ملانے ، نوٹ گننے ، اندراج کرنے ، ٹوکن دینے اور لینے کا جو سلسلہ ہے اس میں رہ کر ہاتھ اور دماغ ڈی جی ٹل گھڑی کی طرح بغیر پیچ پرزوں کے کام کرنے لگتا ہے -

ایسے میں ہی ایک دن جب میں اندر باہر خالی کرسی کی طرح محسوس کر رہی تھی کہ وہ آ گیا - بنک میں داخل ہونے سے پہلے اس کے پی اے نے اس کے لئے دروازہ کھولا - پھر اُس کا چپراسی خوبصورت بیگ اُٹھائے اُس کے پیچھے وارد ہوا - بنک کے شیشے والے دروازے کے عین سامنے اس کی سبز مرسیڈیز کے پیچھے دائرے میں سٹیل کا تین پرا نشان نظر آ رہا تھا ....

ساری مصیبت نہ مرسیڈیز کی تھی نہ اُس کی —— ساری مشکل میری ذات سے پیدا ہوئی - مجھ میں ، میرے ہاتھوں میں ، آنکھوں میں کوئی ایسی بات پیدا ہو گئی تھی - جو ایک خوبصورت چمکدار WELL RUN مشین میں ہوتی ہے ، فریج ، ائر کنڈیشنر ، خوبصورت کار ، اوپر نیچے آنے والی لفٹ ، رنگین ٹیلی ویژن میں ایک معجزے کی کوشش ہوتی ہے - میں بھی ایک معجزہ تھی —— مینڈک سے نکلا ہوا شہزادہ —— اسی لئے نجیب صاحب جو اپنا تمام روپیہ ہمارے بنک سے نکلوا کر کسی دوسرے بنک میں رکھنا چاہتے تھے ، مینجر کے کمرے کی طرف جاتے ہوئے رُکے ، میری طرف دیکھ کر مسکرائے اور پھر آگے چلے گئے —— تھوڑی دیر کے بعد آفتاب گل صاحب نے مجھے اندر بلایا - آفتاب گل صاحب ہمیشہ مجھے توصیفی نگاہوں سے دیکھتے لیکن اُس روز جب میری آمد پر نجیب صاحب اُٹھ کھڑے ہوئے تو آفتاب صاحب نہ صرف اُٹھ کھڑے ہوئے بلکہ میرے بیٹھنے تک

کھڑے رہے۔

"یہ ہماری جونیئر آفیسر مس ثمن شیخ ہیں اور یہ نجیب صاحب ہیں۔ کول ایئر، ایئر کنڈیشنرز کے مالک ——"

ہم دونوں ایک دوسرے سے ایک فٹ پر بیٹھ گئے۔ ہمارے درمیان میں صرف کرسیوں کے بازو حائل تھے۔ جن پر نجیب صاحب نے اپنا لمبا ہاتھ بے پروائی سے پھینک رکھا تھا۔

آفتاب گل نے ایک بینکر کی ریاکارانہ مسکراہٹ سے مجھے دیکھ کر کہا —— "اب یہ ان کا ظلم دیکھیں، یہ اپنا اکاؤنٹ یہاں سے نکلوانا چاہتے ہیں۔ جب اِن کا بائیس لاکھ نکل گیا تو ہماری برانچ کا تو بھٹہ بیٹھ جائے گا کیوں مس شیخ —— ؟"

میں نے پروفیشنل EFFICIENCY کے تحت نجیب صاحب کو ایک بھرپور مسکراہٹ پیش کی۔ میرا بس چلتا تو میں اُن کا بے پروائی سے دھرا ہوا ہاتھ چوم کر کہتی —— پلیز ایسے نہ کریں، لیکن میں نے میز پر اُن کی رکھی ہوئی سیاہ عینکوں کو صرف چھو کر کہا

"آپ ایسا نہیں کر سکتے —— !"

"کیوں —— ؟"

"دیکھیے ناں اگر آپ ہمیں ہیڈ آفس میں ذلیل کرنا چاہتے ہیں تو اور بات ہے لیکن ہم نے آپ کو بڑا اچھا سروس کیا ہے۔ کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا —— پھر آپ کیسے اتنا بڑا اکاؤنٹ بند کر سکتے ہیں؟"

اب نجیب صاحب اپنی مجبوری بیان کرنے لگے کہ وہ ہمارے حریف بنک میں پیسہ جمع کرانے کا وعدہ کر چکے تھے اور اس مینجر کے ساتھ ان کے بہنوئی کے کچھ ایسے مراسم ہیں کہ انکار کی گنجائش نہیں تھی۔

آفتاب گل کی شہ پر میں نے اپنا پورا زور نجیب صاحب پر لگا دیا۔ مسکراہٹیں گفتگو، زبردستی، چائے، کافی، خدمت، چاپلوسی تعریف —— کوئی پونے گھنٹے کی مارا مار کے بعد اس قدر ہوا کہ نجیب صاحب نے اپنا فیصلہ تو تبدیل نہ کیا۔ لیکن کچھ عرصہ تک روپیہ ہمارے بنک میں رکھنے کا حکم صادر فرما کر چلے گئے۔

اُن کے جاتے ہی آفتاب گل کو پیٹو پڑ گئے —— "بس اب ایک مہینے کے بعد کلوزنگ ہے سال کی اور ہمارا بیلنس یکدم بائیس لاکھ گر جائے گا"۔

ہم دونوں اس طرح چپ چاپ بیٹھے رہے جیسے ڈکیتی سے پہلے رہزن گم سم بیٹھے ہیں۔ "تم ایسے کرو مس شیخ، ان کی وائف سے ملو ..... کچھ منت سماجت کرو۔ یہ بڑا ضروری ہے ورنہ میری تو پروموشن کا سوال ہے۔ میں تو زونل مینجر بنتے بنتے رہ جاؤں گا"۔

آفتاب گل بے چارہ ایک منزل کا آدمی ہے۔ اس کے سامنے ایک گول تھا کہ وہ کسی طرح زونل مینجر ہو جائے۔ راستے میں کیا کیا پڑتا ہے، کون کونسی چیزیں، کیسی کیسی اقدار قربان کرنی پڑتی ہیں، کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں، اس کی اُسے کوئی پروا نہ تھی۔ وہ ہر قیمت پر زونل مینجر ہونا چاہتا تھا۔ اس کی اس لگن، اس مجبوری کو دیکھ کر میں نے مسز نجیب آف کول ایئر سے ملنے کا ارادہ کیا۔

یہ میری بدقسمتی تھی کہ جب میں اُن کے سنٹرلی ایئر کنڈیشنڈ بنگلے میں پہنچی تو صرف نجیب صاحب گھر پر تھے —— گھر کسی قبر کی طرح خاموش تھا۔ سرو کے درختوں سے لے کر ڈرائینگ روم کے جاپانی درختوں تک ایک خواب کی فضا تھی۔ سنگِ مرمر، ساگوان ..... اور شائل ..... ہر جگہ موجود تھا .....

اس ملاقات میں نجیب صاحب نے کچا پکا وعدہ کیا کہ وہ اکاؤنٹ نہیں نکالیں گے کم از کم ہمارے سال کے کلوزنگ تک وہ اپنی رقم ضرور ہمارے ہی بنک میں جمع رکھیں گے

آفتاب گل کو تو اختلاج قلب کے دورے پڑنے بند ہو گئے لیکن میرے لئے جیسے آدھی رات کے وقت کوئی دروازہ آہستہ آہستہ دھکیل کر اندر آنے کی کوشش کرنے لگا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

آفتاب گل نے مجھ سے وعدہ کیا کہ وہ میری ترقی کے لئے ضرور کوشش کرے گا۔ لیکن یہاں ترقی کی خواہش کس کو تھی؟ پہلے نجیب صاحب کو کئی فون اسی سلسلے میں کرنے پڑے۔ جب کلوزنگ کی تاریخ گذر گئی تو پھر اُن کے فون اور طرح اہم ہو گئے۔ اب وہ اپنے بزنس لنچوں میں مجھے اور آفتاب گل کو مدعو کرنے لگے۔ رفتہ رفتہ آفتاب گل کا پتہ کٹ گیا۔ اب دن کے بجائے رات کے ڈنروں میں میری موجودگی نمایاں ہو گئی۔ پہلے میں اکاؤنٹ کیلئے چپ رہی۔ پھر نجیب صاحب ایسی باتیں کرنے لگے کہ ان کی کسی بات کا جواب میرے بس میں نہ رہا۔ سلسلہ جو خالص بزنس کی وجہ سے شروع ہوا تھا۔ پرائیویٹ شکل اختیار کرنے لگا۔

عامر کے خط باقاعدگی سے آ رہے تھے۔ میں اُسے خط پر خط بھیجتی تھی۔ لیکن پتہ نہیں کیوں نجیب صاحب کا ذکر کبھی بچا کر بھاگ جاتا۔ سرسری طور پر میں نے اسے یہ بات لکھ دی تھی۔ کہ کول ایڈ والے نجیب صاحب سے اکاؤنٹ کے سلسلے میں بزنس میٹنگز ہوتی ہیں۔ لیکن یہ لکھنا محال ہوتا جا رہا تھا کہ یہ بزنس میٹنگز اب سرسری نہیں رہیں۔ دفتر میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ آفتاب گل اب میری پہلے سے زیادہ عزت کرنے لگے۔ اخفائے راز سے میرا دل پتے کی طرح لرزنے لگا۔ لیکن میں عامر کی طرف یہ اطلاع کیسے بھجواتی کہ ایک لکھ پتی مجھ جیسی کوڑھ کرلی پر بُری طرح فریفتہ ہو گیا ہے بھلا میں اُسے کیسے مجروح کر سکتی تھی؟

نجیب عامر کی طرح خوش رنگ خوش آواز نہیں تھا۔ لیکن اس میں کچھ اور ایسی خوبیاں تھیں۔ جو متاثر کئے بغیر نہ رہتی تھیں۔ وہ عورتوں کے تمام اُجلے میلے موڈوں کا متحمل تھا۔ وہ اتنی ساری دولت کے باوجود عجز و انکساری سے گفتگو کرنے کا عادی تھا۔ اسے روپیہ پیسہ خرچنے کی عادت نہ تھی۔ لیکن اُس نے مجھے تحفوں سے لاد رکھا تھا۔ اماں کو جب بھی سلام کرنے آتا اتنے تحفے ساتھ ہوتے کہ اماں کی سٹی گم ہو جاتی۔

میرا بھی گویا لینڈ سلائیڈ جاری تھا۔۔۔ عامر کو گئے ابھی سات مہینے ہی ہوئے تھے کہ میری قسم پر ہائی ویلیج گری۔ اس روز بڑی بارش ہو رہی تھی۔ ہمارے باغ میں تمام پتے

بارش میں ایک دوسرے کو چوم رہے تھے۔ نجیب آگیا اور پڑتے ہی اُس نے اماں کو اپنے مدعا سے روشناس کرایا، فوراً اماں کے لئے عامر ایک کبڑا عاشق بن گیا اور وہ مزید فوراً رضامند ہو گئیں۔

اماں کے جانے کے بعد ہم دونوں اور بارش اکیلے رہ گئے۔

"تمہیں مجھ سے شادی کرنا ہو گی ثمن ——"

"دیکھئے میں آپ کو کئی بار بتا چکی ہوں کہ میں نے عامر ——"

"کیا آپ کی منگنی ہو چکی ہے ——؟"

"جی نہیں ——"

"پھر یہ کیسی COMMITMENT ہے جس کا آپ اس قدر پاس کر رہی ہیں؟"

میں اُسے کیسے سمجھاتی کہ اپنے اندر کھائی ہوئی قسمیں اتنی آسانی سے توڑی نہیں جا سکتیں اور وہ جیسا شکنجہ کستی ہیں کوئی کس نہیں سکتا۔

"آپ کو عامر سے محبت ہے؟ ——" کچھ دیر بعد نجیب نے سوال کیا۔

"پتہ نہیں ——"

"کیا آپ SURE نہیں ہیں؟ ——"

میں نے منہ پھیر لیا۔ پتہ نہیں کیوں اپنی FEELINGS کے متعلق پہلی سی قطعیت اب مجھ میں نہیں تھی۔

"اگر آپ SURE ہونے کے لئے کچھ مدت ہفتہ، مہینہ، سال دس سال چاہیں تو انتظار کر سکتا ہوں ——"

مجھے معلوم نہ تھا کہ مرد کا اعتراف محبت اس قدر بلاسٹ کر سکتا ہے۔

"جی نہیں ۔۔۔ میں اگر SURE بھی ہو جاؤں کہ ۔۔۔۔ کہ مجھے اس سے محبت نہیں تو بھی ۔۔۔۔ میں آپ سے کبھی شادی نہیں کر سکتی ——" میری آنکھوں سے خودبخود

آنسو رواں ہو گئے۔

"کیوں آخر کیوں؟" نجیب نے میرے کانپتے ہوئے ہاتھ پکڑ لئے۔ بھلا میں اُسے کیا بتاتی کہ میں پابندِ قسم تھی.... پابندِ نَے نہیں تھی۔

بڑی دیر ہم دونوں خاموشی سے بیٹھے رہے۔ باہر بارش کو دیکھتے رہے۔ پھر وہ اٹھ کھڑا ہوا اور لجاجت سے بولا —— "ہم امیر لوگوں کی انا عجیب ہوتی ہے۔ ہمیں اتنی مراعات، اتنی اشیاء، اتنے فائدے پیسے کی وجہ سے حاصل ہونے لگتے ہیں کہ ہمیں یہ واقعی بھول جاتا ہے کہ کچھ چیزیں ضرور ایسی بھی ہوں گی جو دولت کے بدل میں نہیں مل سکتیں۔ ہم تقریباً ایسی باتیں کرتے ہیں۔ لیکن دل میں ہمیں اس بات پر اعتماد نہیں ہوتا —— میں نے بھی —— اسی لئے اپنی بیوی کو طلاق دے دی۔ میں تمام ذمہ داریوں سے چھٹکارا حاصل کر کے آپ تک پہنچنا چاہتا تھا۔ پتہ نہیں کیوں —— میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ آپ انکار کر دیں گی ——"

وہ دبے پاؤں کمرے سے نکلا بارش میں بھیگتا اپنی کار تک پہنچا اور پھر میرے کمرے کی طرف دیکھتا ہوا پھاٹک کی طرف کار لے گیا.....

اس دن کے بعد نجیب کا اکاؤنٹ تو ہمارے ہی بنک میں رہا۔ لیکن پھر وہ کبھی بنک نہیں آیا۔ آفتاب گل زونل مینجر بن کر ہیڈ آفس چلا گیا اور میں پہلے زلزلے کے بعد اینٹ گارا سمیٹنے میں مشغول ہو گئی۔

دراصل ہر کام کرنے سے پہلے ایک جھاکا ہوتا ہے۔ پہلی شرم، پہلا حجاب، بندش، روک، جو کچھ بھی کہہ لیجئے۔ پہلا جھاکا ایبنارمل حد تک آدمی کو اپنی گرفت میں رکھتا ہے شراب کا پہلا پیالہ —— پہلا بوسہ، پہلی چوری، پہلی بار گھر سے فرار.... چھوٹی باڑھ کو الانگتے وقت دل بہت زور سے دھڑکتا ہے۔ پھر جیسے آلو بخارے سے اس کی ہوا اُتر جاتی ہے۔ اگر انسان اپنے نفس سے مجبور ہو جائے تو وہی واقعہ بار بار ہونے لگتا ہے اور آخر میں انسان کو کرٹو کی طرح نہ گلنے والا شخص بن جاتا ہے۔

میں بھی پہلے شاک سے شفایاب ہونے کے بعد اپنی قوت سے آشنا ہو گئی تھی۔ کسی شخص کو بے دست و پا کرنے میں اپنے سامنے گھٹنے ٹیکے دیکھنے میں بڑی لذت ہے۔ آدمی سکندر بادشاہ کی طرح، ہلاکو اور چنگیز خاں کی طرح بڑا قوی محسوس کرنے لگتا ہے۔

اب مجھ میں پہلے سے زیادہ خوش اعتمادی آگئی تھی۔ میں نے اس واقعے کو عامر تک ایسے پہنچایا کہ اس کے سالے کنارے بھر گئے۔ اس کی اصلیت کو بے اصلیت بنا کر پیش کیا اور معاملے کو اہم نہیں ہونے دیا۔

لیکن نجیب کے بعد مجھے پتہ چل گیا کہ ہنستے مرد پر کیسے حملہ کرتے ہیں۔ اُس پر نظروں کا نپام بم کس وقت گرانا آسان ہے۔ یہ مت سمجھئے کہ میں کچھ چانکیہ کی طرح بندھے ٹکے اصولوں کو استعمال میں لا رہی تھی بلکہ کہیں اندر ہی اندر مجھے اپنی قوت کا احساس ہو گیا تھا اور میں سوپر پاورز کی طرح اپنی قوت کو ایڈ کی شکل میں پیش کرنے لگی تھی۔

کچھ عرصہ ثنا خواں ملتے رہے لیکن میں ان کے اور اپنے درمیان حدود قائم رکھنے میں کامیاب رہی۔ مجھے جس قدر تحسین و تعریف درکار ہوتی وصول کرتی اور باقی سب کچھ لوٹا دیتی۔ سنا ہے کرسمس کے روز کمپنی بہادر کے افسروں کو دیسی لوگ ڈالیاں بھیجا کرتے تھے۔ کمپنی بہادر ڈالی میں سے جو کچھ پسند ہوتا رکھ لیتے باقی تھینک یو کہہ کر لوٹا دیتے چاندی کی تھالی، سلیم شاہی جوتے کے پتاوے تلے چھپے ہوئے نوٹ چینی کے بنے ہوئے کھلونے جن میں سونے کے زیورات ہوتے —— تمام تر لیڈی بہادر رکھ لیتیں اور باقی ساری ڈالی لوٹا دیتیں..... پھول، پھل، مٹھائی....

مجھے معلوم نہ تھا کہ توصیف اور تحسین کا کھیل دراصل پہاڑ تلے ڈائنا مائیٹ بچھانا ہے۔ جب کافی بارود بھر جائے گا تو آخر میں فلیتے کو آگ لگانے والے کو محض چھوٹی سی ماچس کی تیلی درکار ہو گی اور سارا پہاڑ یوں اُڑ جائے گا۔ جیسے ہوائی جہاز کے پنکھے کے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

آگے کاغذ کی کترنیں .....

جلی تیلی دکھانے والا اس قدر معصوم آدمی تھا کہ عرصے تک پتہ ہی نہ چلا کہ وہ بارود کا کھیل بھی جانتا ہے۔ چھوٹی چھوٹی خرگوش جیسی آنکھیں چھوٹی چھوٹی بے ضرر سی مونچھیں، چھوٹی چھوٹی بے کار باتیں، چھوٹی چھوٹی خراب عادتیں، چھوٹے چھوٹے عیب، چھوٹی چھوٹی خوبیاں، چھوٹا سا گھرانا۔ چھوٹی سی تنخواہ —— وہ تمام تر پاکٹ سائز فتنہ تھا پہلی دوسری پانچویں بارہویں ملاقات تک اس کا اثر بالکل نہ ہوا۔ لیکن پھر ہومیوپیتھک دوا کی طرح اُس نے جسم کے اندر سارے سسٹم کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ اُس کے ساتھ اتنے فری ہو جانے کی فقط ایک ہی وجہ تھی کہ میں اُسے مکمل طور پر بے اثر اور معمولی سمجھتی تھی۔ مجھے اُس سے کوئی خطرہ نہ تھا۔

آج سے پورے ایک مہینے پہلے جب عامر نے مجھے خط لکھا کہ وہ ایم فل کے بجائے پی ایچ ڈی کی ڈگری لینا چاہتا ہے اور وہ اتنی دیر میرے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا تو میں کتنی خوش تھی۔ پاسپورٹ بنوانے ہیلتھ کارڈ لینے، ٹکٹ خریدنے کے تمام مراحل میں واصف میرے ساتھ ساتھ رہا۔ ٹریول ایجنسی کے ہر پھیرے پر میں اُس کی موٹر سائیکل سے اُتر کر اُس کا شکریہ ادا کرتی تو مجھے لگتا —— وہ بھی یہی چاہتا ہے کہ میں جلد از جلد یہاں سے دفع ہو جاؤں۔ میرے ساتھ تمام شاپنگ اُس نے کروائی۔ لیکن پرسوں شام جب میرا ٹکٹ بن گیا۔ بیگ پیک ہو گئے تو مجھے عجیب خبر ملی۔

یو سی ایچ ہسپتال سے اس کی ماں کا فون ملا "آپ کا نام مس سمن شیخ ہے ——"

"جی ——"

"کیا آپ ہسپتال آسکتی ہیں؟ ——"

میرے پاؤں تلے سے زمین ہلنے لگی جیسے ایس کلیسٹر اپنی سطح چھوڑتا چلا جاتا ہے

"کیوں؟ —— کیا ہوا ——"

"میں واصف کی امی بول رہی ہوں۔ آج شام .... واصف نے پانچویں منزل سے چھلانگ لگا دی .... تمہاری خاطر .... اس وقت اسے آپریشن تھیٹر میں لے گئے ہیں۔" اس کے سوا وہ اور کچھ نہ بول سکی۔

میرا دل، دماغ، اعصاب تمام سن ہو گئے۔ وہ اتنا بہادر تو نہ تھا کہ چھلانگ لگا دیتا کسی کی خاطر —— وہ اتنے جذبے کا مالک بھی نہ لگتا تھا کہ کسی سے اتنی شدید محبت کرتا —— پھر —— میں نے تو اُس کے ہر اعتراف محبت کو ایسی خبر سمجھا جو دو دن پرانی ہوتی ہے۔

جب میں ہسپتال پہنچی تو وہ تھیٹر سے واپس کانسٹنٹ کیئر میں بے سُدھ پڑا تھا۔ اس کا سارا جسم پٹیوں سے یوں لپٹا ہوا تھا جیسے پرانے زمانے میں ملائی کی برف کو گرم پٹیوں میں لپیٹ لیا کرتے تھے —— اس کی ماں فرش پر بیٹھی نفل پڑھنے میں مشغول تھی .... اُس نے ایک بار بھی پلٹ کر میری طرف نہ دیکھا۔

ڈاکٹر مجھے تھوڑی دیر بعد اپنے کمرے میں لے گیا —— "دیکھئے مس سمن، واصف کی جیب سے یہ خط نکلا ہے۔"

میں دیر تک آدھا صفحہ پڑھنے میں مشغول رہی جس میں اُس نے اپنی ماں سے معافی مانگی تھی اور اس بات کا اعتراف کیا تھا کہ وہ میرے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔

"آپ ہماری مدد کر سکتی ہیں ——" ڈاکٹر نے مجھے کنکھیوں سے دیکھ کر کہا "شاید واصف کی جان بچ جائے —— شاید وہ دوبارہ نارمل زندگی بسر کرنے کے قابل ہو لیکن نفسیاتی طور پر ہمیں کسی ایسے شخص کی ضرورت ہے جو اس کا اعتبار بحال کر سکے .... ایسا معجزہ چاہیئے ہیں جس کی وجہ سے وہ زندہ رہنا چاہیئے۔"

"لیکن میں تو صبح کی فلائیٹ سے لندن جا رہی ہوں ——"

"یہ آپ کیسے کر سکتی ہیں مس .... وہ اس بوڑھی بیوہ کا اکلوتا بیٹا ہے۔ یہ قتل ہے قتل .... آپ کو اپنی فلائٹ کینسل کرنی ہوگی ——"

"میں اگر فلائیٹ کینسل کر بھی دوں ڈاکٹر صاحب تو بھی.... میں ان ماں بیٹے کو وہ خوشی نہیں دے سکتی جس کے وہ آرزومند ہیں.... کیا یہ بہتر نہیں کہ میں آج انہیں CRISIS میں چھوڑ کر بھاگ جاؤں بہ نسبت اس کے کہ — یہ CRISIS بار بار ہو —"

ادھیڑ عمر کا ڈاکٹر چپ ہو گیا۔ وہ غالباً مجھ پر ان لڑکیوں کا لیبل لگا رہا تھا جو لڑکوں کو خراب کرتی ہیں۔ منہ پھٹ، گستاخ، پیسے کی پیر، موقع شناس، ڈاکٹر کی خشخشی ڈاڑھی ماتھے کی محراب، بند بند ہونٹوں سے ظاہر تھا کہ وہ مجھے ان لڑکیوں میں شمار کر رہے تھے۔ جو فتنہ و فساد کے لئے پیدا ہوتی ہیں۔ کچھ دیر وہ مجھے سمجھاتے رہے پھر چپ ہو گئے....

میں کانسٹنٹ کیئر میں گئے بغیر گھر لوٹ آئی اور ساری رات ایک ہی کرسی پر بیٹھی رہی....

اس وقت میں ہوائی جہاز کی تیسری قطار میں بیٹھی ہوں۔ نیچے لاہور شہر پیچھے چھوٹ رہا ہے۔ ایچی سن کی سرخی مائل عمارت، نہر کے کنارے چلنے والی سڑک، جہانگیر کا مقبرہ.... لاہور کے سنگ میل پیچھے جا رہے ہیں۔ ایئر ہوسٹس میٹھی گولیاں، ٹافیاں چھابے میں رکھے، جھوٹی مسکراہٹ چہرے پر سجائے پھر رہی ہے.... وہ میرا ہی دوسرا روپ ہے۔

میرا دل نیچے کی طرف اتر رہا ہے.... بھاگ رہا ہے.... کانسٹنٹ کیئر کی طرف.... کیا میں عامر کو یہ سب کچھ بتا سکوں گی؟ ایسے نہیں جیسے کوئی لاتعلق بات بتائی جاتی ہے بلکہ ایسے جیسا کہ اس بات کا مجھ سے تعلق ہے —؟ میری انتڑیاں، دل، جگر تمام مدھائی سے چکر کھا رہے ہیں۔

میں لوٹ جانا چاہتی ہوں — پٹیوں میں بندھے سپیس مین کی طرف.... لیکن میری قسم نے مجھے اس بیلٹ کی طرح باندھ رکھا ہے۔ جو میری کمر کے گرد بندھی ہے — مجھے عامر سے بڑی محبت ہے۔ لیکن میں جانتی ہوں اب میں ساری زندگی عامر کے ساتھ وہ خوشی حاصل نہیں کر سکتی۔ جس کی مجھے آرزو تھی — اور اگر میں لوٹ جاؤں —

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کسی اگلے سٹیشن سے اور واپس واصف کے پاس چلی جاؤں تو بھی میں ساری عمر اس کے ساتھ خوش نہیں رہ سکتی....

کیا ساری مصیبت اس قسم کی ہے جو میں نے کلنک میں کھڑے ہو کر کھائی تھی کہ اس سے پرے بھی کچھ اور ہے؟ — ہوائی جہاز کے انجن سے پیچھے بھی کیا کوئی طاقت اسے اڑائے لئے جا رہی ہے....

مجھے یوں لگتا ہے۔ فسٹ کلاس کے مسافروں کی سائیڈ پر عامر سفید قمیض پینٹ پر سیاہ بیلٹ لگائے مجھے چوری چوری دیکھ رہا ہے۔ مجھے آزمانا چاہتا ہے — وہ بھی مجھ سے کوئی ایسی قربانی چاہتا ہے جو میری محبت کا مجموعی فیصلہ ہو — کچھ لوگ آزمائے بغیر رہ نہیں سکتے۔ مجھے لگتا ہے عامر بھی ساری عمر مجھے آزماتا رہے گا۔

اور نیچے اس چھوڑی ہوئی دھرتی پر ایک چھوٹے سے کمرے میں واصف کی ماں کسی معجزے کا انتظار کرتی رہے گی۔ پٹیوں میں لپٹے ہوئے چھوٹے سے فتنے کو معلوم نہ ہو سکے گا کہ اس نے میری قسم کی کیسے دھجیاں بکھیر دی تھیں۔

اب میری قسم کا کاغذ تو باقی رہ گیا ہے لیکن لگتا ہے۔ .... اس پر رقم کئے ہوئے تمام حروف خود بخود مٹ چکے ہیں۔ میں پابند تو ہوں لیکن کس کی؟....

مجھے چور کی سزا تو مل رہی ہے لیکن کیوں یہاں وہاں — اب میرے لئے کچھ باقی نہیں۔

میں آپ کو بتا رہی تھی ناں کہ سارا ٹنٹا ہی اس قسم نبھانے کا ہے یا شاید قسم کے ٹوٹ جانے کا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

شاہراہ

سمن آباد سے گلبرگ تک کچھ ایسا فاصلہ نہ تھا۔

ٹیکسی، رکشا، بس سبھی اُدھر جاتی تھیں۔ لیکن نہ جانے کیا بات تھی راحیل اپنے آپ کو جزیرے میں مقید سمجھ رہی تھی۔ ایسا جزیرہ جس پر کوئی جہاز نہیں ٹھہرتا اور جس کے سمندر سے کشتیاں کسی دوسرے جزیرے کی طرف نہیں جاتیں۔ راتوں رات طوفان نے آکر پہاڑی راستے پر منوں من پتھر لا ڈالا تھا اور اب راحیل سڑک کے ایک کنارے معذور کھڑی تھی۔ مگر کھلا راستہ منہ پھاڑے دور تک کھائی بن چکا تھا۔ اور راحیل اس مگرمچھ کے منہ کو تک رہی تھی۔ حیرانی سے خوف سے نئے سمن آباد کے اس چھوٹے سے کوارٹر میں وہ دونوں یکدم ساری دُنیا سے کٹ گئے تھے۔ بھری پری دُنیا میں چھپ کر ستاروں سے آگے چوری چوری جو ایک کائنات بسانے کا دونوں کو ارمان تھا وہ ارمان ایک باسی روہو کی طرح اب بے جان دیدے کھولے پڑا تھا۔ باہر سڑک بنانے والا انجن دھک دھک کرتا روڑی کوٹتا آگے پیچھے چل رہا تھا۔ ہوا میں جلتی کولتار کی خوشبو تھی۔ مردہ ارمانوں کی ارتھیاں جل رہی تھیں۔ ایک جانب کولتار پکانے والی دیو آسا بھٹی کھڑی تھی۔ رام نام ست ہے رام نام ست ہے کی صدائیں چنگھاڑتے انجن سے آ رہی تھیں۔ وہ رام نام جپتا ہوا راہیں بنا رہا تھا۔ روڑی پس رہی تھی کولتار جل رہی تھی۔ سمن آباد سے جانے والی سڑک بن رہی تھی۔

لیکن راحیل کے ذہن میں جو شاہراہ سمن آباد سے گلبرگ تک جاتی تھی اس پر راستہ بند ہے کا بورڈ نصب تھا۔ راستہ پر ڈرم بے ترتیبی سے پڑے تھے اور شاہراہ کی دونوں جانب سُرخ جھنڈیاں گڑی تھیں۔

اس کوارٹر میں پہنچنے سے پہلے راحیل نے اس مشک نافہ جیسی زندگی کے متعلق بہت خواب دیکھے تھے لیکن اَب ان خوابوں کی آنکھیں مرچوں سے بھر گئی تھیں اور مشک نافہ پھٹتے ہی سارے میں گندے نالے کا تعفن پھیل گیا تھا۔ راحیل کی آنکھوں میں صبح کاذب کی جھوٹی چمک تھی۔ بار بار وہ اپنے ذہن کی ٹوٹی شاہراہ پر رک جاتی۔ کھائی جیسے گہرے راستے کو دیکھتی اور سوچتی کیا یہی وہ ستاروں سے آگے دُنیا تھی جو اب مردہ روہو کی طرح بے جان پڑی ہے۔ کیا یہی وہ منہ کھلا مگرمچھ ہے جس کی خاطر اس نے گلبرگ چھوڑا۔ ماں کی محبت کو نارنگی کا چھلکا سمجھ کر اُتار پھینکا۔ کیا یہی وہ دُنیا تھی!۔۔۔ کیا سچ مچ؟ کیا واقعی؟

راحیل کو امارت سے بچھڑنے کا غم نہ تھا۔ نخلِ آسائش سے ٹوٹنے کا رنج نہ تھا۔ لبادۂ عافیت اتار پھینکنے کا افسوس نہ تھا۔ یہ تکلیف تو ایسی تھی، جیسے کسی نے ایئر ڈسپلے میں اپنے محبوب پائلٹ منگیتر کو بغیر پیراشوٹ کے دھکا دے دیا ہو۔

وہ خود اس وقت ہوائی جہاز سے گر رہی تھی۔ بلا مقصد منزل کا تعین کیے بغیر خشکی اور تری سب اس کی نگاہوں میں بھربھرے خاکے تھے۔ کسی جگہ اسی بستی میں اس کا گھر تھا لیکن اس گھر تک جانے کا راستہ کوئی نہ تھا۔ وہ ہوا میں اُتر رہی تھی اور اُمید کا پیراشوٹ اس کے ہاتھ میں نہ تھا۔ انجن سڑک کوٹ رہا تھا۔ راستہ بنا رہا تھا۔ سمن آباد سے گلبرگ جانے والی سڑک۔

راحیل کھڑکی میں بیٹھی سوچ رہی تھی۔ ابھی کل کی بات ہے۔ بالکل کل کی۔۔۔۔۔۔ یوں ہی زبیر بھائی نے اس کے بالکل پاس کھڑے ہوتے آواز دی تھی۔۔۔ "اندر آجائیے۔۔۔۔ بھئی تکلف نہ کیجئے۔۔۔"

زبیر بھائی کی آواز کتنی جانی پہچانی تھی۔ گلبرگ کے گھر کا برآمدہ گرے موزیک کا فرش پام

کے گملے، برآمدے سے نظر آنے والا ڈرائنگ روم، ڈرائنگ روم کے کارنس پر رکھی ہوئی جاپانی گشیا جیسی گڑیا۔۔۔ یہ سب چیزیں اس کے لیے پرانی تھیں۔ اجنبی تھا تو صرف وہ۔۔۔ جانا پہچانا اجنبی۔ جسے آنکھوں نے پہلی بار دیکھا ہو اور دل نے یہ کہہ کر قبول کر لیا ہو کہ واہ صاحب یہ تو وہی ہے۔ وہی، بالکل وہی۔

"ان سے ملو بھئی راحیل یہ سلیمان صاحب ہیں۔ ساری دُنیا میں پانچ فوٹوگرافر ہیں۔ مشہور ترین۔ فریڈرک، باؤ ازٹ۔ چن ہی تانگ ایک کانگو کا حبشی ہے ایک کوئی روسی ہیں بری شولوخوف اور پانچویں ہمارے سلیمان آجاؤ راحیل آجاؤ بھئی۔ اس عظیم فوٹوگرافر سے ملو۔ آؤ ادھر۔۔۔"

راحیل گرے موزیک سے کھسک کر جاپانی گشیا کے پاس جا کھڑی ہوئی۔

دُنیا کا پانچواں بہترین فوٹوگرافر لمبے صوفے پر بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔

گو اس سے پہلے زبیر بھائی راحیل کو دُنیا کے بہترین ادیب، چوٹی کی اداکارہ، دُنیا کا تیسرا بڑا ڈائریکٹر، پاکستان کا پہلا ریڈیو آلوجسٹ، ایشیا کا دوسرا بہترین برین سرجن اور کرکٹ ٹیم کے کئی سکیپر ملا چکے تھے لیکن حسنِ اتفاق سے یہ فوٹوگرافر بڑا جاذب نظر اور کنھیا روپ تھا۔ راحیل نے پانچویں بہترین فوٹوگرافر کی طرف دیکھا۔ پھر دیکھا اور پہلی بار اسے زبیر بھائی کی بات پر یقین آ گیا کہ سلیمان صاحب واقعی دُنیا کے پانچویں بہترین فوٹوگرافر ہیں۔

"سلام علیکم۔۔۔" راحیل نے پھر اس کی جانب دیکھ کر کہا۔

سلیمان صاحب نے سگریٹ کی راکھ جھاڑی۔ آنکھوں کے کہیں پیچھے سے دیکھا اور بمشکل تمام کہا۔ "وعلیکم۔"

زبیر بھائی کا گلبرگ والی کوٹھی میں بس اس قدر کڑ کا دھڑ کا تھا کہ وقت بے وقت پانچ چھ آدمی بلا اطلاع کھانے پر آتے صبح ٹیکسی پر روانہ ہوتے اور شام کو واپس آتے تو ٹیکسی کا میٹر ساٹھ باسٹھ پر ہوتا۔ بہنوں کو باہر جاتے دیکھ کر پھاٹک سے لوٹا دیتے۔ امّی کے ساتھ ہر شام مباحثے مول لیتے اور ہمیشہ جیت جاتے۔ اس جیتنے کی وجہ کچھ ان کی ذہانت یا منطقی دلائل نہ

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تھے. بس سیدھی وجہ یہ تھی کہ امی بالآخر ماں تھیں اور زبیر بھائی کی ہر کڑوی کسیلی جھیل کر پھر ہار مان جاتی تھیں۔

"آیئے بیٹھئے —" بڑی دیر بعد فوٹو گرافر بولا۔

لیکن جب وہ صوفے پر اس کے پاس جا بیٹھی تو سلیمان صاحب نے فوراً اس کی جانب پشت کر لی اور زبیر بھائی سے رولی فلیکس، کوڈک اور ایکٹا کروم کی باتیں کرنے میں مشغول ہو گئے۔

"بازار میں ایک نہایت اعلیٰ سٹینڈ آیا ہے ساڑھے سات سو مانگتا ہے خرید لوں سلیمان صاحب؟" زبیر بھائی نے استفسار کیا۔

"سٹینڈ؟ آپ کا کیمرہ کونسا ہے؟"

"جاپانی ہے — یوشیکا"

"یوشیکا؟ اس کیمرے کو اتنے مہنگے سٹینڈ کی کیا ضرورت ہے؟ آپ میرے ساتھ بلال گنج چلے چلیں میں سو سوا سو میں ایک نہایت معقول سٹینڈ دلوا دوں گا —"

"گریٹ گریٹ —" زبیر بھائی نے نعرہ لگایا "گریٹ ونڈرفل —"

"بلال گنج میں ایک بڑا مالدار کباڑیا ہے۔ بڑا سامان ہے اس کے پاس۔"

"خوب —" زبیر بھائی اب ذہنی طور پر بلال گنج پہنچ چکے تھے۔ "اس کے پاس کیا کوئی انجن نہیں ہے ہوائی جہاز کا — پرانا۔ نیلامی ہوا کرتی ہے نا ان ہوائی جہازوں کی یہ کباڑیئے وہاں سے لے آتے ہیں عموماً —"

"انجن تو میں نے دیکھے تھے —"

"چلو ابھی چلتے ہیں —" زبیر بھائی بولے کہ پاؤں میں اب سنیچر پھڑک رہا تھا۔

"ابھی اس گرمی میں؟ —" اجنبی نے سوال کیا۔

"اچھے مال کو فوراً بک کرانا چاہیئے اور کچھ نہیں تو پیشگی تو دے آئیں۔ آؤ چلو سلیمان .... کم آن —"

زبیر بھائی اپنے دوست کو لے کر اٹھ بیٹھے جس تپاک سے انہوں نے راحیل کا تعارف کرایا تھا اسی تپاک سے وہ اسے بھول بھی گئے. جاتے ہوئے گیلری سے بولے "راحیل ذرا چائے تیار کرنا ہم ابھی آتے۔"

زبیر بھائی دوکانوں پر بیعانے بھر آنے کے عادی تھے یہ بیعانے چار روپے سے لے کر چار سو روپے تک بلا تکلف ادا کیا جاتا تھا۔ کوٹھیاں نئے فیشن کی بیڑیاں، ٹیلی ویژن، ٹرانسسٹر، ہیٹر ریڈیو۔ کیمرے، رسٹ واچ اور ہائی فائی کے متعدد بیعانے ادا کرنے کے باوجود ابھی تک وہ یہ سبق نہ سیکھ پائے پائے تھے کہ پیشگی دینے کے یہ معنی ہرگز نہیں ہوتے کہ پوری قیمت بھی وقت پر ادا کرنا ممکن ہوگا۔

لیکن فوکس ویگن جب شور مچاتی پھاٹک سے نکل گئی تو راحیل کو معلوم تھا کہ اب زبیر بھائی رات گئے آئیں گے اور واپسی پر ان کے ساتھ یہ فوٹو گرافر نہ ہوگا۔

سلیمان کے واپس نہ لوٹنے کا راحیل کو نہ جانے عجیب سا دکھ ہوا۔

زبیر بھائی کی دوستیاں چند روزہ ہوا کرتی تھیں۔ جب تک یہ دوستی رہتی۔ ان کا دوست دنیا کا اعلیٰ ترین آدمی ہوتا وہ سارے گھر کو اس دوست کی خواہشات کے تابع کر دیتے۔ لیکن پھر اچانک ایک روز پتہ چلتا کہ وہ دوست نہایت فراڈ، بدکردار اور لالچی تھا۔ اس لیے اس سے تمام رابطہ قطع کیا جا چکا ہے۔ زبیر بھائی پچھلے دوست کو عاق کرتے ہی فوراً خانہ پوری کی طرف متوجہ ہوتے اور شہر سے واپسی پر ان کے ساتھ کوئی اور نہایت جگری دوست موجود ہوتا۔ یہ نئے حضرت گو چند گھنٹوں کے ملاقاتی ہوتے اور ان سے ملاقات عموماً ہوائی اڈے، کسی ہوٹل، سٹیشن یا کسی دفتر میں ہوتی۔ لیکن اسے زبیر بھائی نہایت بے ساختگی اور دلار سے سور، گدھا، احمق پکار پکار کر باتیں کرتے۔ اس دوست سے اپنی مالی مشکلات، بہنوں کے رشتے، مرحوم باپ کی جائیداد کی بدانتظامی اور والدہ کی ساری شکایتیں بڑی بے تکلفی سے کی جاتیں اور اس کے مشورے کو پچھلے دوستوں کی رائے کے ساتھ ملا ملا کر اس طرح سراہا جاتا کہ پس ماندہ دوست ریاکار اور نو وارد نہایت جانثار نظر

www.iqbalkalmati.blogspot.com

آسنے لگتا۔

دراصل جب تک وہ پانی والے تالاب کے محلے میں رہتے تھے نیں کا ماتھا اس قدر نہ بگڑا تھا۔ چھوٹی سی بستی حکیم جی سے لے کر قلفیاں فالودے بیچنے والے تک سبھی ڈاکٹر صاحب اور ان کے گھر والوں کی عزت کرتے تھے۔ پھر مرحوم ڈاکٹر صاحب نے اپنا جمع جتھا لے کر گلبرگ میں کوٹھی بنوالی۔ لیکن بیچارے ڈاکٹر صاحب کو اس کوٹھی میں رہنا بسنا نصیب نہ ہوا کینسر کی شکایت ہوئی اور وہیں پانی کے تالاب والی حویلی میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔

گلبرگ کی کوٹھی میں آئے ابھی انہیں دو ماہ ہوئے تھے کہ راحیل کی والدہ پر ڈاکٹر صاحب کی جائیداد کو درست کرنے کا بھوت سوار ہو گیا۔ زبیر بھائی کو تھرڈ ایئر کی پڑھائی چھوڑنا پڑی۔ گو ویسے بھی وہ متواتر دو سال سے فیل ہی ہو رہے تھے۔ اب بھائی پھیرو میں جو چھ مربعے تھے ان کی بسائی کے پروگرام بننے لگے۔ زبیر بھائی اپنے ایک انجینئر دوست کو لے کر مع بیس ہزار روپے کے زمینوں پر روانہ ہو گئے۔ یہ انجینئر ایشیا کا تیسرا بہترین انجینئر تھا۔ قریباً پانچ مہینے بعد ایک روز زبیر بھائی لوٹے۔ سفید رنگت سنولائی ہوئی تھی چہرے پر گرد کی تہیں تھیں۔ اماں انہیں دیکھ کر رونے لگیں۔

"راحیل، زیبا، رانی ـــــ ادھر آؤ بھائی جان آتے ہیں ـــ"

گلبرگ والی بہنیں پستول کی گولیاں بن کر نکلیں اور زبیر بھائی سے لپٹ گئیں۔

"ہاؤ آر ـــ مائی ڈیئر ڈیئر سسٹرز ـــ"

"کیوں بھئی راحیل بی اے کر لیا؟ ـــ" زبیر بھائی نے پوچھا۔

"نہیں بی اے کہاں اس نے تو پڑھائی چھوڑ دی ـــ" امی بولیں۔

"وہ کیوں؟ ـــ" زبیر بھائی کڑکے۔

"ٹائیفائیڈ ہو گیا تھا ـــ ڈاکٹروں کا مشورہ ہے کہ سال دو آرام کرنا چاہیئے۔"

ٹائیفائیڈ تو خیر نہیں ہوا تھا لیکن چند دن بخار ضرور چڑھا تھا جس کے بعد راحیل کی طبیعت

پڑھائی سے کچھ ایسی اچاٹ ہوئی کہ دوبارہ کالج کے نام پر ہی دم نکلتا تھا۔

"تم خطوں کا جواب کیوں نہیں دیتے تھے اتنے خط لکھے کسی کا جواب دیا ہوتا ـــ" امی نے زبیر بھائی کو محبت سے ڈانٹا۔

"لیجیے وہاں خطوں کا جواب کون دیتا بیٹھ کر۔ صبح شام زمین کی دیکھ بھال میں لگا تھا۔ میری رنگت دیکھ لیجیے۔ دیکھیے حبشی ہو گیا ہوں مٹی کے ساتھ مٹی ہو گیا۔ بھلا میری عمر ہے کہ زمینوں کی دیکھ بھال کروں۔"

امی کا دل فوراً پسیج گیا ـــ

"اچھا چلو چل کر نہا دھو لو ـــ ہم نے کار خریدی ہے فوکس ویگن ـــ"

"سبز رنگ کی زبیر بھائی ـــ" لڑکیوں میں سے ایک بولی۔

"مزے ہیں بھئی تمہارے ـــ"

"ٹیوب ویل کام کرتا ہے نا اب؟ ـــ" امی نے سوال کیا۔

"کمبخت وہ انجینئر فراڈ نکلا امی ـــ وہ تو ایک ڈھبری بھی نہیں کس سکتا تھا میں نے ڈانٹا ـــ تو ایک رات ـــ یہ پچھلے ہفتے کا واقعہ ہے رات کا وقت ـــ مزارعے میرے گھر سے کچھ فاصلے پر رہتے ہیں۔ رات کے وقت پستول لے کر آ گیا ـــ"

"پستول لے کر؟ ـــ" امی کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔

"جی ـــ اور سینے پر سوار ہو گیا ـــ"

چھوٹی بڑی ہر رنگ کی چیخ لڑکیوں کے منہ سے نکلی۔

"سینے پر سوار ہو گیا ـــ" امی نے فوراً زبیر بھائی کو بازوؤں میں لے لیا۔

"جی ہاں ـــ وہ تو قسمت اچھی تھی کہ صرف مالی نقصان ہوا۔ جان بچ گئی ورنہ اس دیوث نے تو کوئی کسر نہ چھوڑی تھی جان لینے کی ـــ"

"کیوں زبیر بھائی فائر کیا تھا اس نے" ـــ انیسہ نے پوچھا ـــ

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بس یوں سمجھو کہ امریکی فلم کا ایک شوٹ ہوگیا دیہات میں۔ سینے پر سے میں نے اچھالا تو چھپر تک اڑان گئی۔ جھول پڑ گیا چھت میں، اسی ہڑ بونگ میں اسی کی پستول چھوٹ گئی ہاتھ سے۔"

"چلو چپ بھی کرو۔۔ شکر ہے لاکھ لاکھ تیرا اللہ میاں۔۔" امی اب منہ ہی منہ میں یاد بالو کی تسبیح پڑھنے لگی تھیں۔ پانی والے تالاب کی ایک ہمسائی نے انہیں بتا رکھا تھا کہ مصیبت ٹل جانے پر یاد بالو کی ایک تسبیح اللہ کے حضور بہترین سپاس نامہ ثابت ہوا کرتا ہے۔

"پھر زبیر بھائی پھر۔۔؟"

"بھئی ہم تو اسے ایکبار زبان سے دوست کہہ چکے تھے کیسے اس پر فائر کرتے وہ ریاکار الماری توڑ دس ہزار روپیہ ہتھیا کھڑکی سے کود گیا۔۔"

اس وقت امی کو دس ہزار کے عوض اپنے بیٹے کی جان بخشی نہایت سستی نظر آتی۔ لیکن چند دِن بعد جب حکومت کی طرف سے مالیے کا نوٹس ملا تو وہ سوچنے پر آمادہ ہوگئیں۔۔ بھائی پھیرو کی زمین ڈاکٹر صاحب کے عہدِ حکومت میں اچھی خاصی رقم لایا کرتی تھی ادھر مالیے کیلئے بھی حکومت نے احکامات جاری کر دیئے تھے۔ کہ اگر ہفتے کے اندر اندر چھ ہزار جمع نہ کرا دیئے تو ٹیوب ویل ہی نیلام کر دیا جائے گا۔ امی نے بھائی زبیر کو زمین پر بھیجنے کے بہت جتن کیے لیکن وہ ہر بات کا یہی جواب دیتے۔

"امی اب مجھے معلوم ہوا کہ تمہیں زمین زیادہ پیاری ہے اور بیٹا کم۔۔۔ وہاں پاس والی زمینوں پر وہ دیوث انجینئر رہتا ہے کون جانے کب میری زندگی کا چراغ گل کر دے!"

اس منطق کے سامنے امی کے سارے اصرار سرد پانی کے چھینٹے بن گئے۔ بیچاری بھاگم بھاگ دفتروں کے چکر لگاتیں۔ کلرکوں سے لے کر افسروں تک ڈاکٹر صاحب کی بیماری اور انتقال کی ساری تفصیلات بیان کرنے کے بعد کہیں اتنی رعایت ملی کہ مالیہ تین مہینے کے اندر اندر جمع کروا دیجئے۔

زبیر بھائی زمینوں پر کیا جاتے۔ ایک تو امی نے فوکس ویگن خرید لی تھی اور ایک ان کا بہترین جگری دوست جیل روڈ اور ریس کورس کے ناکے پر پیٹرول پمپ بنانے کی بڑی اعلیٰ سکیم ساتھ لے

آیا تھا۔ یہ دوست پاکستان کا چھٹا رئیس ابن رئیس ابن رئیس تھا۔ اس کے پاس رقم اتنی تھی کہ چاہتا تو آدھا لاہور خرید لیتا۔ لیکن حسن اتفاق ۔۔۔ کہہ لیجئے یا شومئ قسمت ۔۔ کہ ان بزنس میں صاحب کی ساری رقم مرچنٹ آف وینس کے انتونیو کے طرح جہازوں میں INVEST ہو چکی تھی اور اس وقت وہ کسی ایسے پارٹنر کی تلاش میں تھا جو انہیں برابر کا شریک بزنس بنا لے لیکن INVESTMENT فوری طور پر طلب نہ کرے زبیر بھائی اس کے تجارتی تجربے سے بہت متاثر ہوئے۔ سب سے بڑی وجہ اس تاثر کی یہ تھی کہ چھٹے رئیس کا کہنا تھا کہ چونکہ واپڈا ہاؤس قریب ہے اور یہاں ایک تونگر طبقہ بستا ہے اس لیے کوئی وجہ نہیں کہ یہ پیٹرول پمپ کامیاب نہ ہو۔ علاوہ ازیں یہ راستہ گلبرگ کی طرف جاتا تھا۔ اور گلبرگ کی بڑی گاڑیاں پیٹرول کی ٹنکی بھرے رہتی ہیں۔ اسی لیے زبیر بھائی کو پوری طرح سے قائل کر چکنے کے بعد صرف روپے کی فراہمی اور درست پلاٹ کی بہم آوری کا کام رہ گیا تھا۔ پیٹرول پمپ کی SANCTION وغیرہ کا سب کام اسی بزنس مین کے سُپرد تھا۔ پلاٹ چننے میں زبیر بھائی نے فوکس ویگن پر کوئی بارہ ہزار میل کر لیے روپے کی فراہمی ان حالات میں کچھ ایسا سہل کام نہ تھا۔ اوّل تو گلبرگ کا معیار زندگی پھر چار بڑھتے چاند جیسی جوان لڑکیاں اور جائیداد کی بدانتظامی پیٹرول پمپ کی زمین چھلاوا بن گئی۔ لیکن زبیر بھائی کو راتوں رات رئیس اعظم بن جانے کا کچھ ایسا اعتماد تھا کہ وہ سر دھڑ کی بازی لگائے بیٹھے تھے پہلے کچھ عرصہ تو روز امی کے ساتھ مباحثہ ہوتا رہا۔ پھر زبیر بھائی نے دھمکی کا ایک ایسا لہجہ اختیار کیا کہ امی کو فوراً پر قینچ کر لیا۔

"آپ کوٹھی رہن کرنے سے گھبراتی ہیں لیکن یاد رکھیئے اگر زبیر چلا گیا تو کوٹھی بیچ کر بھی آپ مجھے تلاش نہ کر سکیں گی۔۔"

امی ہوا نِکلے ٹائیر کی طرح بالکل ہی رہ گئیں۔

دوسرے دِن کوٹھی کے کاغذات بنک میں رکھے گئے اور تیس ہزار روپیہ لے کر زبیر بھائی کے نام منتقل کیا گیا۔ یہ رقم زبیر اینڈ کو کے نام نئے بنک میں جمع کروائی گئی یا اکاؤنٹ حسن اتفاق سے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

وہ بزنس مین صاحب اوبیریٹ کرتے تھے جیل روڈ پر ایک جگہ کا انتخاب ہوگیا اور پانچ سو روپے بھی سائی کے دیئے جاچکے تو دوسرے دن بزنس مین صاحب اچانک ڈھاکہ چلے گئے ان کے دو جہاز پٹ سن سے لدے امریکہ جارہے تھے اور اتنی بڑی رقم کے سامنے معمولی پٹرول کی کیا حیثیت تھی؟

بزنس مین صاحب جن کا نام بختیار رضا تھا۔ بڑی تاکید کرتے ایئرپورٹ پہنچے گینگ وے تک ہاتھوں کے اشارے سے وہ زبیر بھائی کو کہتے رہے کہ کام میں کوتاہی نہ کرے سیمنٹ کا انتظام اور بجری کے ٹرک تیار ہونے چاہئیں۔ شفاف شیشے اور گراؤنڈ گلاس کا آرڈر دیا جائے تو بہتر ہے بزنس مین بختیار رضا کا خلوص دیکھ کر بار بار زبیر بھائی کی آنکھوں میں آنسو آجاتے تھے — "دیکھو یار تم نوجوان بہت منچلے ہوتے ہو میں ہفتے بھر میں آجاؤں گا لیکن میری غیرموجودگی میں کام جاری رکھنا — ایسے لگے رہنے سے کام پایۂ تکمیل کو پہنچتے ہیں۔"

ریلنگ پر ہاتھ ملاتے وقت یہ آخری لفظ پاکستان کے چھوٹے رئیس اعظم نے کہے تھے —

عجیب اتفاق ہوا کہ اس کے بعد زبیر بھائی کو اس بزنس مین سے پھر کبھی سابقہ نہ پڑا اور عجیب تر اتفاق تھا کہ زبیر اینڈ کو کا سارا اکاؤنٹ بختیار رضا صاحب کے نام تھا اور وہ پٹ سن کے جہاز روانہ کرواتے سے پہلے اس اکاؤنٹ کو خالی کرکے بند کروا چکے تھے!

امی کو یہ خبر سن کر پہلی بار دل کا درد اٹھا —

ادھر آمدنی کی صورت یہ تھی کہ ساون کے بادلوں میں سے سورج کبھی کبھی نظر آتا۔

ادھر اخراجات کے تابڑ توڑ پلے وہ تھے کہ اٹیم بم کی طرح زلزلہ خیز۔ لیکن زبیر بھائی ابھی بنی نوع انسان سے مایوس نہ ہوئے تھے وہ کسی ایسے پارٹنر کی تلاش میں سرگرداں تھے جو اس بار خود اثاثہ لگائے اور انہیں برابر کا شریک بنائے۔ امی نے لاکھ لاکھ منتیں کیں کہ بھئی کوئی چھوٹا موٹا کام شروع کرلو۔ لیکن چھوٹے موٹے کام کا جب پڑتا لگانے بیٹھتے زبیر بھائی تو بوکھلا جاتے اور بھنا کر کہتے — "ماں اس سے تو بہتر کہ میں ٹرین تلے آجاؤں —"

امی کے منہ پر یا وہابو کی تسبیح آجاتی اور وہ خاموش ہو رہتیں۔

ادھر گھر کا اثاثہ پھانک بھر تھا ایک حوض کو ایک نالی خالی کیے جارہی تھی اور بھرنے والی میں سے سوائے سوں سوں شور کے ایک قطرہ بھی نہ نکلتا تھا۔ امی نے حالات سے تنگ آکر گلبرگ کی آدھی کوٹھی کرائے پر چڑھائی اور سکھ کا سانس لیا۔ اب دال آٹے کی فکر سے تو نجات ہوئی لیکن ماں بیٹا دونوں پیدائشی اسکیمو تھے۔ بیٹے کو اپنی لگن اُڑائے پھرتی تھی۔ ماں بیٹے کے فلک بوس پلان دیکھ کر کچھ ایسی بوکھلائی کہ سرے سے خوداعتمادی ہی کھو بیٹھی تھی اور نہایت زمین دوز قسم کے پلان بنانے پر مجبور ہوگئی تھی۔

پہلی بزنس جو امی نے کی وہ مرغیوں کا ڈربہ بنانا تھا۔

ڈربے کی جالی خرید کر جب انہوں نے رمضان مستری کو بلوایا تو زبیر بھائی گھر پر نہ تھے۔

ڈربوں میں جب منارکا، دیسی، لگ ہارن اور رہتی والی مرغیاں آگئیں تو زبیر بھائی معائنے کو آئے۔ ایک بزنس مین دوسرے بزنس مین کے روبرو سروقد ایستادہ ہوگیا۔

"امی میں نے آپ سے کہا تھا کہ خدا کے لیے مرغیاں نہ پالیں نہ پالیں اس میں کوئی فائدہ نہیں۔"

"فائدہ کیوں نہیں میں نے پڑتا لگایا ہے فی مرغی ایک روپے بارہ آنے بچتے ہیں۔"

"اور ایک مہینے میں کتنی مرغیاں بیچیں گی آپ؟"

"یہی کوئی دو سوا دو سو —"

"یہ بھی کوئی نفع ہے —" زبیر بھائی تاؤ میں آکر بولے

"ہم تمہاری طرح لاکھوں کے خواب نہیں دیکھتے آٹے دال کا خرچ چلاتے ہیں۔"

زبیر بھائی کچھ تو اس دلیل سے خائف ہوگئے کچھ ان دنوں دنیا کا بہترین ساتواں فلم ڈائریکٹر ان کا دوست بنا تھا اور ڈرائنگ روم میں بیٹھا پائپ پی رہا تھا۔ زبیر باورچی خانے سے ماچس لے کر ڈرائنگ روم کی طرف لوٹ گئے۔

مرغیوں نے پہلے پہل تو بہت جلوہ دکھایا۔ امی ان کے سامنے اپنے ڈربے صاف کرواتیں فنیل ڈلواتیں پینے کے کٹورے صاف کرواتیں باسی دانہ دنکا تبدیل کرنے کا انتظام کرتیں۔ رفتہ رفتہ انہیں نہالو جمعدارنی اور رمضان پر بہت اعتماد ہو گیا۔ دراصل یہ مرغیوں کا کاروبار انہوں نے رمضان مستری کے مشورے پر ہی کیا تھا۔ وہ گلبرگ میں امی کے پچھواڑے کوارٹروں میں رہتا تھا اور نسبت روڈ پر ایک مشہور دوکان میں ملازم تھا۔ چار بجے چھٹی کے بعد جب وہ گھر لوٹتا تو اس کی بیوی آرام سے بیٹھنے نہ دیتی اس لیے اس نے بیگم صاحبہ کے ساتھ بزنس کھول لی۔ اس بزنس میں اثاثہ بیگم صاحبہ کا تھا اور محنت رمضان کی!

آدمی قابلِ اعتماد تھا لیکن بیوی سے بہت خائف تھا اور بیوی چھٹی بار زچگی سے دوچار ہوئی تو ایک دن رمضان چھٹپٹے کے وقت ایک چوزہ ڈربے میں سے نکال کر لے گیا۔ گھر کے چوزے کی یخنی کا سواد کچھ ایسا تھا کہ رمضان کو بھی دو چار چسکیاں لگا کر اپنے اندر گرمی سی محسوس ہوئی۔

کچھ دنوں میں ڈربے خالی خالی سے ہونے لگے ـــــ بیگم صاحبہ کو جب خبر ملی کہ مرغیوں کو رانی کھیت کی وبا نے آن دبایا ہے تو وہ بوکھلا گئیں۔ باقی رہتے سہتے پچیس ولائتی مرغے مرغیاں انڈے ڈربے کی جالی والی سب رمضان کے توسط سے ڈولنگٹن مارکیٹ میں ایک دوکاندار کو فروخت کر دیں۔ اس ناکامی سے دو آدمیوں کو بہت فائدہ پہنچا۔ ایک تو رمضان نے فوراً ٹرانسسٹر خرید لیا اور زبیر بھائی جو پہلے امی کی باتیں کان لپیٹ کر سن لیتے تھے اب پلٹ کر جواب دینے لگے۔

"امی بزنس چیز ہی ایسی ہے کبھی تخت کبھی تختہ ـــــ دیکھ لیجیے آپ کا مرغیوں کا بزنس نہیں ہو گیا۔ ہم کوئی آپ کو طعنہ تھوڑی دیتے ہیں؟"

پہلے زبیر بھائی امی کی باتوں سے لاجواب ہو کر کبھی انجن تلے آنے کی دھمکی دیا کرتے تھے کبھی روپوش ہونے کا ڈنڈا دکھاتے تھے سونزل پھانکنے کو بھاگتے تھے اب ان جوش آور باتوں سے فوراً نجات مل گئی اور وہ ایک ہی جست میں امی سے آگے نکل گئے۔

امی نے پہلے تو مرغیاں پالیں پھر اس سکیم میں ناکامیاب ہو کر تین درزی گھر بٹھائے اور ریڈی میڈ کپڑے سلانے اور بیچنے کا پروگرام بنا۔ درزی بڑی اعلیٰ دوکانوں میں کام کر چکے تھے اور ان کی ساکھ خود ان کی اپنی نظروں میں بہت زیادہ تھی وہ تینوں پتلون پہنتے تھے اور کلائیوں پر گھڑی باندھتے تھے۔ اڈے پر بیٹھنے کے لیے جو پاجامے وہ پہنتے وہ عین چار بجے گھڑی دیکھ کر اتار دیئے جاتے اور پتلونیں کس لی جاتیں چار بجے کے بعد جتنا بھی وقت کام پر لگتا سارا اوور ٹائم میں درج ہوتا۔ ماہ بھر کے بعد تینوں درزیوں کا اوور ٹائم تنخواہ سے زائد نکلا۔ ریڈی میڈ کپڑوں کی سجاوٹ میں جولیس، فینسی بٹن، ڈوریاں دھاگے استعمال میں آتے تھے عموماً ان کی قیمت گلبرگ مارکیٹ کی وجہ سے دوگنی ہوتی مہینہ بھر بچوں کے کپڑے دھڑا دھڑ سلانے اور پلاسٹک کے تھیلوں میں بند کروانے کے بعد جب گھر میں ریڈی میڈ کپڑوں کے سوائے اور کوئی چیز نظر نہ آنے لگی تو ان کے بیچنے کا سوال پیدا ہوا۔ اس سے پہلے امی کا خیال تھا کہ ریڈی میڈ کپڑوں کی مانگ اتنی ہے کہ اگر گھر گھر دوکانیں کھل جائیں تو بھی مانگ کم نہیں ہو سکتی۔ لیکن اب بیچنے کا سوال ٹیڑھا بن گیا۔ زبیر بھائی کو جتنے پیکٹ دیئے گئے وہ تمام سامپل مختلف دوکانوں پر پھینک آئے اس روز بہت ہنگامہ ہوا۔ زبیر بھائی بیس پیکٹ لے کر گئے تھے سارا مال قریباً ڈھائی سو روپے کا تھا۔

"مال دے آئے ـــــ؟" امی نے زبیر کو پورچ میں ہی آتے پوچھا ـــــ

زبیر بھائی نے اپنے بالوں پر ہاتھ پھیرا دھماکے کے ساتھ فوکسی کا دروازہ بند کیا۔ اور اکڑ کر بولے ـــــ "امی دم تو لینے دو ـــــ"

امی چند لمحے ساکت رہیں پھر بولیں "مختلف دوکانوں پر مال دیا تھا کہ ایک ہی ڈیلر کے دے کر آئے ہو ـــــ"

"مارکیٹ میں تو فلڈ آیا ہوا ہے ریڈی میڈ کپڑوں کا ـــــ تئیس دوکانوں پر گیا کوئی مال

اُٹھانے کو تیار ہی نہیں ہوا۔ مَیں تو بہت پریشان ہوا۔ بالآخر ایک دوست مل گیا انارکلی میں۔ وہ کپڑا امپورٹ کرتا ہے۔ تین لاکھ کا لائسنس ہے اس کا ۔۔۔ پاکستان کا بہترین بزاز ہے۔ اس بیچارے نے بہت ٹائم ویسٹ کیا۔"

"پھر؟"

"دے دیا ہے بھئی دے دیا ہے۔"

"ایک دوکان پر کہ مختلف دوکانوں پر۔"

"دس دوکانوں پر مال دیا ہے۔"

دس دوکانوں کا نام سنتے ہی امی کی آنکھوں میں موتیا بند اُتر آیا۔

"رسیدلے لی تھی ان دُکانداروں سے؟" امی نے ڈرتے ڈرتے سوال کیا۔

زبیر بھائی اب گیلری تک پہنچ چکے تھے۔ غصّے میں ان کے ہاتھ سے کار کی چابی چھوٹ کر موزیک کے فرش پر گری اور وہ چڑ کر بولے ۔۔۔"واہ اماں کوئی بے اعتباری معاملہ تھوڑی ہے۔ میرا دوست ساتھ تھا۔ بھلا مَیں اس سے رسیدیں مانگتا!۔"

امی کا ماتھا ٹھنکا پہلی بات پر تھا۔ اب رسیدوں کی عدم موجودگی نے ادھ موا کر دیا۔ چلا کر بولیں ۔۔۔"احمق! تیرے دوست میرے دیکھے بھالے ہیں۔ جو ساری رقم نہ ڈوب گئی تو مجھے سیّد ہاشم علی کی بیٹی نہ کہنا۔۔۔"

زبیر بھائی کو سارے جملے میں احمق پر اعتراض تھا چمک کر بولا ۔۔۔ اسی لیے تو مَیں آپ کے کسی کام میں دلچسپی نہیں لیتا۔ خواہ مخواہ انسان کو گالیاں سننا پڑتی ہیں۔۔۔"

"مَیں نے تو اس لیے پوچھا تھا کہ تمہارے دوست ایسے ہی ہیں۔"

"کمال کرتی ہیں آپ بھی امی ۔۔۔ دوستوں پر ایسی بداعتمادی؟"

اس کے بعد امی نے زبیر بھائی کے تمام دوستوں کا کچا چٹھا کھول کر سنایا۔ ساتھ ساتھ زبیر بھائی پر بھی کچھ ایسا کڑا تبصرہ جاری ہوا کہ وہ اندر گھس کر اپنا سامان باندھنے لگے۔

اب سامان باندھنے والا معاملہ امی کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ کہاں تو امی ڈانٹ ڈپٹ رہی تھیں کہاں الٹی سیدھی سنجاف وقاقم میں لپٹی ہوئی نرم نرم باتیں کرنے لگیں۔ پہلے زبیر بھائی اکڑے پھر کچھ ٹھنڈے پڑے پھر امی کی بدسلوکی پر تفصیلی تبصرہ کیا اور جب امی اپنی بیوگی کا رومال آنکھوں سے لگا لگا کر رونے لگیں تو بیچارے زبیر بھائی نہ صرف پسیجے ہی گئے بلکہ امی سے پچاس روپے تاوان لے کر انہوں نے سامان بھی کھول لیا۔۔۔

ریڈی میڈ کپڑوں کی بزنس خُدا جانے کیوں فیل ہوگئی۔ درزی بھی قابل تھے کپڑے بھی خوبصورت سلے لیکن کچھ تو پہلے ہی سامپل نہ لوٹے نہ ہی دُکانداروں نے ان کپڑوں کی قیمت ادا کی امی اس نقصان سے جانبر ہوئیں تو ایک دِن ایک درزی دو سو روپے کا کپڑا لے کر چمپت ہوگیا۔ بدقسمتی سے اس درزی پر امی کو سب سے زیادہ اعتماد تھا۔ پھر ایک مشین نہ جانے کیسے بگڑ گئی۔ اس میں دو تین مرتبہ پرزے بدلوائے لیکن ہر بار کپڑا مشین کے پیر تلے دھرتے ہی ہتھی رُک جاتی۔ ایک انچ کپڑا آگے نہ بڑھتا۔

یہ سب باتیں بھی شاید حوصلہ شکن ثابت نہ ہوتیں لیکن پھر اچانک دونوں درزی چھٹی لے کر ایسے چمپت ہوتے کہ مشینیں ادنی پونی قیمت پر بک گئیں۔ سارے ریڈی میڈ کپڑوں کو آدھی قیمت پر بیچ کر اس بزنس سے چھٹکارا ملا۔

یہ بزنس کیا فیل ہوئی زبیر بھائی صبح وشام بغلیں بجاتے امی سے ریڈی میڈ کپڑوں کی سیل کے متعلق سوالات کرتے درزیوں کی چھٹی کے بارے میں حیرت ظاہر کرتے۔ مشینوں کے کل پرزے بگڑ جانے پر اظہارِ افسوس کرتے کچھ عرصہ امی نے یہ ڈھکی چھپی طنز برداشت کی پھر صاف صاف زبیر بھائی سے کہہ دیا کہ اگر کسی نے مرغیوں کا یا ریڈی میڈ کپڑوں کا ذکر کیا تو وہ گھر چھوڑ کر چلی جائیں گی۔

امی کے اس موڈ سے زبیر بھائی خوب مستفیض ہوئے۔ وہ پہلے تو امی کے سامنے فلم کمپنی بنانے کا ذکر کرتے شرماتے یا گھبراتے تھے لیکن کپڑوں کی سکیم کیا فیل ہوئی انہیں فلم کمپنی کا پروانہ مل گیا۔ اس سلسلے میں ہر بھانت کے پنچھی بکھیر و گھر آنے لگے۔ لمبے لمبے بالوں والے ایکٹر نما

www.iqbalkalmati.blogspot.com

الیکٹرجن کے دانت پان کی وجہ سے سیاہ ہو چکے تھے اور چہرے پر گرسنہ بھیڑیئے کی برہنہ درندگی تھی — ایسے امیر اشخاص جو امیر کم تھے اور کوکا کولا کا خرچ زیادہ کرواتے تھے دُنیا کے بہترین میوزک ڈائریکٹر، سلور سکرین کی آئندہ بہترین ایکٹریس — اور فوٹوگرافر!

فوٹوگرافروں کی فہرست میں سلیمان چوتھا شخص تھا اور دُنیا کا پانچواں بہترین فوٹوگرافر سلیمان سے پہلے اس گھر میں اتنے نوادرات داخل ہو چکے تھے کہ اصولاً اس کا گھر والوں پر کوئی خاطر خواہ اثر نہ ہونا چاہیئے تھا لیکن راحیل جیسے بنجر زمین تھی جو بارش کی آمد میں پھٹی پڑتی تھی۔

راحیل پر دُنیا کے پانچویں بہترین فوٹوگرافر کا عجب اثر ہوا۔

وہ سب سے بڑی تھی۔ زیبا، رانی، انیسہ بتدریج دو دو تین تین سال چھوٹی تھیں۔

پانی کے تالاب والے ڈاکٹر صاحب کی اپنے زمانے اور اپنے علاقے میں بڑی عزت تھی۔ وہاں کے ایک مقامی سکول میں چاروں لڑکیاں پڑھنے جاتی تھیں۔ جس کسی مضمون میں کوئی لڑکی کمزور پائی جاتی فوراً ہیڈ مسٹریس متعلقہ مضمون کی استانی کو مناسب ہدایات دیتیں اور لڑکی بغیر ٹیوشن ادا کیے اسی مضمون میں طاق ہو جاتی۔ گلبرگ میں پہنچ کر چونکہ ابا جی کا ساتھ بھی چھوٹ چکا تھا۔ اس لیے نئے کالج میں داخلہ لیتے ہی راحیل احساسِ کمتری کا شکار ہو گئی۔ یہاں اس سے خوبصورت، زیادہ فیشن ایبل، نہایت امریکی انداز میں انگریزی بولنے والیاں صف در صف لڑکیاں موجود تھیں۔ راحیل نے جی ہی جی میں اس ماحول کے خلاف جہاد کرنے کی ٹھانی۔ لیکن بیچاری کا عزم آتشبازی کی طرح تھا کہ دم بھر کو انار سا پھول اُٹھتا پھر گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا جاتا۔ راحیل دو سال تو الگ تھلگ رہی کچھ مریل اور دیسی لڑکیاں توڑ تاڑ کر اپنے ساتھ بھی ملائیں لیکن موثر قسم کا گروپ نہ بن سکا۔ جس طرح وی گروپ تھا یا جیسا کارنیشن گروپ تھا کہ ساری لڑکیاں ہر فنکشن پر ایک ہی طرح کا لباس پہنے بالوں میں کارنیشن کے پھول لگا کر آیا کرتی تھیں۔ راحیل کو لیڈری کا شوق بہت تھا لیکن جبلی طور پر وہ پیروکار تھی۔ شوق کی بلندی اور ہمتوں کی پستی نے یہ گل کھلایا کہ تھرڈ ائیر تک تو پہنچ گئی لیکن چند دن بیمار کیا پڑی کالج جانے

کی ہمت ہی باقی نہ رہی۔ کالج چھوٹنے کا قصہ بھی خوب ہنگامہ خیز رہا۔ ان دنوں زبیر بھائی زمینوں پر پاکستان کے بہترین انجینئر کے ساتھ بھائی پھیرو گئے ہوئے تھے۔ امی کے ہر خط کا جواب جب وہاں سے نہ آتا تو وہ بھڑک بھڑک کر اپنا غصہ چاروں لڑکیوں پر نکالتیں ان ہی دنوں رانی نے یہ شوشہ چھوڑا کہ راحیل باجی اب کالج نہیں جائیں گی پہلی بار جب یہ بات ہوئی تو امی ہری فوکس ویگن پر تیسرے کوارٹر کا ٹوکن لگوا کر شہر سے آ رہی تھیں۔ ابھی گھر میں قدم ہی رکھا تھا کہ رانی نے کہہ دیا۔ "امی باجی راحیل کالج نہیں جائیں گی۔"

ٹوکن کے پیسے ادا کرنے کے بعد جو ایک قسم کا دکھ امی کو ہر بار ہوتا تھا اس پر اس جملے نے تازیانے کا کام دیا۔ "کیوں — ؟ کس لیے نہیں جائے گی وہ ؟ —"

رانی بدک گئی۔ ساتویں جماعت کی طالب علم کو معلوم تھا کہ اس وقت یہ خبر ایسی وحشت خیز ثابت ہو سکتی ہے۔ امی تو یکدم آگ بھبھوکا ہو گئیں۔ چیخ کر بولیں "اللہ جانے کس گناہ کی سزا ملی ہے ایک لڑکا تھا سو ناکارہ ثابت ہوا۔ اس بیٹی پر آس تھی سو یہ بھی کورا جواب دے رہی ہے۔"

اپنے بچوں کی ہسٹری سے لے کر راحیل کے اس انکار تک پوری تفصیل سے سناتی اور اپنے ارمانات کی فہرست مرتب کرتیں ہوئی راحیل کے کمرے تک پہنچیں۔ وہ اس وقت فرانسیسی دریچوں کے سامنے سفید چادر گھٹنوں تک اوڑھے پیالی میں یخنی پی رہی تھی۔ تازہ تازہ بخار اترا تھا چہرے پر چکنے زرد لیموں کی رنگت تھی۔

امی برسنے لگیں — "رانی کیا کہتی ہے ؟ —"

"کیا کہتی ہے رانی ؟ — ٹوکن بنوا لیا آپ نے ؟" راحیل نے بڑے معمولی لہجے میں پوچھا۔

"ٹوکن گیا بھاڑ میں — رانی کہتی ہے تم بی اے کرنا نہیں چاہتیں —"

زرد لیموں کی رنگت پر آبنوسی پلکیں جھکا کر راحیل بولی — "جی امی — ؟"

ایسے سادہ مثبت جواب کی امی کو امید نہ تھی۔

"کیوں ؟ —"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"میں سمجھتی ہوں امی بار بار فیل ہو کر جو پیسہ برباد کروں گی تو — یہی بہتر ہے کہ پڑھائی چھوڑ دوں کچھ تو بچت ہو گی ناں —"

"تم بچت کا فکر رہنے دو۔ پہلے جو بچتیں کام آ رہی ہیں تم آرام سے پڑھائی کرو —"

پلکوں کی صف اُٹھائے بغیر راحیل بولی —"امی میں پڑھائی نہیں کر سکتی —"

"تیری یہ مجال ؟ —"

وہ تو امی مار بھی بیٹھتیں پر لڑکی کا بخار دو دن ہوئے ٹوٹا تھا۔ بھنا کر سفید چادر پر جا بیٹھیں۔

"مجال نہیں امی — میں عرض کر رہی ہوں"— راحیل نے منت کی۔

"لیکن کوئی وجہ ؟ —"

"میں — میں اتنی ذہین نہیں ہوں کہ بی اے کر سکوں —"

اَب امیّ رونے لگیں ساتھ ہی ساتھ ان کے منہ سے لوگوں کے متعلق رشک کے کلمات نکلنے لگے اللہ نے میری ہی قسمت کھوٹی بنائی تھی۔ ورنہ معمولی دائی سکینہ کے دونوں بچوں نے بی اے کر لیا۔ مستری رمضان کا لڑکا ان دنوں ولایت میں ہے۔ مہرالٰہی کی بھانجی پروفیسر ہو گئی — جو لوگ ہمارے برابر نہ بیٹھتے تھے ان کی اولادیں پڑھ گئیں اور ایک ہم ہیں کہ —— کہ کہ — نہ بیٹا پڑھ سکا نہ بیٹی —"

راحیل پر ان باتوں کا اثر اتنا جلدی ہوا کہ وہ فوراً لیٹ گئی۔ یخنی کا پیالہ کھڑکی کی سل میں پڑا رہا اور راتوں رات پھر بخار چڑھ آیا اور ایسا تیز چڑھا کہ راحیل پر سرسام کی کیفیت طاری ہو گئی۔ جس وقت ڈاکٹر نے مکمل آرام کے ساتھ آئس کیپ بھی رکھنے کا مشورہ دیا تو امی کے ہاتھ پاؤں پھول گئے اَب وہ رومال کو برف میں کم بھگو رہی تھیں اور آنسوؤں سے زیادہ تر کیے جا رہی تھیں۔

ماتھے پر برف سے تر رومال دھر کر امیّ کہتیں۔"دفع کر پڑھائی، صدقے کی پڑھائی۔ ایک

بار بخار اُتر جائے تو جو کبھی میں بی اے کا نام بھی منہ سے لوں تو کافر — اللہ پنج تن پاک کی خاطر — اپنے حبیب کے واسطے — ایک بار راحیل کو صحت دے — ایک بار —

گرمی کی تپش سے رومال ماتھے پر چھنکنے لگتا وہ اسے اٹھاتیں آنکھوں سے لگاتیں اور پھر کٹی ہوئی برف کے تسلے میں ڈال دیتیں۔

یاد ہا لو کا وظیفہ پڑھتے پڑھتے جب امی کا حلق اور زبان کانٹے کی طرح سوکھنے لگی تو بخار نے میدان چھوڑ دیا۔ بخار اتر گیا اور ساتھ ہی نہایت ڈرامائی انداز میں راحیل کی پڑھائی بھی چھوٹ گئی۔

پہلے کالج جانے سے راحیل کی زندگی کا ایک نظام قائم تھا۔ اَب وہ نظام تتر بتر ہونے لگا۔ کبھی صبح نماز پڑھنے کا دورہ پڑ جاتا تو ہفتوں تارے کھلے رات ہی میں غسلخانے سے وضو کرنے کا شور آنے لگتا۔ پھر ایک دن نماز پر سے نہ جانے کیوں راحیل کا اعتقاد اُٹھ گیا۔ دودھ سے بالائی اترتے ہی راحیل مردوں سے شرط باندھ کر سونے لگی۔ گیارہ بجے تک نیند کی جاتی پلنگ سے نہ اترتی۔ ناشتہ پڑا پڑا ٹھنڈا ہو جاتا۔ چائے پر سفید جھلی چڑھ آتی۔ لیکن راحیل صلیب کا نشان بنی بازو پھیلائے ٹانگیں جوڑے پلنگ پر اوندھی پڑی سوتی کھانے پر آتی تو برتنوں میں جھوٹن تک نہ رہنے دیتی اور فاقہ کشی کی دھن سوار ہو جاتی تو کئی گھنٹے کمر اور کولہے ٹیپ سے ناپ کر رہ جاتی اور اس خوف سے پیٹ میں کچھ نہ ڈالتی کہ کہیں آدھی انچ کمر نہ بڑھ جائے۔

کام کرنے کا بھوت کچھ دنوں سوار رہتا تو جھاڑو پھیرنے سے لے کر برتن مانجھنے تک اور غسلخانے دھونے اور بستر بچھانے اور لپیٹنے کا سارا کام جنوں کی طرح جھپاک سے کر دیتی پھر آلکسی کا دورہ پڑتا تو اپنے منہ کی مکھی اڑانا بھی دوبھر ہو جاتا۔

ایسے دن اور رات تتی کرتے کرتے زمانے کی دھجیاں اڑنے لگیں اور راحیل کی زندگی بے مصرف غیر دلچسپ اور بے معنی نظر آنے لگی۔ ان دنوں اس پر پہیلیاں بنانے کا دورہ پڑ گیا سب سے پہلی پہیلی پڑوس میں رہنے والی نور جہاں تھی۔ نور جہاں تھی بھی نور جہاں ؟ ...

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سڑک اور جس جگہ سے وہ گزر جاتی قہقہے سے جل اٹھتے۔ اسی طرح نوری کے کپڑوں کی تراش خراش اس کی عینکوں میں جڑے ہوئے رنگ برنگ کے موتی اور سوموار منگل وار والی چال پر سب کی نظر پڑتی تھی۔

راحیل نے نوری سے دوستی میں کپڑوں کے نئے نئے نمونے میک اپ کا جدید طریقہ باتیں کرنے کا نیا فیشن امریکی فلمی اداکاروں سے قلمی دوستی کا ارمان اور ایک نہایت ٹیڈی قسم کے امیر زادے سے بیاہ کے خواب ادھار مانگ لیے۔

ایسے کئی خیرسگالی وفد نما دوستانے بنے اور ٹوٹے — راحیل جدید کٹ لڑکے میں قدیم قسم کا خلوص چاہتی تھی جب خلوص کو بھی زاویہ قائمہ بنتے نہ پایا تو وہ ان روز روز کی دوستوں سے بھی تنگ آ گئی۔ اب رومانی اور جاسوسی ناول پڑھنے کا دور آیا۔ یہ دور بذات خود بڑا پُرسکون تھا۔ امی جو اس کی طرف سے مشکوک ہو رہی تھیں یکدم پلستر شدہ سڑک کی طرح ہموار ہو گئیں۔ ان کا خیال تھا کہ لڑکی کے چالے درست نہیں لیکن جب راحیل پہروں کتابوں سے چہرہ اُٹھا کر نہ دیکھتی تو وہ پریشان ہونے کے بجائے خدا کا شکر کرتیں کہ ایکبار پھر بچّی کے دل میں تعلیم کا ارمان تو اُٹھا —

یہ ان ہی کتابوں کی ورق گردانی کا دور تھا جب زبیر بھائی دُنیا کے پانچویں بہترین فوٹوگرافر کو لے کر گھر پہنچے۔

سلیمان صاحب دُنیا کے پانچویں بہترین فوٹوگرافر تھے، راحیل اس سے پہلے ایشیا کے بہترین کامیڈی سٹار، اٹامک ریسرچ کے تیسرے بڑے سکالر، افروایشیا کے چوتھے بڑے سیاست دان اور فلم انڈسٹری کے کئی نامور ڈائرکٹروں کو مل چکی تھی۔ لیکن نہ جانے وہ کچھ لمحہ قبولیت تھا کہ مٹی ہموار ہو چکی تھی سلیمان صاحب کو دیکھتے ہی راحیل کو یقین آ گیا کہ اگر تصویر کسی کو بنانا آتی ہے تو یقیناً یہی وہ شخص ہو گا۔ عورت جب کسی مرد کی ہنرمندی اور ذہانت سے مرعوب ہوتی ہے تو پھر یوں دھوبی پٹڑا کھا کر چت ہوتی ہے کہ عمر بھر اٹھنے کی سکت باقی نہیں رہتی۔

پہلی ملاقات کے دوسرے دن راحیل بیٹھی گمنام حسینہ پڑھ رہی تھی کہ جھٹپٹے کے وقت سلیمان صاحب دوبارہ آئے، گھونگھریالے بالوں میں تھوڑی سی گرد تھی۔ چہرے پر ہلکی سے تکان تھی۔ آنکھوں کے ملالی انداز میں تھوڑی سی گھبراہٹ اور چال میں بے یقینی پن ——

راحیل سے سلیمان صاحب نے پوچھا — "زبیر صاحب گھر پر ہیں؟"

راحیل نے آنکھوں ہی آنکھوں میں زبیر بھائی کا پتہ کم بتایا اور اپنا ٹھکانا زیادہ سمجھا دیا۔

"ابھی ابھی شہر گئے ہیں جی —"

"اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو مَیں تھوڑی دیر ان کا انتظار کر لوں اندر؟ —"

"جی آجایئے — ضرور!"

راحیل نے خوبصورت کارنس والا ڈرائنگ روم کھول دیا۔ گو امارت کو اس گھر سے جدا ہوئے عرصہ ہو چکا تھا۔ لیکن کوٹھی تھی اور اس کمرے کا سارا سامان جدید اور قیمتی تھا۔

"آپ غالباً — راحیل ہیں! —"

غالباً کہتے ہوئے سلیمان کے ہونٹ خطرناک سازش کے ساتھ آپس میں ملے۔

"جی —"

"آپ نے بی اے نہیں کیا غالباً —"

پھر ہونٹ اسی وحشت ریز انداز میں ملے۔

"جی —"

"اور غالباً آپ جی کے سوا اور کوئی لفظ نہیں جانتیں؟ —"

اس بار راحیل کے لب کھلے مسکراہٹ نے اس کے چہرے کو قند آلود کر دیا وہ شوخی سے بولی — "اور غالباً کے علاوہ آپ بھی کچھ نہیں جانتے —؟"

سلیمان شاید پانچواں بہترین فوٹوگرافر تھا کہ نہیں وہ دُنیا کا پانچواں فلرٹ ضرور تھا۔ گرگ صورت لڑکی کو یوں گوسپندی صفات کا حامل پایا تو فوراً گنڈی بنی لگا۔ محتاط ہو کر

مچان پر بیٹھ گیا اور شکار کی پوری نیت باندھ لی۔

"آپ بیٹھیں گی میرے پاس — دراصل میں کبھی کمرے میں اکیلا نہیں بیٹھتا — نروس ہو جاتا ہوں یکدم —"

راحیل نے آراستہ کمرے پر نظر ڈالی اور پھر تعجب سے بولی — "ہمارا گھر آسیب زدہ نہیں ہے سلیمان صاحب —"

"آسیب زدہ گھر میں تو بیٹھ جاتا ہوں اطمینان سے ایسے گھروں میں نہیں بیٹھ سکتا —"

اس نے کمرے کی قیمتی چیزوں کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

راحیل ایک صوفے پر ذرا سی آگے کو ہو کر بیٹھ گئی۔

"جتنی دور آپ بیٹھی ہیں معاف کیجئے اتنی دور سے مجھے کچھ نظر نہیں آتا —" سلیمان چہرے سے عینک اتار کر اسے تپائی کے میز پوش سے صاف کرنے لگا۔

"یہ دور کی عینک اسی لیے لگا رکھی ہے کہ چیز کچھ تو قریب نظر آئیں —"

راحیل سلیمان سے تین فٹ کے فاصلے پر آ بیٹھی۔

"اب آپ بہت قریب آ گئی ہیں۔ میں ایسی خوشبوؤں کا عادی نہیں —"

راحیل رومان بھرے افسانے تو بہت پڑھ چکی تھی۔ لیکن ایسے شخص سے اسے پہلی بار سابقہ پڑ رہا تھا جو اسے بندریا کی طرح نچائے اور اس نچانے میں اسے لطف بھی ملے گڑبڑا کر اٹھی اور عین سلیمان کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ سلیمان نے چشمہ آنکھوں پر لگایا اس سن تمیز کو پہنچی ہوئی غیرت ماہ پر نظر ڈالی اور لقمہ لذیز کو خوب جانچ کر بولا —

"بھئی آپ بیٹھ جایئے ورنہ میں بیٹھا نہ رہ سکوں گا —"

راحیل یکدم سلیمان کے پاس قالین پر بیٹھ گئی۔

دو زانو بیٹھی ہوئی گیتا پر سلیمان نے نظریں ڈالیں اور مسکرا کر پوچھا "ٹیڈی لباس میں شاید اس کے علاوہ نشست کا اور کوئی طریقہ ہی نہ ہو گا —"

راحیل کا دل چاہا اُٹھ کر کہیں بھاگ جائے چھپ جائے کم از کم بھاگ جانا تو اس کے بس کی بات تھی — لیکن خدا جانے کیا ہوا کہ نہ تو وہ اُٹھ سکی نہ بھاگ سکی اور نہ ہی اس ملاقات کے بعد اس نے سلیمان کو ملنا چھوڑا —

پورے ماہ بھر بعد زبیر بھائی پر عیاں ہو چکا تھا کہ سلیمان نہ تو دُنیا کا بہترین فوٹوگرافر ہے اور نہ ہی ان کا دوست ہے لیکن سلیمان اَب گھر کا اس قدر مکمل فرد بن چکا تھا کہ اسے مچھلی کے کانٹے کی طرح نکال کر پھینکنا ممکن نہ تھا۔ وہ باورچی خانے میں دندناتا جاتا۔ نعمت خانے میں سے سالن اور ڈبے میں سے باسی روٹی نکال کر خود ہی بلا اطلاع کھاتا۔ فریج کھول کر اپنے پسند کی چیزیں نکال کر ہڑپ کرتا۔ امیّ کی بی کومپلیکس دوائی اسے بڑی پسند تھی۔ میٹھے کے بجائے نارنج ملی خوشبو والی اس دوائی کے دو چمچے پی کر اس کے چہرے پر تازگی آ جاتی۔ کچھ تو امیّ اور زبیر بھائی کی سکیمیں علیحدہ علیحدہ فیل ہو چکی تھیں کچھ امیّ پانی والے تالاب والے گھر میں برسوں کھانا پکا چکی تھیں ان سے سلیمان کی بے تکلفی برداشت نہ ہو سکی۔ زبیر بھائی چونکہ سلیمان کو اپنا جگری دوست کہہ چکے تھے اس لیے چندے توقف کیا اور منہ سے کچھ نہ بولے۔ ادھر سلیمان ڈرائنگ روم سے رینگتا۔ بیڈ روم — بیڈ روم سے سرکتا لڑکیوں کے کمرے میں اور وہاں سے جست بھرتا نہ جانے کیسے باورچی خانے کا ساتھی بن گیا۔

یہ بے تکلفی امیّ کو بُری لگی لیکن زبیر بھائی کے دوست کے خلاف کچھ کہنا اَب ان کے نزدیک بے سود تھا۔ اس شخص کو دیکھ کر وہ عموماً کتراتی یا تو غسلخانے یا ہمسائے میں کسی کے گھر چلی جاتیں۔ امیّ چونکہ گھر پر نہ ہوتیں اس لیے سلیمان صاحب کو راحیل کی تصویریں بنانے کا خوب موقعہ ملتا۔ ان دِنوں میں راحیل پوری پوری فلم ایکٹریس کی طرح سجیلی، بھڑکیلی اور طرحدار ہو گئی۔ ستار پکڑ کر تصویریں کھنچوائیں۔ لہنگے میں تصویر کھینچی۔ موٹر چلاتے۔ موٹر سے اترتے موٹر سے بازو نکالے، ہڈ کھولتے۔ وہیل پر ہاتھ رکھے دروازہ کھولے بند کرتے غرضیکہ سو طور سے تو ہری فوکس ویگن کے ساتھ ہی تصویریں بنائی گئیں۔ ٹیڈی لباس، ساڑھی، چوڑی دار پاجامہ —

www.iqbalkalmati.blogspot.com

زیوروں کے ساتھ، دُلہن کی طرح آراستہ ہاتھ کان سے بجّی بال پھیلائے بیراگن بنے اچھلتی ناچتی مچلتی، روتی بسورتی آہیں بھرتی جتنے بھی راحیل کے پرت تھے سب اتار اتار کر سلیمان صاحب نے کاغذوں پر ثبت کر لیے۔ چھوٹی بہنوں کو رام کرنے کے لیے ان کی بھی تصویریں اتریں لیکن نہ تو ان پر ایکٹا کروم برباد کیا گیا نہ قیمتی کاغذ — اتنی احتیاط ضرور رکھی کہ رشوت کے طور پر ہر رول میں ان کی بھی پیشی کر لی جاتی۔ راحیل کے پاس ان تصویروں کا اچھا خاصہ خزانہ اکٹھا ہو گیا۔

دراصل راحیل شرمیلی لڑکی تھی لیکن اس کا جی کہتا تھا کہ وہ خوبصورت بھی ہے اور بڑی طرحدار بھی پہلے دِن جب سلیمان نے اپنا رولی فلکس کیمرہ اس کی جانب کیا تو اس کے کان کی لوئیں سب گلابی ہو گئیں وہ برآمدے کے ستون کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑی تھی۔

"بس بس بس یہیں کھڑی ہو جایئے ایک منٹ کے لیے"

راحیل نے بھاگ جانا چاہا — لیکن کچھ ایسی چیز سلیمان کی نظروں میں تھی کہ وہ ستون کے ساتھ چپک کر رہ گئی۔

ذرا اوپر دیکھیے بالکل ——— بڑا فوٹو جنیک چہرہ ہے آپ کا —"

ابھی وہ اُوپر دیکھنے بھی نہ پائی تھی کہ کیمرہ سے کھٹ کی سی آواز آئی اور کفر ٹوٹ گیا۔ اس کے بعد تصویریں کھینچنے کا سلسلہ اس لیے چل نکلا کہ سلیمان کا ایک دوست کمرشل فوٹو گرافر تھا اس کے پاس اپنا ڈارک روم اور امپورٹ کیے ہوئے کاغذ کی بھرمار تھی سلیمان اس دوست سے کاغذ اور فلم ادھار لیتا اور اسی سے دھلواتا۔

لیکن تصویریں کھینچنے کا یہ سلسلہ دیر تک قائم نہ رہ سکا۔ کیونکہ جو فلم زبیر بھائی بنانے والے تھے اس کے لیے ایشیا کا بہترین فوٹو گرافر مل چکا تھا اور سلیمان صاحب سے مزید رابطہ قائم رکھنا ممکن نہ رہا تھا۔

اس شام بڑی بارش کے بعد اچانک چاند نکل آیا۔ صاف آسمان سے یوں چاند کا

نکلنا تھا کہ سلیمان صاحب کہیں سے آگئے۔ ان کے ماتھے پر تھوڑا سا زخم اور بہت زیادہ مرکیورکروم لگی ہوئی تھی۔ وہ عموماً جالی کا دروازہ کھول اندر تک چلے جایا کرتے تھے لیکن آج وہ برآمدے ہی میں رک گئے اور دو تین بار بڑی ہلکی سی گھنٹی بجائی —

امی کہیں ہمسائے میں بیمار پُرسی کو گئی ہوئی تھیں — راحیل باہر آئی — ڈھلے چاند کی چاندنی سلیمان کے ماتھے پر جگمگا رہی تھی اور آدھی انچ برابر زخم بہت کھلا ہوا لگ رہا تھا۔ اس نے لپک کر سلیمان کا سَر پکڑ لیا اور جھر جھر اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے

"یہ کیا ہو گیا؟ — یہ چوٹ کیسے آئی ہے؟ — بتایئے ناں؟ —"

سلیمان نے ستون کے ساتھ سَر کو ٹکا لیا اور بڑی ڈرامائی خاموشی قائم رکھی

"مَیں تمہیں آخری بار سلام کرنے آیا ہوں —"

"آخری بار —؟"

آنسو کی روانی اور تیز ہو گئی۔

"ہاں — تم سے ملے بغیر میں اس گھر سے جُدا نہیں ہو سکتا —"

"یہ چوٹ کیسے آئی ہے؟ —" راحیل نے پھر پوچھا۔ ابھی تک اس کا ذہن اس آخری الوداع کی جانب نہیں آیا تھا اور وہ زخم کے متعلق سوچے جا رہی تھی۔

"بس لگ گئی چوٹ! چوٹیں اچانک لگ جایا کرتی ہیں" سلیمان نے مسکرا کر جواب دیا۔

"بتایئے ناں؟ —"

"مَیں تمہیں بتا نہیں سکتا اس لیے تم نہ پوچھو —"

اَب راحیل نے منہ پھیر لیا اور سسک کر بولی —" ہمیں غیر سمجھتے ہیں ورنہ ضرور بتاتے چھوٹے چھوٹے ملسوں کی لمبی سی ڈائری راحیل کے دِل میں تیار ہو چکی تھی لیکن جس طرح سلیمان نے اسے پشت کی جانب سے پکڑ کر اپنے لب اس کی گردن پر رکھے۔ یہ ایک نیا دفتر تھا۔ راحیل کے قریب ہی کہیں دمدمہ چلا اور ہزار پونڈ کے بم گرنے کی آواز آئی۔ اس دھماکے میں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اس نے اپنے ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دیئے اور سلیمان کے سینے سے لگ گئی۔

سلیمان کی آنکھوں میں چاندنی کی چمک آنسوؤں کی طرح بھیگی بھیگی نظر آ رہی تھی اور وہ آہستہ آہستہ کہہ رہا تھا۔

"زبیر آج مجھ سے خفا ہو گیا۔ میں نے اسے منانا چاہا۔ یہ اس کی آخری نشانی ہے میرے ماتھے پر۔۔۔ میں تم سے آخری بار ملنے آیا ہوں۔ میں زبیر کو جان سے مار سکتا تھا جب اس نے مجھ پر گلاس پھینکا میں۔۔۔ میں نے بہت باکسنگ کی ہے زندگی میں میں اسے ایک مکے سے مار سکتا تھا۔۔۔ لیکن راحیل زبیر کی آنکھیں تمہاری آنکھیں ہیں۔ اور ان آنکھوں پر میرا ہاتھ نہیں اٹھ سکتا۔"

راحیل کے آنسو اب سلیمان کے کالر اور کندھے پر گر رہے تھے اور وہ محبت میں پھڑ پھڑ کرتی بلی کی طرح کانپ رہی تھی۔

"یہ میرا آخری سلام ہے۔۔۔" زبیر نے راحیل کی مانگ پر لب رکھ کر کہا۔۔۔ راحیل لوہے کی مانند مقناطیس کی طرف اٹھتی چلی گئی۔

"سمن آباد میں میرا چھوٹا سا گھر ہے۔ میں اب گلبرگ کی جانب کبھی نہیں آؤں گا۔ بڑے لوگ بڑے گہرے زخم عطا کرتے ہیں۔۔۔ بڑے گہرے۔۔۔"

جس وقت سلیمان کوٹھی کے پھاٹک سے نکلا آسمان پر ایک بار پھر بادل چھا گئے اور چاندنی یکدم مٹیالی روشنی میں بدل گئی۔

راحیل نے اسی رات اپنا چھوٹا سا سوٹ کیس باندھا۔ سوئی ہوئی ماں پر مہاتما بدھ کی سی نظر ڈالی۔ بہنوں کو سوتے میں بوسہ دیا اور سیدھی سڑک پر آ نکلی۔ بارش کے بعد ٹھنڈی ہوا لمبی سنسان سڑک پر آہیں بھرتی چل رہی تھی۔ شائد راحیل کچھ دیر سڑک پر پھرنے کے بعد گھر لوٹ آتی لیکن سامنے سے ایک ٹیکسی آ کر عین اس کے بائیں ہاتھ رک گئی۔ ٹیکسی والے نے میٹر گھمایا اور کار کا دروازہ کھول دیا۔

سمن آباد سے باہر جانے والی ایک نئی سڑک بن رہی تھی۔ رام نام جپتا انجن آ جا رہا تھا۔ روڑی کوٹی جا رہی تھی کولتار جل رہی تھی۔۔۔ لیکن اس کے ذہن میں گلبرگ کو جانے والی راہ پر راستہ بند ہے کا بورڈ نصب تھا۔ کھلا راستہ جس کے دونوں طرف ڈرم تھے اور ان ڈرموں میں سُرخ جھنڈیاں بہار کی بسنتی ہوا میں لہرا رہی تھیں۔

راحیل خاموش بیٹھی کھائی کی طرح گہرے اور مگرمچھ کی طرح منہ کھولے اس راستے کی تکے جا رہی تھی۔ باہر سڑک بنانے والا انجن دھک دھک روڑی کوٹ رہا تھا۔ ابھی وہ واپس آنے کے لیے بہت دور نکل گیا تھا۔ نئے سمن آباد کے اس کوارٹر نما بنگلے میں دن پوری آب و تاب سے چڑھ آیا تھا۔ راحیل جالی لگی کھڑکی کی سل میں بیٹھی تھی اس کی آنکھوں میں ساری رات کی نیند بے خواب بیٹھی تھی۔ سامنے چارپائی پر تیل کے چٹاخے لگا سرہانہ رکھے صرف تہمد باندھے سلیمان اوندھا لیٹا تھا۔

راحیل کے سامنے بار بار گلبرگ کی دھلی دھلائی سڑک سانپ بن کر لہرا جاتی۔۔۔ یہ سڑک اس کے گھر کو جاتی تھی۔ یہاں اس سے چار فٹ کے فاصلے پر ایک اجنبی چار خانے کی تہمد باندھے اوندھا لیٹا سویا ہوا تھا اس کے سرہانے کرائے کا ٹیبل فین چل رہا تھا۔ دو کوکا کولا کی خالی بوتلیں کارنس پر دھری تھیں۔ کھونٹی کے نیچے راحیل کا سوٹ کیس پڑا تھا۔ سلیمان کے تین بچے تھے۔ سلیمان کی ایک بیوی تھی۔

اور حسن اتفاق سے آج وہ سب گھر پر نہیں تھے ساتھ والے کمرے میں دودھ کی شیشی چھوٹے چھوٹے لکڑی کے کھلونے، ٹوٹی پھوٹی کاریں، ننھی منی فراکیں دوپٹے باسی لپ سٹکیں بہت کچھ تھا۔

ایک جگہ نہیں تھی تو وہ راحیل کے لیے نہیں تھی۔

راحیل جالی کی کھڑکی میں بیٹھی تھی سامنے انجن آ جا رہا تھا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اور وہ سمجھ نہ سکتی تھی کہ گلبرگ واپس کیسے جاتے؟

امی کی طرح پسپا ہو کر۔

زبیر بھائی کی طرح دھونس کے ساتھ

کہ اپنے نصیب کی طرح برگشتہ، ٹھوکریں کھاتی ہوئی گرتی پڑتی۔

حجاب

عامر کو زندگی بھر محبت کا تجربہ نہ ہوا تھا۔

ویسے تو اس کی عمر بھی کچھ اتنی زیادہ نہ تھی۔ ابھی دو ہی سال ہوئے اس نے ایم اے میتھیمیٹکس کیا تھا۔ لیکن کالج میں جہاں مخلوط تعلیم مانع تھی اور جنس مخالف سے ملنے کے کئی مواقع نکلتے تھے۔ وہاں رہ کر بھی عامر کو محبت نہ ہوئی اور اس کے ساتھیوں نے کئی کئی معرکے مارے۔ اُس کی ہم جماعتیں دوست بنی رہتیں۔ ان سے مقابلہ بھی ٹھنا رہتا۔ لیکن وہ لڑکیوں کو آسمانی مخلوق نہ سمجھ سکا۔ گھر میں کزنوں کی پوری ایک جونیئر سینئر بٹالین تھی۔ جو ہر رنگ سائز اور شیپ میں ملتی تھی۔ شادی بیاہ کے دنوں میں اس کزن جاتی کے حوصلے بھی بہت بلند ہو جاتے تھے اور وہ لڑکوں کو ٹھٹھہ کرنے ان کی اوئے اوئے کرنے میں من حیث القوم مزہ لیتی تھیں۔ لیکن عامر شادی کی تقریب میں سگریٹ سلگا کر ٹینٹ شامیانے والوں کے پاس جا بیٹھتا۔

پھر وہ دولہے کی کار سجانے کے لئے جاتا۔ دیگ پکانے والے نائیوں کی طرف رہتا۔ حالانکہ اس کے دوسرے بھائی اور جملہ کزن یا لڑکیوں کو چوڑیاں چڑھانے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

لئے پھرتے یا لڑکیوں کے ساتھ درزی حضرات کی دوکانوں پر پھیرے ڈالتے یا جہاں کہیں ڈھولکی بج رہی ہوتی وہیں منڈلاتے رہتے ـــــ عامر نے ہمیشہ ایسے ہتھکنڈوں کو چھچھورے پن سے تعبیر کیا اور صدر منڈلی سے علیحدہ وقت گزارنے میں عافیت جانی۔

ایسے ہی کالج میں اس کا حال تھا۔ لڑکا لوگ لڑکیوں کو نوٹس دینے، ان کے لئے ASSIGNMENTS لکھنے ان کو بوٹنگ کرانے، کیفے ٹیریا میں کوک وغیرہ پلانے میں لگے رہتے تھے۔ لیکن وہ سب سے الگ تھلگ رہتا اور کچھ اس انداز سے کہ سب ہی سے بھی معلوم ہو بالکل جیسے آسمان پر چاند ہم سے پرے بھی ہوتا ہے اور رات کی حدود میں ملا بھی رہتا ہے۔ لڑکیاں اس کے پاس آنے کی کوشش کرتی رہتی تھیں۔ لیکن اس کے اندر کا میٹر ہمیشہ بروقت اطلاع دے دیا کرتا۔

لیکن یہ اس کی چھوٹی بہن زرین کی شادی کا واقعہ ہے کہ میٹر نے غلطی کی۔

اُسے پروفیسری کرتے پورا سال ہو چکا تھا اور اب وہ اپنے آپ کو بڑا معزز گزیٹڈ آفیسر شمار کرتا تھا۔ لوگوں کی درخواستیں ATTEST کر کے خاص کر اُسے بہت راحت حاصل ہوتی تھی۔ نوجوان خوبصورت پروفیسر کا ویسے بھی کالج میں بہت ٹھکا ہوتا ہے۔ کالج میں اس کی ہیرو ورشپ ہوتی۔ فسٹ ایئر، سیکنڈ ایئر کے لڑکے اس کی طرح بال بنانے لگے تھے اور اسے اندر ہی اندر اپنی اہمیت کا احساس بھی ہونے لگا تھا۔ کلاسوں میں لیکچر دینے کے باعث اس کی زبان کھل گئی تھی اور وہ مباحثے اور مناظرے کر کے لطف حاصل کرنے لگا تھا۔ یہ پہلی مرتبہ تھی۔ جب اس نے اپنے آپ کو جنس مخالف کے لئے بے ضرر سمجھا اور زرین کی شادی میں عورتوں کے ڈینجر زون میں چلا گیا۔ عامر کو معلوم نہیں تھا کہ بجلی کی ایک مخصوص فیلڈ ہوتی ہے۔ مقناطیس بھی ایک مخصوص علاقے میں اثر کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اسی طرح استری ذات کی بھی ایک مقناطیسی فیلڈ ہوتی ہے

اور جو بھی اس میں داخل ہو جاتا ہے، متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

یہ مہندی کی رات کا ذکر ہے۔

نچلی منزل میں بڑی دھما چوکڑی مچی ہوئی تھی۔ گو فنکشن بظاہر عورتوں کا تھا۔ لیکن خاندان کے مرد اور لڑکے سب اسی منزل ہی میں تھے۔ لان میں بتیاں شامیانے لگے تھے۔ گرم اُونی چادریں، شگون کے سفید دوپٹے اوڑھے خاندان کی معمر عورتیں موجودہ دور کی بے حیائی اسراف، مذہب سے بے توجہی اور بچوں کی غلط تربیت پر بلا تکان بول رہی تھیں۔ غسل خانوں کے آگے سب سے زیادہ رونق تھی۔ جو غسل خانوں کے اندر تھیں۔ وہ خوش نصیب تھیں۔ جو باہر تھیں وہ دروازے کھٹکھٹا رہی تھیں، آوازیں دے رہی تھیں۔ کپڑے استری ہو رہے تھے، زیورات کی جانچ پڑتال چل رہی تھی۔ حسد پھیلا ہوا تھا۔ غیبت ہو رہی تھی۔

بدقسمتی سے اس وقت عامر اُوپر والی فلور سے آیا۔

ڈرائینگ روم میں قالین پر چادر بچھائے آصفہ گھیردار غرارہ استری کر رہی تھی۔ اس کی پشت پر اس کا دو سالہ بچہ اس کے گلے میں بانہیں ڈالے لٹک رہا تھا اور آصفہ تابڑ توڑ ایسے نومی کو جو اس کی کوئی بات نہ سمجھتا تھا، جھڑک رہی تھی۔

"اُتر جا نومی کے بچے میں تجھے استری کر دوں گی۔ غرارے کے ساتھ.... پتہ نہیں تیرا باپ کہاں گیا ہے۔ کبھی کسی شادی بیاہ میں ہی پکڑ لیا کرے اس لاڈلے کو .... مت کھینچ میرے بال نومی اُلّو کے پٹھے۔"

اسی وقت عامر نے ڈرائینگ روم کا دروازہ کھول کر باہر کھسک جانا چاہا۔

لیکن آصفہ کی نظر پڑ گئی۔ "خدا کے لئے عامر اس گدھے سے میری جان چھڑاؤ.... ساری تیار ہو گئی ہیں۔ مجال ہے یہ نومی حرامی مجھے تیار ہونے دے۔"

عامر کو بچے کھلانے کی عادت نہ تھی۔ وہ عام نوجوانوں کی طرح چھوٹے بچوں کا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

عاشق نہ تھا۔ جس وقت اُس نے آصفہ کے گلے سے لٹکی ہوئی نومی کی بانہیں علیحدہ کرکے اُسے اُٹھایا تو اناڑی پن کی وجہ سے بچّے کی نازک بانہوں پر ذرا دباؤ پڑ گیا۔ اب نومی اُس کی گود میں تو تھا۔ لیکن بازو اور ٹانگیں اکڑائے، پیٹ کو باہر کی طرف نکالے وہ زار و زار رو رہا تھا۔

"اسے میں کیا کروں؟ ——"

"مجھے کیا پتہ —— کم از کم میرے پاس سے لے جاؤ۔"

"لیکن کہاں؟"

"کہیں مجھے کیا پتہ ——" آصفہ جلدی جلدی کپڑے استری کرنے لگی اور اس کی کمر اور کولہے اسی مطابقت سے ہلنے لگے۔

نومی بانہوں میں پھسلا جا رہا تھا۔ اکڑا جا رہا تھا۔ یوں بلبلا رہا تھا۔ جیسے بھڑوں نے کاٹ کھایا ہو۔

"بابا اسے سنبھالو —— مجھے کیوں دے دیا ہے۔ یہ ڈینس دی مینس؟"

"اس کے باپ کو جا کر پکڑاؤ۔ یہ سارا اسی پر گیا ہے۔" آصفہ نے ہاتھ کے اشارہ سے کہا۔

"یہ میرے ساتھ جائے بھی!"

"اسی طرح لے جاؤ جیسے پولیس طالب علموں کو لے جایا کرتی ہے —— اس کے باپ کو بھی پتہ چلے بچہ کیا ہوتا ہے۔ حکومت کی طرح۔"

عامر بچے کو لے کر باہر شامیانے میں گیا، تو وہاں چند ایسی عورتیں بیٹھی تھیں جو عام طور پر شادیوں میں وقت سے پہلے پہنچ جایا کرتی ہیں اور جب فنکشن پورے جوبن پر ہوتا ہے تو جانے پر مجبور ہوتی تھیں۔ ان عورتوں کو دیکھ کر عامر شرما گیا۔ نومی بھی کچھ ڈھیلا پڑ گیا تھا اور اب اس کی ٹانگیں مڑنے لگی تھیں۔ جس وقت عامر اندر باہر ہر طرف آصفہ کے شوہر کو تلاش کر چکا تو اُس نے فیصلہ کیا کہ بچہ آصفہ کو لوٹا دینا چاہیے۔ اب وہ آصفہ کو تلاش کرنے لگا تو ہر غسلخانہ کمرہ عورتوں لڑکیوں سے بھرا پڑا تھا۔ لیکن آصفہ کہیں نہیں تھی۔ سب سے مشکل یہ آن پڑی تھی کہ اب تک اتنی سیر کی وجہ سے نومی اس سے ہل گیا۔ اس نے بڑی کوشش کی کہ نومی کسی اور لڑکی یا عورت کے پاس چلا جائے۔ لیکن جناب نومی صاحب ہر بار اس کے گلے میں بانہیں ڈال کر اس کی شیو بڑھی ٹھوڑی کے ساتھ سر لگا لیتے اور کسی اور کی گود میں جانے سے انکار کر دیتے۔

نومی کے ابّو اتّی جب نہ ملے تو عامر نومی کو اُوپر اپنے کمرے میں لے گیا۔ اکھاڑے میں بچے کے ساتھ اُس کا یہ پہلا دنگل تھا۔ اس سے پہلے وہ دو سال اپنے کالج کا باکسر رہا تھا۔ لیکن یہ ایک نئی ہی گیم تھی۔ اُسے معلوم نہ تھا کہ بچہ اتنی جلدی اکتا جاتا ہے اور اتنی آسانی کے ساتھ رو کر احتجاج کر سکتا ہے۔ جس وقت نومی ہفت کر سو گیا تو عامر کے کپڑے پیر تک بھیگ چکے تھے۔ کمرے میں ہر طرف کاغذ کے ہوائی جہاز پھیلے ہوئے تھے اور بچھونے سے روئی نکل رہی تھی۔ نومی اس کے بستر میں دو جگہ موت چکا تھا۔ اُس کے باوجود وہ آرام سے سو رہا تھا اور عامر پلنگ سے باہر کرسی پر آگے ٹانگیں پھیلائے منتظر تھا کہ کب بستر خالی ہو اور وہ سوئے۔

بڑی رات گئے بچہ تلاش کرتی آصفہ آئی۔ آصفہ عمر میں اُس سے چار سال چھوٹی تھی۔ لیکن اس وقت وہ بغیر دوپٹے کے بال بکھرائے اُسے پوری بے بے لگ رہی تھی۔

"توبہ تلاش کر کر کے مر گئی۔ تم نے میرا بچہ ہی اغوا کر لیا ——"

"تمہیں کچھ پروا ہے اس بچّے کی ——"

"ہائے میری لالی میرا چھونا پارا —— انکل کتنا ظالم ہے نہ دودھ پلایا نہ کچھ کھلایا۔ سُلا دیا پکڑ کے میرے نومی کو۔"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اب عامر کو باقاعدہ غصہ چڑھ گیا۔
"اور نومی کی ماں کو بڑا پیار ہے نومی سے —— یہ تم ماڈرن مائیں ہو ناں —— تم لوگوں کی اپنی انجوائے منٹ ختم نہیں ہوتی۔ تم کو کیا پتہ مدر ہڈ کیا ہوتی ہے۔"
"اور تم نے اتفاق سے ایک شام نومی کو رکھ لیا تو تم کو پتہ چل گیا مدر ہڈ کیا ہوتی ہے۔"
"کم از کم میں تم جیسا خود غرض اور سیلف سنٹرڈ نہیں ہوں بالکل بھی۔"
اب وہ دونوں ماں باپ یوں بحث کرنے لگے جیسے برسوں کا بیاہا جوڑا ہو۔ بڑی بک بک جھک جھک ہوئی۔ اتنی تو تو میں میں کہ نومی جاگ کر رونے لگا۔ اس بحث میں انہیں پتہ چلا کہ وہ نہ صرف قریبی کزن ہیں، بلکہ بچپن سے ایک دوسرے کے تمام کمزور پوائنٹ بھی جانتے ہیں۔

لڑتے لڑتے ایک مرتبہ آصفہ نے یہاں تک کہہ دیا۔ "پھوپھی جی نے تو سو مرتبہ ہنٹ کیا کہ میں تم سے شادی کر لوں۔ لیکن مجھے معلوم تھا کہ تم پورے FREAK ہو۔ تم سے شادی کون کرے ——؟"

عامر نے زور سے قہقہہ لگا کر کہا۔ "شادی —— تم سے؟ کبھی اپنے آپ کو شیشے میں دیکھا ہے۔ دیکھا ہے۔ دیگ ہو پوری دیگ۔ یہ جو تمہارے دماغ میں وہم ہیں۔ ان کو نکال دو دل سے۔ دیگ سے کوئی محبت نہیں کرتا۔"

یک دم آصفہ ڈھیلی پڑ گئی اور نومی کو چپ کراتی ہوئی بولی —— "ہاں عامر یہ تو میرا بڑا ویک پوائنٹ ہے سچ میں موٹی تو بہت ہو گئی ہوں۔ شادی کے بعد۔ اس گدھے نومی کو فیڈ بھی کرتی ہوں پھر بھی وزن کم نہیں ہوتا —— بتاؤ کیا کروں ——"

اب عامر ون اپ ہو کر ٹھنڈا پڑ گیا۔ اسی لئے اس نے جواب نہ دیا۔
یکدم آصفہ کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

"سچ عامر کیا کروں وزن کم ہی نہیں ہوتا۔ بہت ڈائیٹنگ کرتی ہوں۔ تنویر بھی مجھے پسند نہیں کرتے۔ انہیں دبلی پتلی لڑکیاں پسند ہیں۔ اب اس میں میرا کیا قصور ہے —— خدا نے موٹا کرنا تھا کر دیا ——"

اس سے پہلے کوئی نوجوان عورت یا لڑکی اس کے سامنے نہیں روئی تھی۔ عامر کو سمجھ نہ آئی کہ وہ آصفہ کو کیسے چپ کرائے۔ پتہ نہیں کیوں پہلی بار وہ مجرم محسوس کرنے لگا۔ آصفہ اور نومی دونوں روتے ہوئے اس کے کمرے سے کیا رخصت ہوئے کہ عامر کی زندگی میں پہلا بھونچال آیا۔ وہ ساری رات بار بار جاگتا اور سوچتا وہ بھی کیا مرد ہے ایک لڑکی کو رلا دیا —— چاہے یہ لڑکی اب عورت ہی تھی لیکن تھی تو اس کی عمر سے چھوٹی —— چلو چھوٹی نہ بھی ہوتی، تو بھی کسی کو رلانا کہاں کی شرافت ہے؟

دوسرے دن جب اس کی آنکھ کھلی تو گیارہ بج رہے تھے گھر میں ہنگامہ تو تو بہت تھا۔ لیکن آصفہ اور نومی کہیں نہ تھے۔ انہیں تنویر رات گھر لے گیا تھا۔ عامر میں اگر صبر ہوتا تو وہ شام تک انتظار کرتا اور جب آصفہ شادی پر آتی تو اس سے بات کرتا۔ لیکن ساری مشکل اس صبر کی ہی تو ہے۔

یا یوں سمجھے کہ ساری اڑچن اس بات سے پیدا ہوتی ہے کہ ہمارا اور خدا کا وقت ایک نہیں ہوتا۔ انسان کی ساری مشقت محض اسی وجہ سے پیدا ہوتی ہے کہ ہم صدیوں قرنوں، بلیک ہول، انٹی میٹر کا تصور بھی نہیں کر سکتے اور چونکہ خدا ازل سے ہے اور ابد تک رہے گا، وہ ناپائیداری کو سمجھ تو سکتا ہے۔ لیکن یہ ناپائیداری اس کا حال نہیں۔ خدا انسان سے کہتا ہے کہ تو زمین پر اپنے وقت کے مطابق کچھ عرصہ ستر سال ساٹھ سال .... تیس سال ایک عمر طبعی کے وقفہ برابر فساد برپا نہ کر۔ نچلا ہو کر بیٹھ رہ پھر میں تجھے اپنے وقت کی سمجھ بوجھ دے کر ایک ایسے باغ میں داخل کر دوں گا۔ جس کے نیچے دودھ اور شہد کی نہریں بہتی ہیں۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

یہ ایسے ہی ہے جیسے کسی نٹ کھٹ چونچال غلیل مار بچے کو کمرے میں بند کر کے کہا جائے کہ اس صوفے پر آدھ گھنٹہ چپ چاپ بیٹھ کر دکھا، پھر تجھے سارا سیزن کے لئے مری لے جائیں گے۔ جہاں ہر دکان پر چاکلیٹ مفت ملتی ہے۔

اگر عامر کے پاس نچلا بیٹھنے کی خداداد گفٹ ہوتی تو اور بات تھی اس نے تو کھٹا کھٹ ڈائریکٹری سے فوڈ ڈیپارٹمنٹ میں تنویر کا نمبر دیکھا اور فون کر دیا۔ کچھ پرانے لوگ فون، کار اور وی سی آر کو نوجوانوں کے حق میں سم قاتل سمجھتے ہیں۔ باقی نوجوان نسل کے بارے میں تو اس درجہ وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن عامر کا بیڑا اسی فون نے کیا۔

پہلے آصفہ کی ساس نے فون اُٹھایا اور لمبی چوڑی انکوائری کی۔

"کون ہے؟"

عامر کو سمجھ نہ آئی کہ کیا کہے۔

"میں جی زرّیں کا بھائی ہوں! ــــ کزن"

"کمال ہے ــــ کونسے بھائی!"

"جی عامر ــــ آپ ذرا آصفہ کو بلا دیں زرّیں کا پیغام دینا ہے ــــ بہت ضروری"

"تم مجھے پیغام دے دو۔ وہ نومی کے پاس کھڑی ہے"

"آپ ذرا پلیز انہیں بلا دیں!"

"بلا کیا دیں! نومی پوٹی کر رہا ہے ــــ وہ کیسے آ سکتی ہے۔ خواہ مخواہ ــــ!"

ساس نے دھڑام سے فون بند کر دیا۔

کچھ دیر عامر چپ چاپ فون کے پاس بیٹھا رہا۔ وہ دل میں اندازہ لگا رہا تھا کہ کتنی دیر میں ایک بچہ پوٹی کر سکتا ہے اور ایک ساس کمرے سے نکل کر جا سکتی ہے۔

دوبارہ فون کی گھنٹی بجی تو آصفہ نے فون اٹھایا۔

"ہیلو ــــ!" ٹیلی ویژن کی اناؤنسروں جیسی آواز میں آصفہ نے کہا۔

"ہیلو ــــ میں عامر ہوں ــــ عامر؟"

"کون عامر ــــ!"

"یہ استفسار عجب ہتک آمیز تھا۔ لیکن عامر نے تفصیل پیش کی ــــ "زرّیں کا بھائی ــــ جس کے پاس کل آپ نومی چھوڑ کر گئی تھیں ۔ آپ کا کزن بھی ٹو ایس ریمورڈ ــــ"

"اچھا اچھا عامر ــــ سناؤ کیا حال ہے۔ پتہ ہے۔ رات کو نومی کو موشن لگ گئے ــــ میں تو اُسے لے کر صبح صبح ڈاکٹر کے پاس گئی ــــ رات کو اُس نے کچھ کھایا جو نہیں تھا" کچھ نہ کھانے پر موشن لگ جاتے ہیں ؟ اس کی منطق عامر کو سمجھ نہ آئی۔

ادھر آصفہ نے نومی کے دستوں کی داستان شروع کر دی۔ جو کچھ اس نے ڈاکٹر کو بتایا تھا وہ سارا حال عامر کو بتایا اور جب عامر نے یہ سب کچھ سننے سے انکار کیا تو وہ اُسے تفصیل سے وہ سب کچھ بتانے لگی۔ جو ڈاکٹر نے بتایا تھا ــــ فون پر آصفہ سے گفتگو کرنا مشکل تھا۔ یہ تو عامر کو بہت بعد میں سمجھ آئی۔

لیکن اس کے باوجود عامر اور آصفہ فون فرینڈز بن گئے۔

آصفہ کو ایک ایسے دوست کی ضرورت تھی، جو اس کی باتیں سننے کو تیار ہو اس عہد میں فون نے عورتوں اور لڑکیوں کے لئے ایک بہت بڑی سہولت پیدا کر دی ہے۔ فون بھی الہ دین کا چراغ ہے ذرا سا نمبر ملایا اور جن حاضر ــــ اگر مرد دوست اتنی مرتبہ ملنے آ جائے تو بڑی قباحتیں پیدا ہوں۔ ملتے ملتے دوست حضرت ہاتھ پکڑنا چاہیں۔ بوسہ بازی کرنے پر آمادہ ہوں۔ ڈھول دھپہ اور جانے کیا کیا کچھ شاخسانے کے طور پر بیچ سے آ لگے، جگ ہنسائی کا خدشہ الگ۔ فون میں صاف ستھرا تبادلہ

www.iqbalkalmati.blogspot.com

خیال، کچھ تعریفی جملے، ہلکے ہلکے قہقہے ـــــ پھر فون کرنے کا وعدہ ـــــ اور چھٹی ۔ نہ معاشرے کو اعتراض نہ اپنے ضمیر کو ـــــ نہ ہی مرد دوست کی پہل قدمیوں پر جھگڑے کی گنجائش۔

آصفہ کو بھی قباحتیں نہیں چاہیے تھیں ـــــ وہ بھی فقط تبادلۂ خیال کی راحت چاہتی تھی۔ گھر میں اس کی بات سننے والا کوئی نہ تھا۔ اس کی ساس اچھرے میں ہیڈ مسٹرس تھیں اور شوہر فوڈ کے محکمے میں ملازم ـــــ دونوں جب اپنے اپنے کام سے لوٹتے تو انہیں نہ نومی کی باتیں سننے کا شوق ہوتا نہ آصفہ کی بک بک۔ دونوں اپنے اپنے کپڑے بدل کر کسری کی طرح پلنگوں میں لیٹ جاتے۔ پہلے آصفہ ان کے اس رویئے پر کھجتی تھی۔ لیکن اب وہ گیارہ بجے نومی کو سلا کر عامر کو فون کرنے بیٹھتی تو کھانا بھی فون کے پاس ہی منگوا لیتی اور ایسے ہی شام کے تین بج جاتے۔

عامر کو صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں قسم کی سچوئیشن بہت زیادہ متاثر کرتی تھی۔ وہ حجاب درمیان میں حائل رکھ کر رابطے بنانا چاہتا تھا۔ مکمل ننگا پن نہ ہو بلکہ "سی تھرو" ہو تو لطف ملتا ہے۔ اس کے اور آصفہ کے درمیان تو ساس تھی ـــــ تنویر تھا ـــــ ٹیلیفون کی لمبی لمبی تاریں تھیں۔ وہ ان حالات سے اس درجہ مطمئن تھا کہ اسے خبر بھی نہ ہوئی کہ وہ آصفہ کے بہت قریب ہو گیا ہے۔

آصفہ کو فقط ایک ایسا مردانہ کان درکار تھا جو اس کی آپ بیتی سرگزشت، دن بھر کی رام کہانی اور آئندہ کے پلان سن سکے۔ وہ نمبر ملاتے ہی شروع ہو جاتی۔

"صبح میری ساس نے وائلٹ ساڑھی کے ساتھ نارنجی رنگ کا بلاؤز پہنا۔ ہائے عامر تم دیکھ لیتے تو ہنستے۔ اوپر سے پھولدار چھتری لگا کر میم صاحب اپنے سکول گئیں ـــــ میں کیا کھا رہی ہوں ـــــ؟ گجک ـــــ کل تنویر گجک اور بادام لائے تھے ـــــ ـــــ بادام تو کار میں ہی ختم ہو گئے سارے ـــــ نومی کو تو آپا لے گئی ہے ساتھ والوں

کے گھر ـــــ وہاں سب اُسے بہت پیار کرتے ہیں۔ میں نے دودھ کی بوتل بھی ساتھ ہی دے دی ہے۔ ہائے کہیں بے چارہ روئے ناں ـــــ دوپہر کو؟ دوپہر کو میں نے پکوائے ہیں سری پائے ـــــ تمہیں نہیں پسند؟ ـــــ ہمارا خانساماں بہت اچھے پکاتا ہے ـــــ زرّیں کا کوئی خط آیا کراچی سے؟ اچھا رات کو تم نے ففٹی ففٹی دیکھا ـــــ نہیں دیکھا ہائے بڑے بور ہو ـــــ گانا سنو گے ـــــ؟ کل غلام علی کا لانگ پلے لائے تھے تنویر ـــــ لو سنو۔

اور وہ فون پر عامر کو گیت سنانے بیٹھ جاتی!

پتہ نہیں کب فون بازی سے بات بڑھی؟ کب ملاقوں سے بات آگے نکلی؟ کیونکہ آصفہ کو تو خدا نے سنجیدہ ہونے کے لئے بنایا ہی نہ تھا۔ وہ اگر دھاڑیں مار کر رو رہی ہوتی تو ایک کوکا کولا اور ایک آئس کون اُسے چپ کرانے کے لئے کافی تھی۔ چائنیز کھانا کھانے کے بعد وہ بڑی سے بڑی لڑائی بھول جاتی۔ شاپنگ میں آٹھ گھنٹے گزارتے ہی اس کا بخار اُتر جاتا ـــــ سر درد سے چھٹکارا مل جاتا۔ پکنک کا نام سن کر وہ ادھ موئی بھی اُٹھ بیٹھتی اور فلم اور وی سی آر کا سُن کر تو اس کے اندر خوشی کے لڈو پھوٹنے لگتے۔

آصفہ دراصل میلہ گھومنی تھی ـــــ اُسے ذمہ داریاں، گھریلو زندگی، شوہر کی اطاعت، بچے کی نگہداشت، سلیقے کی زندگی سے بڑی نفرت تھی۔ اسے پان کھانے بے ضرر غیبت کرنے اور بے مصرف گھومنے پھرنے سے عشق تھا، اگر وہ کبھی اندازے لگانے کے اہل ہوتی تو تنویر سے گر کر عامر میں نہ پھنستی، لیکن فون پر بڑھائے ہوئے رابطے میں ایک قصور تھا کہ وہ اصلی عامر کو نہ جانتی تھی اور اس کی وجہ بھی صرف اتنی تھی کہ اس نے کبھی فون پر عامر کو باتیں کرنے ہی نہ دی تھیں۔

جب بھانڈا پھوٹا تو خوب لڑائیاں ہوئیں۔

ہر لڑائی کے بعد عامر آصفہ کو لے کر کون کھلانے لے جاتا۔ اگر تنویر سے ذرا زیادتی ہو جاتی تو پھر فلم بھی دکھانی پڑتی۔ یہ عہد عامر کے لئے بڑا پُرلطف رہا۔ آصفہ اس کے کندھے پر سر رکھ کر روتی رہتی اور عامر اور اس کے درمیان تنویر کا ہلکا سا پردہ قائم رہتا۔

لیکن آصفہ جیسی لڑکیاں یا نوعمر عورتیں بڑی معصومیت سے اپنی ہی جنت تباہ کرنے کی عادی ہوتی ہیں۔ اگر یہ سچوئیشن جاری رہتی تو آصفہ کو دو آدمی مناتے رہتے۔ اُدھر تنویر اِدھر عامر اور اس کا زیادہ وقت کون کھانے۔ کوکا کولا پینے اور فلمیں دیکھنے میں لگتا ــــ لیکن اُس نے سارے معاملے میں سے نتیجہ نکالنا چاہا اور نتیجہ نکالنا آصفہ جیسی عورتوں کے بس بات نہیں۔

اسی لئے وہ تنویر سے طلاق لے کر عامر کے گھر آ گئی۔

اب آصفہ کوئی مسئلہ نہ تھی۔ عامر اور اس کے درمیان کوئی حجاب نہیں تھا۔ اس لئے عامر اپنی کتابوں کی طرف لوٹ گیا اور اس کا زیادہ وقت لیکچر تیار کرنے لڑکوں کی ASSIGNMENT چیک کرنے اور امتحانی پرچوں پر نمبر جوڑنے میں لگتا ــــ آصفہ اُس کے پاس بیٹھ کر کچھ دیر اپنی ملائی کی برف جاتی رہتی۔ باتوں کا چکر پر چکر ــــ گیڑے پر گیڑا عامر چُپ چاپ نومی کے سر پر ہاتھ پھیرتا رہتا۔

"تم میری بات نہیں سن رہے ــــ"

"میں؟"

"ہاں تم اور کون نومی ــــ؟" وہ غصّے سے کہتی۔

میں سن رہا ہوں تم ابھی کہہ رہی تھیں کہ تنویر مجھ سے بہتر تھا ــــ"

"یہی تو بات ہے تم سن نہیں رہے۔ میں کہہ رہی تھی کہ تنویر تم سے ہزار درجے گھٹیا تھا۔ لیکن اتنی بات اس میں ضرور تھی کہ اُسے مجھ سے پیار تھا ــــ"

"ہاں ــــ وہ تو ہے ــــ"

"تمہیں مجھ سے پیار نہیں ــــ"

وہ چُپ رہتا۔

عورت کے اس زندگی رونے کی اُسے آج تک سمجھ نہ آئی۔ پتہ نہیں وہ کونسا ماؤنٹ ایورسٹ روز سر کر کے دکھانا ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے عورت کو مرد کی محبت پر اعتبار آ جاتا ہے۔

"مجھ سے زیادہ تو تمہیں نومی سے پیار ہے؟"

اس موٹی کھال کے ہاتھی میں آصفہ بہت آنکس مارتی۔ لیکن بلبلانا تو ایک طرف وہ کان کے پنکھے بھی نہ ہلاتا۔

ایسے ہی سات سال گزر گئے اور وہ تین بچوں کی ماں بن گئی۔ اب آصفہ منڈی پڑ چکی تھی۔ وہ شعلے بھڑکانے اور عامر کو ان شعلوں میں بھوننے کی عادی نہ رہی تھی اور جب عامر اسسٹنٹ پروفیسر ہو کر اسلام آباد پوسٹ ہوا تو آصفہ نے اُس کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا اور لاہور میں اپنی ساس کے پاس ہی رُک گئی۔

عامر بھی خوش تھا کہ اسلام آباد میں کرائے بہت تھے۔

اسلام آباد یونیورسٹی میں پانچ سال پڑھانے کے بعد آصفہ کو ایک خبر ملی۔ پہلے تو آصفہ کو اس خبر پر یقین نہ آیا۔ پھر وہ تحقیق میں لگ گئی اور جب اسے پختہ یقین ہو گیا، تو وہ بلبلا اُٹھی۔ یکدم مردہ آصفہ میں جان پڑ گئی۔ جب چھٹیوں میں عامر گھر آیا تو اُس نے طوفان اُٹھا لیا۔

"یہ اقبال کون ہے؟"

"اقبال کون ــــ" عامر جرابیں اُتار رہا تھا۔ لیکن یک دم اُس کے ہاتھ رُک گئے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"مجھ سے کیا چھپاتے ہیں آپ ——— اوپن یونیورسٹی میں جو پڑھاتی ہے ——— کیا میں نہیں جانتی ——— !

"جب آپ جانتی ہیں تو پھر کیوں پوچھتی ہیں ؟"

"آپ نے کب نکاح پڑھوایا اُس سے ؟"

"یہی کوئی نو مہینے ہوئے ہیں"

عامر کا خیال تھا کہ آصفہ ہمیشہ کی طرح بہت شور مچائے گی اور پھر ٹھنڈی پڑ جائے گی۔ لیکن آصفہ کی آنکھوں سے آہستہ آہستہ آنسو گرنے لگے اور وہ بے بس ہو کر قالین پر بیٹھ گئی ——— "تم نے ٹھیک کیا عامر ——— بھلا دیگ سے کون محبت کرتا ہے۔ تنویر کو بھی دُبلی پتلی لڑکیاں پسند تھیں ——— میں دوپہر کو صرف ایک پھلکا کھاتی ہوں، پھر بھی یہ جسم پھیلتا ہی جاتا ہے ——— تمہارا کوئی قصور نہیں - میں نے اقبال کو دیکھا ہے۔ کیا دُبلی پتلی ہے ——— تمہارا بھلا کیا قصور ؟"

آصفہ روتی ہوئی کمرے سے رخصت ہو گئی۔ پروفیسر اُسے چپ کرانا چاہتا تھا لیکن اسی وقت اسے سٹیشن پر جا کر اسلام آباد کے لئے ریل کار پکڑنی تھی۔

دوسری صبح جب اس نے لاہور فون کیا، تو اس کی امی کی آواز آئی ——— "کون ؟"

"میں ہوں امی ——— عامر ——— ذرا آصفہ کو بلا دیجئے"

اوپن یونیورسٹی کی مسز اقبال عامر کو پتہ نہیں کیا ہو گیا ہے۔ وہ سارے میں کہتی پھرتی ہے کہ عامر صاحب بالکل بدل گئے ہیں۔ سارا دن فون کے ساتھ لگے رہتے ہیں۔ ادھر ویک اینڈ ہوتا ہے ادھر وہ لاہور چلے جاتے ہیں - جب سے اقبال نے عامر صاحب پہ جاسوسی شروع کر دی ہے۔ عامر صاحب یکدم زیادہ تندرست اور جوان نظر آنے لگے ہیں۔

سنا ہے جب عامر صاحب لاہور آتے ہیں تو آصفہ کو پان کھلانے، فلم دکھانے

اور کوکا کولا پلانے ضرور لے جاتے ہیں۔ اقبال کا حجاب جب سے درمیان آ گیا ہے۔ عامر صاحب کی ازدواجی زندگی قابلِ رشک بن گئی ہے۔ ادھر عامر کی والدہ کہتی ہیں کہ "آصفہ تو کبھی بڑی ہوئی ہی نہیں ——— اس کی عادتیں تو بچوں کی سی ہیں ——— سارا دن فون پر بیٹھی باتیں کرتی رہتی ہے اور گجک کھاتی رہتی ہے ——— اُسے تو یہ بھی معلوم نہیں کہ بچے کس کلاس میں پڑھتے ہیں ——— !"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

گُجھی مار

کچھ کینہ پرور لوگوں کا خیال ہے کہ پروفیسر مجیب صرف بمسٹروں کی وجہ سے مقبولِ عام ہوئے کیونکہ وہ طالب علموں کو ہمیشہ زیادہ نمبر دیتے تھے۔ اس لئے سٹوڈنٹ طبقہ ان کا بہت گرویدہ تھا لیکن یہ بات درست نہیں ان کی شہرت کی یہ وجہ معقول نہیں۔ جب پوسٹ گریجویٹ کلاسوں کے سالانہ امتحان ہوا کرتے تھے۔ تب بھی پروفیسر مجیب سارے کیمپس میں اچھی ہوا رکھتے تھے۔ سٹاف روم کے پروفیسر، باغ کے مالی، لیب اسسٹنٹ اُن کی تعریف کرتے سنڈیکیٹ کی میٹنگ میں کبھی اُن سے کسی کا جھگڑا نہ ہوا۔ وائس چانسلر کی میز پر مُکا مار کر کسی نے انہیں بات کرتے نہیں دیکھا۔ کیفے ٹیریا میں کسی نے انہیں دیوار کے ساتھ پیالی مار کر توڑتے نہیں پایا۔

پروفیسر صاحب مہاتما بُدھ کا نیا ماڈل تھے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ مہاتما بدھ کپل وستو کا شہزادہ تھا اور اُس نے راج پاٹ چھوڑ کر بن باس لے لیا تھا۔ یہ پروفیسر بن باس جھیل کر یہاں شہزادہ بننے کے لئے آئے تھے..... وہی جاپانی رنگت، منگول آنکھیں، نیپالی چہرہ..... مائنس نمبری کے لنز چڑھی عینکیں قد نہ اتنا لمبا کہ کرکٹ کے کھلاڑی لگیں نہ اتنا چھوٹا کہ جوڈو کراٹے والے اپنا ساتھی سمجھ بیٹھیں عموماً سردیوں میں چیک کوٹ اور گرے فلانن کی پتلون میں ملبوس نظر آتے پرندے، طالب علم اور دفتری عملہ اُن سے بہت مانوس تھا۔

جب تک کسی شخص کی شہرت آپ کی فیلڈ کو مجروح نہیں کرتی تب تک آپ اس کی شہرت

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سے نہ جلتے ہیں نہ خار کھاتے ہیں۔ بلکہ اُس کی شہرت پر مربیانہ نظر ڈال کر محفوظ ہوتے ہیں لیکن جس وقت یہ شہرت کسی طرح آپ کی اپنی شہرت کے لئے باعثِ خطرہ بن جائے تو پھر پروفیسر مجیب جیسا آدمی ڈراکولا، مافیا کا خفیہ کارندہ، کمیونسٹ، سود خور اور پتہ نہیں کیا کیا کچھ نظر آنے لگتا ہے۔

پروفیسر صاحب بہت مقبول عام آدمی تھے لیکن ان کی شہرت بے ضرر تھی اور جہاں پر کیمپس سے باہر لاہور ادمنی بس کا اڈا ہے وہاں سے آگے نہ جاتی تھی اس پالتو شہرت سے نہ کوئی دانشور نہ کوئی اخبار نویس، نہ کوئی ادیب اور نہ ہی کوئی فلسفار خائف تھی۔

لیکن پھر پروفیسر مجیب نے ایک کتاب لکھ ڈالی ... یوں سمجھ لیجئے کہ ان کی بے ضرر مقبولیت اب ایک ننگی الیکٹرک تار تھی جس میں چار سو چالیس وولٹ کی بجلی گزر رہی تھی۔ خود موصوف کو علم نہ تھا کہ ان کی کتاب جو محض برسوں کے مشاہدے کا نچوڑ تھی۔ یکدم دوسروں کے لئے اتنا دردِ سر بن جائے گی جوں جوں کتاب کی مقبولیت میں اضافہ ہوا۔ پروفیسر صاحب کے خلاف بھی ایک ردِ عمل کی لہر دوڑنے لگی۔ اس سے پہلے کیمپس کا موسم اُن کے لئے نیر دبی کا موسم تھا سردیوں میں بھی معتدل، گرمیوں میں بھی خوشگوار ـــــ لیکن جب کتاب پر تبصرے شائع ہوئے وہ سٹالوں پر بکنے لگی۔ ٹیلی ویژن پر اس کتاب کے بارے میں اُٹھنے والے شکوک رفع کرنے کیلئے ایک تیس منٹ کا خصوصی پروگرام ہوا۔ تو پہلی بار ردِ عمل پیدا ہوا...... آج تک پروفیسر مجیب قائدِ اعظم کی تصویر کی مانند سب کی دیواروں پر ٹنگے تھے۔ اور کسی کو کچھ نہ کہتے تھے لیکن اب صورت حال بدلنے لگی کچھ بدگمان لوگوں کا خیال ہے کہ اس کی ساری وجہ ڈاکٹر توقیر تھے۔

ڈاکٹر توقیر عزم و ہمت کا سمبل تھے۔ مضبوط ٹھوڑی، فراخ ماتھا، سفید رنگت، بلنگن جیسے ہاتھ پاؤں، چلتے تو بغیر میخوں کے بوٹ بھی کچی مٹی میں گہرے نشانات چھوڑ جاتے۔ آواز میں ولولہ تھا جگا سکتے تھے اور جگائے رکھتے تھے اُن کے ابرو۔ آنکھیں زبان ہاتھ سب بات کر سکتے تھے سوڈ نٹ باڈی میں وہ مقبول تو نہ تھے لیکن ان کے رعب اور دبدبے کے آگے جوان سال لڑکے لڑکیاں

بول نہ سکتے تھے وہ سوشیو اکونومک مسائل پر تین کتابیں، پاکستان میں بنک کاری کے روشن امکانات پر کئی پمفلٹ بھگوڑ وررلڈ کے سانجھے مسائل پر تیرہ سو صفحے کی ایک جامع کتاب اور عزرِ یورپ کے کئی رپوتاژ قلم بند کر چکے تھے!... ان کے لیکچر نہ صرف مقامی کالجوں کی زینت تھے بلکہ وہ امریکہ میں بھی سفری لیکچروں کا سلسلہ بخوبی نپٹا کر آئے تھے ان کی ذات پر کئی مضمون.... اندرونی اور بیرونی رسالوں میں چھپ چکے تھے۔ اُن کی سیاسی سوجھ بوجھ سے کئی سرگرم پارٹیوں نے جنم لیا تھا۔

ڈاکٹر توقیر اب تک ہمیشہ پروفیسر مجیب کی تعریف کرتے آئے تھے جیسے سفید فام تو میں سیاہ لوگوں کے کلچر کی تعریف کیا کرتی تھیں یہ اس وقت تک تھا۔ جب تک پروفیسر مجیب نے ایک کتاب نہیں لکھی تھی۔ .... اب تک وہ پروفیسر مجیب کو بجلی سے آراستہ مکان میں ایک تیل کا دیا سمجھتے تھے اب تک پروفیسر مجیب کی شہرت ڈاکٹر توقیر کی فیلڈ میں نہ گھسی تھی۔

لیکن کتاب کے مارکیٹ میں آتے ہی صورت حال بدلنے لگی۔

اَب لوگ پروفیسر مجیب کو سٹاف روم میں پکڑ کر اُن کے افسانوں پر تبصرہ کرنے لگتے آخری سمسٹر کے لڑکے لڑکیاں اُن کی کتاب خرید کر انہیں آٹوگراف کرانے لے آتے ..... افسانوں کی زبان اور بیان کے چرچے ہوتے ہی کیمپس میں ایک نئے PET کا اضافہ ہو گیا سب ہی اِن نئے جانور پر دستِ شفقت پھیرنے کو تیار تھے۔

آج تک پروفیسر مجیب کے ماضی سے کسی کو دلچسپی نہ رہی تھی۔ اب پتہ نہیں لوگ کیسے اُس کی فیملی بیک گراؤنڈ کے متعلق باتیں کرنے لگے؟ ایک روز جب وہ سٹاف روم میں داخل ہوئے تو دو پروفیسر جن میں ایک ڈاکٹر توقیر تھے آپس میں باتیں کر رہے تھے.....

HE IS A JOLAHA BY BI°TH

"ارے نئیں ..... "

"میں جانتا ہوں اس کا باپ خاصا بیچنے آیا کرتا تھا۔ ہماری گلی میں ڈھائی روپے گز....."

"جولاہا؟ ـــــ نئیں نہیں یہ تو ایک سید فیملی کو BELONG کرتا ہے یہ

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"ایسی کتنی سید فیملیاں پیدا ہوئی ہیں؟ پاکستان بننے کے بعد ___؟"

پروفیسر مجیب سٹاف روم میں داخل نہ ہوسکے۔ وہ اپنا بن باس گزار آئے تھے اور شہزادہ بننے کیلئے اس کھلے کیمپس میں بستے تھے۔ اس لئے وہ چپ چاپ کلاس میں جانے کے بجائے ایک بنچ پر بیٹھ گئے۔ بنچ کے پاس گڑھل کی جھاڑی میں سرخ سرخ پھول لگے تھے اور ایک پرندہ بے دھڑک ان گڑھل کے پھولوں کا رس چوس رہا تھا۔ لیکن اس روز پروفیسر مجیب کے پاس لمبی چونچ والے اس سیاہ پرندے کے لئے آنکھیں نہیں تھیں۔

وہ برسوں سے اپنے جولاہے باپ اور غریبی کی زندگی سے علیحدہ ہوچکے تھے انہیں تو اب وہ غریبی کوئی پرانی دیکھی ہوئی فلم لگتی تھی۔ جس کے ہر سین پر وہ رویا کرتے تھے۔ بوڑھی کھانسنے والی ماں، کندھے پر کپڑے کا تھان لے کر آنے والا باپ .... خدا جانے وہ سب کہاں تھے؟ ___ ان کے ماں باپ؟ ان کی بہنیں، اس کی غریبی؛ جب وہ برکلے گئے اور ایم فل کرنے کے بعد لاہور واپس پہنچے تو ان کا رشتہ اپنے ماضی، اپنے ملک، اپنی زبان..... اپنے کلچر سے ٹوٹ چکا تھا۔ اتنے رشتے ٹوٹ جانے کے بعد اپنے رشتہ داروں سے رشتہ توڑ لینے میں انہیں کچھ ایسی دقت محسوس نہ ہوئی......

پروفیسر مجیب کو نہ اپنے جولاہے ہونے پر رنج ہوا نہ غریبی کا کوئی افسوس ہوا۔ انہیں تو صرف اتنا افسوس ہوا کہ آج تک وہ اپنے آپ کو اتنا بے ضرر، اچھا، ہر دلعزیز سمجھتے رہے تھے کہ کسی اور شخص کو ان کے متعلق ایسی باتیں کرنے کی کوئی معقول وجہ ہی ان کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ یہ نہیں کہ وہ ایسی باتوں کے عادی نہ تھے۔ وہ اس قسم کی گفتگو عموماً سٹاف روم میں سنتے رہتے لیکن یہ بات البتہ انہیں شاک کی طرح لگی کہ لوگ ان کے بھی بخیئے ادھیڑ سکتے ہیں؟ اب تک انہیں لوگوں پر پورا پورا اعتماد تھا۔

پروفیسر مجیب ایک نارمل صحت مند شخص تھے۔ پہلی بار ان کے غبارے میں چھید ہوا اور وہ اوپر چڑھنے کی بجائے نیچے کی طرف اترنے لگے۔ احساس کمتری میں عجب خوبی یہ ہے کہ ہوا کی طرح

نامحسوس طریقے سے داخل ہوتی ہے۔ اور ہوا کی طرح آہستہ آہستہ ہر طرف پھیل جاتی ہے۔ اس سے پہلے پروفیسر مجیب بڑے مرنجاں مرنج تھے اگر انہیں کوئی لطیفہ سنایا جاتا تو بڑی فراخدلی اور اونچے قہقہے کے ساتھ ہنستے طالب علموں کے ساتھ ان کا سلوک بہت دوستانہ تھا اس میں کبھی فادر فگر کی کھینچی شامل نہ ہوتی نہ ہی وہ طالب علموں کی مدد TIEDLOAN کی شکل میں کرتے تھے لیکن اس واقعے کے بعد جیسے وہ اپنی سالمیت کو خود ہی QUESTION کرنے لگے اب انہیں ان مشوروں پر اعتماد نہ رہا جو وہ فراخدلی سے کم تجربہ کار لڑکے لڑکیوں کو دیا کرتے تھے۔ لیکن ابھی ان کے احساس کمتری نے کوئی واضح شکل اختیار نہیں کی تھی یہ محض ایک ہلکے سے DEPRESSION کی حالت تھی۔ وہ بیٹھے بیٹھے چپ ہوجاتے اور پھر دیر تک چپ ہی چلے جاتے۔

پہلے وہ سوچتے بھلا اگر میں غریب تھا تو پھر اس سے کسی اور کو کیا تکلیف پہنچی، رفتہ رفتہ ان کا دماغ کہتا کہ غریبی ضرور کوئی بیماری ہوگی یہ مجھے ہوئی اور دوسروں کو اپنا آپ محفوظ رکھنے کا خیال آیا لیکن جب DEPRESSION گہرا ہوجاتا تو وہ خود اس کا شکار ہوجاتے اور سوچتے رہتے کہ بھلا میں نے کسی کا کیا بگاڑا تھا؟ جو وہ پیٹھ پیچھے میرے لئے ایسے خیالات کا اظہار کرتے ہیں؟

ابھی اس واقعے کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ ایک اور اچنبھے کی بات ہوئی!

انسانی کمزوریوں میں ایک بہت عام سی کمزوری جنس مخالف کے گرداب میں پھنسنا ہے گو عام طور پر ہر انسان اس حادثے کو اپنے لئے مخصوص سمجھتا ہے لیکن حقیقت یہی ہے کہ یہ سانحہ نوع انسانی کا ساجھا نوشتہ ہے۔ بدقسمتی سے پروفیسر مجیب بھی عام گوشت پوست کے بنے ہوئے انسانوں کی طرح تھے اور جس سال وہ نئے نئے ایم فل ہوکر امریکہ سے آئے اسی سال ان کے ڈیپارٹمنٹ میں ایک موڈ اسکواڈ لڑکی بھی داخل ہوگئی ہر سمسٹر میں اس لڑکی کا گریڈ بڑھنے لگا اور ہر سمسٹر میں پروفیسر مجیب کا اپنے اوپر اعتماد کم ہونے لگا۔ یہ عشق قدرے ابنارمل تھا۔ کیونکہ عظمیٰ کبھی پروفیسر صاحب کے کمرے میں بیٹھ کر باتیں نہ کرتی۔ نہ ہی پروفیسر صاحب اسکے تعاقب میں رہتے۔ لیکن کلاسوں میں جیسے نئی جان آگئی تھی۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

عظمیٰ بہت تیز بولنے والی کھلی آنکھوں کچھ نہ دیکھنے والی لڑکی تھی جب ایک بار وہ پروفیسر سے جھگڑنے لگتی تو بحث کا تمام طول بلد عرض بلد بھول کر وہ صرف اس کی ذات میں مرکوز ہو جاتا۔ پروفیسر مجیب نے اس قسم کی لڑکیاں برکلے میں تو دیکھی تھیں لیکن خود انہیں لاہور میں ایسی لڑکی کو قریب سے دیکھنے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔ پہلے دن عظمیٰ نے پروفیسر مجیب کو CORNER کر لیا.....

"سر کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ عورت زیادہ ذہین ہے کہ مرد یا دونوں میں ذہانت کے اعتبار سے برابری ہے —؟"

پروفیسر نے سر کھجاتے ہوئے کہا — "اگر جسمانی ساخت کو دیکھا جائے تو مرد کے دماغ کا وزن عموماً ۴۹½ اونس ہوتا ہے جبکہ عورت کا نارمل دماغ صرف ۴۴ اونس ہوتا ہے —"

اب عظمیٰ کی آنکھوں سے شعلے جھڑنے لگے — "تو آپ کا کیا خیال ہے — کہ دماغ کا زیادہ حجم اس بات کی دلیل ہے کہ زیادہ بھیجے والے کا آئی کیو بھی زیادہ ہوگا —"

"ضروری نہیں —"

"پھر آپ نے اس طریق سے بحث کا آغاز کیوں کیا؟ — آپ کو بائیولوجی کا سہارا نہیں لینا چاہیئے تھا —"

اب کلاس کے کچھ لڑکے لڑکیاں شرارت سے ہنسنے لگے اور کوٹ کے اندر بغلوں کے قریب پروفیسر مجیب کو پسینہ آنے لگا۔

"اسلامی نقطہ نظر سے —"

"نو نو نو —" عظمیٰ نے دونوں بازو اٹھا کر کہا — "ہم مذہب کے نام پہ EXPLOIT ہونے والے نہیں — ہم سے کوئی سائنٹیفک EXPRICAL EVIDENCE کی بات کیجئے کیا عورت واقعی مرد کے مقابلے میں ناقص العقل ہے —؟"

کم از کم جو عظمیٰ اس وقت دھوپ میں کھڑی سنہری بالوں کے ساتھ جگمگا رہی تھی وہ پروفیسر مجیب کو ناقص العقل نہیں لگ رہی تھی۔ اور اس دن کے بعد اس نے پھر کبھی اسے کبھی بھی مرد کے مقابلے میں

کمتر نہیں سمجھا۔ پروفیسر کا عشق ادھورا، بھونڈا اور بالکل پٹڑی سے اترا ہوا تھا۔ وہ عظمیٰ کو ملتے نوبالغ لڑکیوں کی طرح BLUSH کرنے لگتے۔ اس کی کتابوں میں پھول پریس کر کے رکھ دیتے جس مشاعرے، سیمنار، مباحثے، کلچرل شو میں عظمیٰ جاتی وہاں پروفیسر صاحب پہلے سے موجود ہوتے ان کی کوشش ہوتی کہ عظمیٰ کے قریب بیٹھیں۔ اور پروگراموں کے دوران وہ ان کے کان کے قریب منہ لا کر فنکشن پر تبصرہ کرتی رہے۔

پروفیسر مجیب میں چونکہ فطری حیا تھی۔ اس لیے وہ اپنے عشق کی دیوار کو سیدھا نہ استوار کر سکے۔ عظمیٰ کے ساتھ ایک واضح رشتہ بنانا ان کے بس کی بات نہ تھی۔ ہاں وہ سمسٹروں میں اسے اے گریڈ دیتے اور دلواتے رہے اور ان سے عظمیٰ کی کچھ اتنی تعریفیں سرزد ہوتی رہتیں کہ سارے ڈیپارٹمنٹ بلکہ سارے کیمپس میں ایک بڑا جاندار سکینڈل بن گیا۔ پروفیسر صاحب چونکہ ہردلعزیز تھے اس لیے جو بھی باتیں ہوتیں ان کی پیٹھ پیچھے ہوتیں۔ یہ تیسرے سمسٹر کا واقعہ ہے کہ ایک روز عظمیٰ ان کے کمرے میں آئی وہ ایک ایسے گھوڑے کی طرح لگ رہی تھی جو میلوں بھاگتا آیا ہو۔

"پروفیسر صاحب آپ کیا سمجھتے ہیں کہ میرے سارے نمبر رعائتی ہیں؟ —"

"کیا مطلب؟ —"

"میری کلاس کے کچھ لڑکوں نے مجھ پر چارج لگایا ہے کہ اگر آپ نہ ہوتے تو میرا اے گریڈ کبھی نہ آتا۔ بتائیے کیا میں اے گریڈ DESERVE نہیں کرتی —؟"

"بھائی ہم لوگ صرف MERIT پر نمبر دیتے ہیں یہ تمہارے کلاس فیلوز کو غلط فہمی ہوئی ہے"

"دیکھئے میرا صرف ایک سمسٹر رہ گیا ہے سر۔ میں یہاں سے چلی جاؤں گی۔ میری شادی ہو جائے گی..... لیکن آپ کو ابھی بہت لمبی سروس کرنی ہے آپ اسسٹنٹ پروفیسر ہوں گے پھر پروفیسر ہوں گے۔ آپ کو اپنی REPUTATION کا خیال رکھنا چاہیئے ..... اگر آپ اسی طرح بدنام ہونے لگے تو بہت جلد وائس چانسلر آپ کو یہاں سے نکال دے گا۔"

دہکتے کوئلوں جیسی آنکھیں پھڑکاتی عظمیٰ باہر چلی گئی اور پروفیسر صاحب اپنی صفائی میں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کچھ نہ کہہ سکے باقی سب باتیں تو پروفیسر صاحب کے لئے معمولی تھیں۔ لیکن وہ یہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ اُن کے اور اعظمیٰ کے سفر کو ختم ہونے میں صرف ایک سمیسٹر باقی ہے اور اس کی عظمیٰ کی کہیں شادی ہو جائے گی؟ انہوں نے کبھی اعظمیٰ سے شادی کرنے کے متعلق نہ سوچا تھا۔ بلکہ انہوں نے تو شادی کے متعلق ہی نہ سوچا تھا۔ وہ تو سمجھتے تھے کہ عظمیٰ ہمیشہ کیمپس آتی رہے گی بحثیں کرتی رہے گی پروفیسروں پر دن آپ ہنا کرے گی۔ یکدم ان کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ چونکہ وہ بالکل پریکٹیکل آدمی نہ تھے۔ اس لئے ان سے ایک غلطی اور سرزد ہو گئی.....

یہ غلطی وہ خط تھا جو انہوں نے ساری رات بیٹھ کر لکھا۔ جس میں ایک پروفیسر کی زبان اور بیان کم تھا اور ایک سلی سکول گرل کا انداز زیادہ تھا خط لکھنے میں کوئی قباحت نہ تھی ایسے خط سبھی زندگی کے کسی نہ کسی عہد میں لکھا کرتے ہیں۔ لیکن ہوا یوں کہ جب دوسرے روز وہ پڑھانے کے لئے اپنی کلاس میں پہنچے تو بلیک بورڈ کے وسط میں یہی خط ڈرائنگ پنز کے ساتھ لگا ہوا تھا۔ اور ساری کلاس غائب تھی......

پروفیسر مجیب نے اپنی عینک صاف کی پھر بڑی مشکل سے ڈرائنگ پنز نکالیں خط کو احتیاط سے تہہ کیا اور بیماری کی چھٹی لے کر کیمپس سے رخصت ہو گئے..... پھر سارا سمیسٹر اُن میں واپس آنے کی جرأت پیدا نہ ہوئی۔ جب وہ واپس لوٹے تو اُن کی گذشتہ مقبولیت نے اُن کا استقبال کیا وہ اندر ہی اندر چور محسوس کرتے تھے لیکن اُن کے کولیگز، شاگردوں اور ملنے ملانے والوں نے کبھی اس طرف اشارہ نہیں کیا......

پھر اتنے سالوں بعد اچانک کہیں سے کسی نے عظمیٰ کا خط فوٹوسٹیٹ کرا کے کیمپس کے چنیدہ چنیدہ گرگ زادوں میں تقسیم کرا دیا۔ کئی سالوں سے یہ خط پروفیسر مجیب کے براؤن کوٹ کی اندرونی جیب میں تہہ کیا ہوا پڑا تھا۔ لیکن نہ تو انہوں نے کبھی اس سوٹ کو پہنا تھا نہ ہی کبھی اندر والی جیب سے اس خط کو نکال کر پڑھا تھا۔ جیسے عظمیٰ بغیر فیئر ویل پارٹی میں شمولیت کئے کیمپس سے رخصت ہو گئی تھی۔ ایسے ہی انہوں نے بغیر کسی فیئر ویل کے اس حادثے کو اپنی زندگی سے گزر جانے دیا تھا۔

محبت اتنا بڑا سانحہ نہیں جس قدر لوگ اسے اہمیت دیتے ہیں۔ یہ حادثہ اُسی کے لئے اہم ہوتا ہے جو اِس سے گزرتا ہے اِسی کی مقناطیسی فیلڈ میں یہ کمال ہے کہ عموماً اس فیلڈ میں آکر لوگ شاعری کرنے لگتے ہیں۔ بڑے بڑے افسانے رقم کرتے ہیں اور اسی طرح جو سانحہ بہت ذاتی انفرادی حیثیت رکھتا ہے بڑی عمومی چیز بن جاتا ہے محبت میں ایک اور کشش بھی ہے۔

کچھ لوگ خود محبت کرنے کے اہل نہیں ہوتے یا اس میدان میں پچھاڑ کھانے کے بعد اپنے آپ کو نئے تجربات کے لئے تیار نہیں کر سکتے ایسے لوگ عموماً اپنی تخلیقی قوتوں کو دوسروں کی محبت کو بلیک میل کرنے پر صرف کرتے ہیں۔ انہیں شہر کے تمام اہم سکینڈل، ملاقاتوں کی جگہیں اور یہ تک معلوم ہوتا ہے کہ فلاں کی محبت کس میں داخل ہو چکی ہے

پتہ نہیں وہ کون شخص تھا جس کو پروفیسر مجیب کی تمام داستان مع تاریخوں کے معلوم تھی۔ کس تاریخ کو کتنے بجے وہ کس سیمینار میں عظمیٰ کے پاس بیٹھے؛ کس دن شام کے پونے نو بجے انہیں اور عظمیٰ کو رنگل سینما سے نکلتے دیکھا گیا۔؟ کس رات پروفیسر کی نیلی فوکسی عظمیٰ کے چچا کے گھر نظر آئی؟ کس ٹیلیفون نمبر پر باتیں کی گئیں؟ اور باتوں کے دوران کن کن ناکوں پر اظہارِ خیال کیا گیا؟

جب کوئی شخص خود محبت کرتا ہے تو وہ سرنگوں قطرے کی طرح کششِ محبت سے نیچے کی طرف گرتا ہے جب لوگ کسی اور کی محبت میں دلچسپی لیتے ہیں۔ تو فوارے کی بوندوں کی طرح اوپر اُچھلتے اور دُور دُور تک پھیل جاتے ہیں۔ پہلا احساس آنسو سے مشابہہ ہوتا ہے اور دوسرا جذبہ کھلکھلاہٹ سے......

سارے کیمپس میں مسکراہٹیں، زیر لب سرگوشیاں، زہر خند اور نوٹس ملاتے فضا پیدا ہو گئی۔ جہاں سے پروفیسر مجیب گزرتے لوگ بولتے بولتے چپ ہو جاتے۔ بلیک بورڈوں پر کارٹون بنے نظر آتے کسی میں ایک پروفیسر کیمپس کی لڑکی کے پیچھے بھاگ رہا ہے اس کی جوتی اٹھائے ہوئے ہے اس کے پاؤں پڑ رہا ہے...... ان تمام کارٹونوں کی پروفیسر صاحب سے عجیب مشابہت تھی.........

www.iqbalkalmati.blogspot.com

صورت حال اتنی نازک ہو چکی تھی کہ پروفیسر مجیب ایک بار پھر لمبی چھٹی لے کر باہر چلے جانے کی سوچ رہے تھے وہ شام کے وقت اکیلے نہر کنارے چلتے رہتے۔ دسمبر کا مہینہ تھا اور پاپولر کے درختوں نے پت جھڑ بچھا رکھی تھی۔ دور دور تک سوکھی نہر میں یہ خشک پتے آوارہ پھرتے تھے۔ پروفیسر صاحب کے دل اور موسم کی ایک سی کیفیت تھی۔

ان دنوں میں ہی ایک اور قابلِ ذکر واقعہ پیش آیا۔

سنڈیکیٹ کی میٹنگ تھی۔ اس میں یہ معاملہ زیرِ بحث تھا کہ ہر سمسٹر میں پاس ہونے کیلئے پینتالیس فی صد نمبر ضروری ہیں۔ گو پروفیسر مجیب ان دنوں احساسِ کمتری کے نرغے میں آئے ہوئے تھے لیکن بدقسمتی سے انہیں اپنے کیمپس کے ایسے شاگردوں سے محبت تھی جو امتحان میں کبھی کبھی نمبر نہیں لے سکتے پروفیسر صاحب نے اپنی مری سی آواز میں ایک چھوٹی سی تقریر کر دی۔ "شاگردوں کا دراصل کوئی قصور نہیں ہے۔ ہمارے یہاں جو تعلیم دی جا رہی ہے یا تو اس کی شکل بدلنی ہو گی یا پروفیسر طبقے کے اخلاق کو بلند کرنا ہو گا تاکہ پروفیسر لوگ پوری ذمہ داری سے پڑھائیں۔ اور شاگردوں کو محض ٹامک ٹوئیاں مارنے کیلئے نہ چھوڑ دیں۔ پھر ایسے حالات میں جہاں تین تین سالوں میں ایم اے ایم ایس سی ہو رہا ہے۔ امتحان ملتوی ہوتے ہیں۔ داخلے نہیں ہو سکتے؟ آپ شاگردوں سے کیا امید رکھتے ہیں اور کیوں امید رکھتے ہیں شاگرد لوگ ہمیں وہی کچھ واپس دے رہے ہیں جو اُن کی جھولی میں ڈالا جا رہا ہے۔ جب تعلیم دینے کا معیار کچھ نہیں تو امتحان میں پینتالیس فی صد نمبر زیادہ نہیں بہت زیادہ ہیں ——"

ایک ہی سانس میں بغیر پلکیں اٹھائے جب پروفیسر صاحب نے یہ کچھ کہا تو ایک طرف سے ہلکا سا قہقہہ بلند ہوا اور ایک ڈیپارٹمنٹ کے چیئرمین بولے —— "بڑی اچھی بات ہے کہ پروفیسر موصوف نے پروفیسروں کی اخلاقی گراوٹ کی طرف اشارہ کیا ہے امید ہے وہ اپنے گریباں میں بھی جھانکنے کی کوشش کریں گے ——"

پروفیسر مجیب سکتے میں آ گئے۔ جب انہوں نے اخلاقی گراوٹ کی بات کی تھی تو اُن کے وہم و گمان میں اس اخلاقی گراوٹ کا شائبہ نہ تھا جو جنسِ مخالف کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے وہ اس وقت

محض دیانت داری سے کام نہ کرنے کو اخلاقی گراوٹ کی معراج سمجھ رہے تھے۔

اس روز وہ سنڈیکیٹ کی میٹنگ سے لوٹے تو وہ سوچ رہے تھے کہ امریکہ M.GRATE کرنے میں عافیت رہے گی کہ تصور میں لوٹ کر پناہ ملے گی وہ تعلیمی ماحول سے چھپ کر کبھی منیاری کی دکان کھولنے کا سوچتے۔ کبھی ان کے دل میں خیال آتا کہ کوئی ایجنسی مل جائے مثلاً پیٹرول کی ایجنسی —— سیمنٹ کی ایجنسی لیکن انہیں تو سوائے پڑھانے کے اور کوئی کام نہ آتا تھا؟ وہ ایسی ہی باتیں سوچتے فٹ پاتھ پر سوکھے ہوئے پاپلروں کے درمیان چل رہے تھے۔

اتفاق کی بات ہے کہ جس قدر پروفیسر مجیب خود دل برداشتہ تھے۔ اتنی ہی زیادہ اُن کی کتاب مقبول ہو رہی تھی۔ انہیں کسی تنقید نگار، کسی رسالے اخبار سے رجوع نہ کرنا پڑا اور پھر بھی دھڑا دھڑ اُن کی کتاب پر تبصرے رائیٹ اَپ کالم چھپ رہے تھے لیکن کہتے ہیں۔ جنگ میں وہی فریق جیت جاتا ہے، جو اپنے دشمن کو احساسِ کمتری میں مبتلا کر دے اور ڈاکٹر توقیر اب پورے طور پر فتح مند تھے جس طرح ایک بند میں شگاف پڑنے کی دیر ہوتی ہے۔ سارا پانی خود اپنے وزن اور پریشر سے باقی سارا بند توڑ دیتا ہے۔ ایسے ہی انسان کے اعتماد میں انگلی بھر زخم کرنے کی ضرورت ہوتی ہے پھر سارا آدمی خود ہی پک کر پھوڑے کی طرح رِسنے لگتا ہے۔

پاپلر کے درختوں تلے چلتے چلتے پروفیسر مجیب اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی ہزار سالہ عمر سے بہتر ہے۔ وہ اب سکیم بنا رہے تھے کہ کس طرح وہ شیر کی مانند ایک ہی جست میں خودکشی کر کے سارا حساب چکا دیں گے کہ پیچھے سے کسی نے اُن کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

یہ ڈاکٹر توقیر تھے —— عزم و ہمت کا سمبل...... مضبوط ٹھوڑی فراخ ماتھا......

"یار اکیلے اکیلے کدھر؟ ——"

پروفیسر مجیب سر سے پاؤں تک لرز گئے انہیں لگا کسی نے چھت سے اُن کی لٹکی ہوئی لاش کے چوتڑوں پر کرکٹ کا بیٹ مارا۔ وہ پھٹی ہوئی پتنگ کی طرح فٹ پاتھ پر ہوا کے ساتھ ساتھ کبھی اِدھر جا رہے تھے کبھی اُدھر کہ اچانک اولے پڑنے لگے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"جو کچھ آج سنڈیکیٹ میں ہوا مجھ سے برداشت نہ ہو سکا۔ IT IS NOT DONE

IT IS BELOW THE BELT

پروفیسر مجیب اُن کا مُنہ دیکھنے لگے۔

یہ پرانا استحصال کا طریقہ ہے فرعون نے صدیوں اپنے ابوالہول اسی طریقہ سے بنوائے۔ ہلاکو چنگیز نے اسی اصول پر رہ کر جنگیں جیتیں۔ انگریزوں نے یہی پالیسی ہتھیا کر برصغیر میں حکومت کی۔ پہلے دشمن کو احساسِ کمتری میں مبتلا کرو..... اُسے احساس دلاؤ کہ وہ کچھ نہیں اور جب وہ واقعتاً اپنے آپ کو کچھ نہ سمجھنے لگے تو پھر اپنی خصوصی نوازشوں سے اس کے وقار کو بحال کرو..... کیونکہ اس طرح وہ ہمیشہ اصلی طاقت کا منبع تمہیں سمجھے گا۔

جس وقت انگریز نے برصغیر کو مکمل طور پر معاشی، معاشرتی، ذہنی اور جذباتی طور پر مفلوج کر لیا تو پھر انہوں نے یہاں سکول، ہسپتال، سڑکیں اور رفاہِ عامہ کے کام شروع کر دیئے تاکہ ان کی امن پسندی انسان دوستی اور غریب نوازی سے برصغیر کے یہ شکستہ لوگ اُٹھیں اور ان کی جے جے کار گائیں عموماً ایسے ہی ہوتا ہے کہ جب آدمی دلدل سے نکلتا ہے تو نکالنے والے کا نہ صرف شکر گزار ہوتا ہے بلکہ خود بخود اس کے نظریات بھی اپنانے لگتا ہے.....

اب کیمپس میں ایک نئی تبدیلی آگئی ـــــ

ڈاکٹر مجیب اور پروفیسر توقیر ساتھ ساتھ پائے جانے لگے۔ ڈاکٹر مجیب اپنی کلاسوں میں پروفیسر توقیر کی کتابوں کا حوالہ دینے لگے انہیں اِس عہد کا سب سے بڑا دانشور تسلیم کرنے لگے اور ان کی سیاسی بصیرت کا ذکر خاص و عام ہونے لگا۔

پروفیسر مجیب از سرِ نو شگفتہ ہونے لگے اور لوگ پھر اُن کے گرد چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں اکٹھے نظر آنے لگے۔ لیکن اب پروفیسر مجیب اس طاقت کو اپنے سے منسوب نہ کرتے تھے۔ وہ اپنی بات بھی کرتے تو ڈاکٹر توقیر کے گماشتے کی حیثیت سے۔ اس بار جب وہ مقبول ہوئے تو وہ سمجھتے تھے کہ اس میں اُن کی ذات کا کوئی کمال نہیں بلکہ اُس ڈائنمو کی کرامت ہے جس نے اُن کی بیٹری چارج کی تھی.....

اب اُنہیں اپنی کتاب اُنہی کے افسانے اس کا تذکرہ فروعی لگنے لگا..... وہ تخلیقی عمل کو بہت گھٹیا اور جذباتی فعل شمار کرنے لگے۔ حتّٰی کہ جب افسانوں کو دوبارہ شائع کرنے کی نوبت آئی تو انہوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ یہ کوئی بڑا کارنامہ نہیں۔ انشاءاللہ جب میں کوئی بڑی کتاب لکھوں گا تو ضرور شائع کراؤں گا......

اِس سے پہلے وہ پھولوں، پرندوں اور فواروں کو دیکھنے کے عادی تھے۔ اب وہ بندوقوں پستولوں اور سٹن گنوں کی ساخت میں دلچسپی لینے لگے...... پہلے وہ سیاسی نظریوں کو نہ جانتے تھے اب اُن کا ایک پختہ سیاسی اعتقاد تھا۔ اور رفتہ رفتہ وہ سارے کیمپس پر پھر سے مقبول ہو گئے تھے۔

لیکن اِس بار اُن کی مقبولیت کی وجہ صرف وہ طاقت تھی جس طاقت کو بیساکھی بنا کر وہ کھڑے تھے لوگ کہتے ہیں کہ پروفیسر صاحب مہاتما بُدھ کا نیا ماڈل تھے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ کپل وستو کا شہزادہ راج پاٹ چھوڑ کر بن باس کی طرف چلا گیا ـــــ پروفیسر مجیب اپنا بن باس جھیل کر یہاں شہزادہ بننے کے لئے آئے تھے...... ایسا شہزادہ جس کے لئے دیواروں پر لکھا ہوتا ـــــ "مرگ بر شہزادہ ذی وقار......"

"مرگ بر شہزادۂ دلدار......"

"مرگ بر شہزادۂ والی تبار......"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بڑا بول

شیشے جڑے پلنگ پر ملتانی کھیس اوڑھے چودھرائن آنگن میں پڑی تھی۔ بریتی پر دھوپ میں سوکھتے ہوئے مگرمچھ کی طرح اس نے اپنا وجود چھوڑ رکھا تھا۔ لیکن اس کا دل ٹکریں مار رہا تھا ایسے ہی کبھی کبھی شام کے وقت جب کوئی چمگادڑ کمروں کے اندر آجاتی تو بار بار دیواروں سے ٹکرا کر راستہ تلاش کیا کرتی — لیکن چودھرائن کو علم تھا کہ اس بار کوئی راستہ کہیں ہے ہی نہیں ملے گا کیا؟ اسے تو آج تک پتہ ہی نہ چلا تھا کہ وہ بھی گوشت پوست کی بنی ہے وہ بھی اندر یا باہر زخمی ہو سکتی ہے۔ آج تک جو بھی مصیبتیں اس نے دیکھی تھیں ان کا علاج بہت ہی آسانی سے دولت یا پستول نے کر دیا تھا سارا دِن گاؤں کی عورتوں سے لدے پھندے آنگن میں بیٹھی کبھی اسے احساس تک نہ ہوا تھا کہ وہ اور دوسری عورتیں ایک جیسی ہیں۔ ان کی مصیبتیں سانجھی ہیں — اور وہ انسانی بدی میں برابر کی شریک ہو سکتی ہیں؟ اپنے ساتھ کسی برائی یا بدی کا تو وہ تصوّر بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اس کا ہر فعل اس کا ہر قول سچا تھا۔ وہ تو سوچ بھی نہ سکتی تھی کہ باقی گاؤں والوں کی طرح اس میں یا اس کے خاندان میں کبھی کوئی خرابی پیدا ہوئی تھی یا ہو سکتی تھی! وہ لوگ تو صدیوں سے دولت کے سہارے ایسی بے داغ زندگی بسر کر رہے تھے کہ انہیں شبہ بھی نہ تھا کہ انسانی دُکھ سارے سانجھے ہوتے ہیں اور ان دُکھوں سے پیدا ہونے والی برائیاں ایک ہی کنوئیں کی ٹنڈوں سے نکلتی ہیں۔ انسان جب بھی روتا ہے کسی نہ کسی طرح انسانی برادری کے کچھ لوگ کہیں نہ کہیں اور کبھی متاثر

ہوتے ہیں۔ اس سانجھی قسمت کا چودھرائن کو علم نہ تھا! شاید وہ انسانی برادری میں سے اپنے آپ کو نہ سمجھتی تھی!

یوں تو چودھرائن پلنگ پر لیٹی تھی لیکن اس کا دل حویلی کی پچھلی کوٹھڑی کے قفل کے ساتھ لٹکا ہوا تھا اس کوٹھڑی کو اس نے اپنی شادی شدہ حیاتی کے بائیس سالوں میں بمشکل تمام تین چار دفعہ دیکھا تھا۔ نانک چندی اینٹوں کی اس پختہ حویلی کے پچھواڑے اُن گنت گودام، آنگن، دالان کوٹھڑیاں ایسی تھیں جو بند تہہ خانوں کی طرح مکینوں کے انتظار میں رہتی تھیں۔ جن کی چھتوں سے دیواروں سے فرشوں سے آہستہ آہستہ کلر اور نمی آنسوؤں کی طرح رستہ رہتا۔ پچھلی کوٹھڑی کو آخری بار چودھرائن نے اس روز دیکھا تھا جب ان کا مزارعہ خدا بخش اپنی فالج کی ماری ہوئی ماں کو چودھرائن کے پاس چھوڑ گیا۔ یہ دیوانی، غموں کی کھائی ہوئی بیوہ کچھ عرصہ پلنگ پر لیٹی چھت کو تکتی رہی اور پھر اللہ کو پیاری ہو گئی جس وقت خدا بخش کی ماں نے فجر ویلے دم دیا چودھرائن اپنے میکے گئی ہوئی تھی اس لیے کوٹھڑی میں جھاڑو بہارو پھیر کر پھر اس میں قفل ڈال دیا گیا۔ جتنی دیر اماں نذیراں اس میں بیمار پڑی رہی چودھرائن اسے تمام وقت دودھ مکھن روٹی بھجواتی رہی لیکن اسے کبھی اتنی فرصت نہ ملی کہ پچھلی کوٹھڑی میں خود جا کر بوڑھی عورت کا حال دیکھ لیتی۔ کوٹھڑی کے درشن ہوئے بھی تو میکے سے واپسی پر جب اماں نذیراں مر چکی تھی۔

اس کوٹھڑی کی بھی عجب قسمت تھی۔ اس میں جب بھی کوئی آ کر ٹھہرا راندہ درگاہ ہی ٹھہرا جب بڑے موکھے سے غیر قانونی طور پر آدھی رات کے وقت پانی توڑ کر چودھری صاحب کی زمینوں کو لگایا جا رہا تھا اور آدھی رات کے وقت پوہ کی ٹھنڈی ہوا میں حیدر کے ہاتھ کسی پر جھوٹے پڑ رہے تھے اس وقت جب چھاپا پڑا تو حیدر کو کئی دن اسی کوٹھڑی میں بند رہنا پڑا ــــ لیکن اس واقعے کا چودھرائن کو علم نہ تھا۔

چودھرائن اور چودھری صاحب کو تو یہ بھی علم نہ تھا کہ مزارع رحیم چاچا کا بیٹا جب چک ۱۳۲ میں قتل کر کے بھاگا تو مفرور ہو کر اس نے بھی اسی کوٹھڑی میں دو راتیں کاٹی تھیں لیکن ایک واقعہ ابھی تک چودھرائن کو یاد تھا ــ جیسے اپنی زندگی میں مائیکے سے پہلی بار ودائیگی ابھی تک اس کی آنکھوں کے آگے فلم کی طرح چلتی تھی۔

ابھی عصمت چودھرائن کی گود میں تھی۔ شادی کے چوتھے سال جب اللہ نے بیٹی دی تو چودھرائن نے قسم کھائی کہ وہ اسے ہمیشہ باوضو رہ کر دودھ پلائے گی ــــ ویسے بھی اس کا خیال تھا کہ بڑے لوگوں کی یہ پکی نشانی ہے کہ وہ کچھ ایسے مشکل کام اپنے ذمے لیتے ہیں جنہیں عام ہما شما نہ کر سکیں۔ جب وہ وضو کر کے جھولی میں عصمت ڈالے پھلکاری کی بکل مار کر دودھ پلانے بیٹھتی تو گاؤں کی عورتوں پر دبدبہ پڑ جاتا۔ گوہے کوڑے میں لتھڑی عورتیں، ننگ و ناموس کی کھیتیاں اجاڑ کر گزرنے والی دیہاتنیں، قدم قدم پر اپنے ماحول اور لوگوں سے سمجھوتے کرنے والی سادھارن زنانیاں چودھرائن کو کسی کرشمہ سے کم نہ سمجھتیں وہ انہیں اولیاء اللہ لگتی تھی۔

سردیوں کی رات تھی۔

باہر بڑے کھلیانوں میں مونجی کے ڈھیر تھے۔ دن کے وقت چودھری صاحب اور ان کے منشی اپنے جھڑے چاولوں کو بڑے کانٹے پر تلوا کر بوریوں میں بند کرواتے رہتے رات کو سلی ان سلی بوریوں اور منہ کھلے ننگے ڈھیروں پر اوس پڑتی رہتی۔ سردی پہلے سے بہت بڑھ گئی تھی۔ رضائی کے اندر بھی چھوٹی عصمت کی ناک برف کی قاش جیسی سرد رہتی۔ حویلی کے کواڑ پرانے ضرور تھے پر چوگاٹھیں مضبوط تھیں لیکن پتہ نہیں کن درزوں سے ہوا تھری ناٹ تھری کی گولیوں کی طرح آ رہی تھی۔ اتنی سردی کے باوجود چودھرائن نے بڑی چوکی پر بیٹھ کر وضو کیا اور دوشالے میں عصمت کو تھپا کر کے دودھ پلانے لگی۔ شادو رات رات گئے تک چودھرائن کو دبانے میں مشغول رہتی تھی اس لیے چودھرائن کو احساس نہ ہوا کہ وہ کچھ کہنا چاہتی ہے وہ پلنگ کی پائینتی کھڑی ململ کے میلے دوپٹے میں لنڈے کے سویٹر کے تار ادھیڑ رہی تھی۔

"اب تو جا شادو آج مجھے نہیں دبوانا ــ"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

شادو کھڑی ہی رہی۔ جیسے آستانوں پر مجذوب کھڑے رہتے ہیں پاؤں پر پاؤں دھر کر شادو کا آدھا سر سفید ہو چکا تھا۔ دھرتی کے ساتھ ساتھ رہنے کی وجہ سے اس کا چہرہ مٹیالہ تھا۔ ہاتھ پاؤں سردیوں میں اتنے پھٹ جاتے کہ لہو بہنے لگتا۔ کانوں میں برسوں پرانی چاندی کی ڈنڈیاں تھیں جو اب شادو کے کان ناک آنکھوں کی طرح اس کے جسم کا حصہ ہو گئی تھیں۔ آٹھ سال پہلے جب اس کا خاوند مرا اسے اس وقت بھی ان ڈنڈیوں کو اتارنے کا خیال نہ آیا۔ وہ کھاتی پیتی خدمت کرتی غائب رہتی۔ اس کے پاس کہنے کو برسوں سے کچھ نہیں تھا۔ اس کی آنکھیں دیکھتی ضرور تھیں لیکن دل تک کوئی شبیہ نہ اترتی تھی کوئی بات وہاں تک پہنچ نہ پاتی تھی۔ وہ کھیتوں کھلیانوں میں سے چلتی ہوئی یوں نظر آتی جیسے وہ بوڑھی پھنڈر گائے ہو گاؤں والوں نے رحم کھا کر شاملات میں چرنے چگنے کے لیے چھوڑ دیا ہو۔۔۔

"جا تو شادو۔۔۔ بڑی ٹھنڈ ہے مریں اور ایک گلاس گرم گرم دودھ پی کر جائیں کاڑھنی میں سے۔"

چودھرائن کو اچھی طرح سے معلوم تھا کہ شادو نے کبھی دودھ مکھن کو ہاتھ نہیں لگایا پھر بھی وہ اصرار کرتی رہتی۔ جب بھی چودھرائن اسے کوئی اچھی چیز کھانے کو کہتی وہ چیز ضرور لے لیتی لیکن کبھی کھاتی نہیں تھی۔۔۔

"کھڑی کیوں ہے دیکھتی نہیں کتنی ٹھنڈ ہے جا شادو۔۔۔ تیری مریاں انتظار کر رہی ہوگی۔"

"شادو کی آنکھ سے آنسو نکلا۔۔۔ ایک چھوٹا سا نگینہ آنسو۔۔۔ مدت کا رکا ہوا پہلا آنسو۔

"مریاں تو چودھرائن جی۔۔۔" وہ چپ ہو گئی۔

"ادھر آ مرن جوگی۔۔۔ کیا ہوا ہے مریاں کو۔۔۔"

شادو پلنگ کے پاس ٹھنڈے فرش پر بیٹھ گئی۔

"مریاں کو کیا ہونا ہے۔۔۔" آہستہ سے شادو نے کہا۔

شادو تو اچھے وقتوں میں کبھی نہ بولی تھی۔۔۔ اب کیا بولتی۔ ایسی روحیں تو ازل سے چپ ہوتی ہیں۔ انہوں نے اپنی ساری باتیں سب روز قیامت کے لیے روک رکھی تھیں۔

"پھر بھی کوئی تو بات ہے۔۔۔ بتا ناں!"

"مریاں کے بچہ ہونے والا ہے۔۔۔ پانچواں مہینہ ہے۔۔۔!"

"مریاں کے بچہ؟۔۔۔ کیسے؟ ہے کبھی ہوا ہے ایسے"

شادو ابھی تک سویٹر کے پھوندنے کھینچ رہی تھی۔ شاید جتنے الفاظ اس نے آج تک سیکھے تھے ان سب کو ملا کر بھی اس کی بپتا بیان نہیں کی جا سکتی تھی۔۔۔

"مجھے کیا پتہ چودھرائن جی۔۔۔ میں تو دن بھر یہاں مری رہتی ہوں پتہ نہیں وہاں کیا کھیہ سواہ کھاتی ہے۔"

"پھر۔۔۔ اب؟۔۔۔ اب کیا کریں؟"

شادو نے اٹھ کر چودھرائن کے پاؤں پکڑ لیے۔۔۔

"بس جی عزت بچ جائے میرے مرے ہوتے یاسین کی۔۔۔ دائی بیگاں چار سو روپیہ مانگتی ہے۔۔۔۔۔۔ میں روپیہ بھی دے دوں گی شاہنی جی پر۔۔۔ یہ کام کرواؤں کہاں۔۔۔؟ پردے کی بات ہے جو آپ اسے حویلی میں رکھ لیں۔ اپنے پاس۔۔۔ تو عزت بچ جائے میری۔۔۔" شادو ہاتھ ~~سینے~~ ملتی ہوئی دیر تک کہتی رہی ہائے عزت بچ جائے میری۔ ہائے عزت بچ جائے۔ چودھرائن کو یہ ضرور معلوم تھا کہ غریبوں پر مصیبتیں ٹوٹتی ہیں لیکن یہ کہ انہیں کوئی عزت وغیرہ کا مسئلہ بھی درپیش ہوتا ہے یہ اس کے لیے نئی بات تھی۔

چودھرائن کو شادو پر دل ہی دل میں بڑی ہنسی آئی۔ بلکہ اسے تعجب ہوا کہ شادو بھی اپنے آپ کو عزت دار سمجھتی ہے؟ کیا پدی کیا پدی کا شوربہ؟ اگر مریاں نے حرامی بچے کو جنم دے بھی دیا تو کیا فرق پڑتا ہے!

www.iqbalkalmati.blogspot.com

خواہ مخواہ بچہ ضائع نہ کرواشادو۔ گناہ سر نہ لے ۔ اپنے یہاں حویلی میں پل بلا جائیگا۔"

"نہ جی نہ ۔۔۔ اللہ رسول کا گناہ سر آنکھوں پر ۔۔۔ دُنیا کی نموشی ہم دونوں برداشت نہیں کر سکتیں ۔۔۔ ایک ہی چیز تو کمائی ہے ساری عمر ۔۔۔ لے دے کر عزت اور ہم لوگوں کے پاس ہے کیا ؟"

ان دِنوں چودھرائن کا اونچے بانسے والا ناک تھا۔ اس میں بڑا لونگ ابھی ڈھیلا نہ ہوا تھا۔ رنگت جوں ۔۔۔ للاری نے گلابی رنگ میں چٹکی بھر موتیا کی بھی ملا دی تھی۔ چوہدری جب سیاہ عربی گھوڑے سے اتر کر اندر آتا تو چودھرائن گھوڑے کے سر سے اُونچی نظر آتی۔ چودھرائن تو شالے کے نسرے ہوئے کھیت کی طرح ہریالی ہی ہریالی تھی۔ پھر ایسی بے داغ زندگی ۔۔۔ نماز روزے کی پابند ۔۔ کمان سے نکلے ہوئے نشانے پر لگنے والے تیر کی طرح اس کی ساری زندگی بے خطا تھی۔ اسے یہ ضرور علم تھا کہ غریبوں کی زندگی مشکل گزرتی ہے لیکن اس ذلت آمیز زندگی میں وہ اپنے آپ کو عزت دار بھی سمجھتے ہیں۔ اس کا اسے علم نہ تھا! بھلا جو پلا ہی دلدر میں ہو اسکا عزت نفس سے کیا تعلق ؟

"مجھے بچالیں چودھرائن مجھے میری مریاں کو بچالیں ۔۔"

"اس کا باپ کون ہے ؟ ۔۔" چودھرائن نے کڑک کر پوچھا ۔۔ "میں اس کا قیمہ کروا دوں گی ٹوکے سے۔"

چودھرائن نے یہ بات کچھ اس خیال سے نہ کی تھی کہ کسی نوجوان نے مریاں کی زندگی برباد کر دی تھی بلکہ چودھرائن کا خیال تھا کہ ان کے ہوتے ہوتے وہ کون خودسر تھا جس نے سرحدیں پار کرنے کی کوشش کی تھی ؟ بھلا وہ کون تھا جو حویلی کی مہر حاصل کیے بغیر اپنا قانون آپ بنانے لگا تھا۔ رسہ گیری کا حکم حویلی سے ملتا تھا۔ موکھا توڑنے کی اجازت یہاں سے ہوتی تھی۔ گاؤں کی بہو بیٹیاں ان کی ایما پر خرد برد ہوتی تھیں۔ پھر یہ کون تھا ؟ جس نے ان سے پوچھا تک نہیں اتنی خودسری ؟ اتنی خودرائی ؟

"مریاں اس کا نام نہیں بتاتی سائیں"

"اتنی ہمدردی ہے اس سے ۔۔"

"کہتی ہے مر جاؤں گی لیکن اس کا نام نہیں بتاؤں گی ۔۔"

"پھر تو شادو مدد کرنا مشکل ہے۔ میں تو کل شام سے پہلے پہلے اس کا نکاح پڑھوا دیتی مریاں سے ۔۔"

"مریاں کہتی ہے چودھرائن ۔۔ وہ اس سے شادی نہیں کر سکتا وہ پہلے سے گھر والا ہے ایک سوانی کا ۔۔"

گاؤں کے سارے بیاہے ہوتے نوجوان چودھرائن کی نظروں میں گھوم گئے۔

بڑی دیر شادو چودھرائن کے پاؤں دباتی رہی۔ جب اٹھی تو صبح خیز مرغ کہیں کہیں بانگیں دینے لگے تھے۔

دوسری رات مریاں کال کوٹھڑی میں منتقل کر دی گئی۔ یہ کام بڑے خفیہ انداز میں فجر سے بہت پہلے کیا گیا پھر حسبِ معمول باہر قفل ڈال دیا گیا اور شادو پھرکی کی طرح دالان اور کوٹھڑیوں میں پھرنے لگی۔ بولتی چالتی تو وہ پہلے بھی کم تھی اب وہ کسی جگہ ٹکتی بھی نہ تھی ۔۔۔ وہ تمام تنائیں ٹوٹ چکی تھیں جن پر وہ اپنی مشقت کے دوران پل دو پل آرام کر لیا کرتی۔ رات گئے چودھرائن اور شادو پچھلی کوٹھڑی میں گئیں۔ پچھلے کچے دالان میں بڑی خاموشی تھی۔ کسی زمانے میں یہاں چودری کے گھوڑے باندھے گئے تھے۔ اسی رات بارش ہو گئی دالان میں اب بھی زمین پر کہیں کہیں ان کے سموں کے سوکھے ہوئے گہرے نشان تھے۔

کافی دیر کے بعد دروازہ کھلا۔ اس عرصہ میں شادو نے کئی بار سوچا کہ اس کی اکلوتی چاند سی مریاں کچھ کھا کر مر چکی ہے جس وقت مریاں نے دروازہ کھولا چودھرائن نے لالٹین اٹھا کر اس کا چہرہ دیکھا۔ آنکھوں میں تازہ نیند کی لالی تھی۔

"سو رہی تھی ؟ ۔۔"

"جی ——"

"تجھے نیند آگئی کمبخت —— تیرا ستیاناس مارا جائے تیری ہلکائی ہوئی ماں کی تو پلک نہیں جھپکی سارا دن۔"

مریاں چپ رہی —— وہ بھی ماں کی طرح چپ رہنا سیکھ گئی تھی۔

شادو اور چودھرائن دونوں کمرے میں داخل ہوگئیں اور دروازے کو اندر سے بند کر دیا۔ لالٹین کی روشنی میں سارے کمرے کی شکل آسیب زدہ ہوگئی۔ ڈھیلی چارپائی پر کھدر کی پھولدار سرخ رضائی پڑی تھی۔ نیچے ایک پرانی چٹائی پر کپڑوں کی گٹھڑی تھی جسے شاید مریاں نے سرہانے کے طور پر بھی استعمال کیا تھا۔ کمرے کے ایک کونے میں گھڑا گھڑے پر چھابہ۔ اور ایک طرف ایک پرانا لوٹا پڑا تھا۔

"کون ہے وہ مرجانا —— اوترا نکھترا ——" چودھرائن غرائی

مریاں چپ رہی۔

پورے ہاتھ کا زناٹے دار تھپڑ چودھرائن نے مریاں کے منہ پر ایسے مارا کہ شادو کے دانت بجنے لگے اس نے آج تک مریاں پر کبھی ہاتھ نہ اٹھایا تھا۔ ویسے بھی پوہ کی سردی میں اس کا گھسا پٹا سویٹر ناکافی تھا۔

"کون ہے بتا بول مر —— بھٹ -!"

مریاں چپ رہی —— گھنٹہ بھر کی بحث کے بعد منہ کھولا تو اتنا کہا۔ "وہ اپنے گھر میں راضی خوش ہے چودھرائن جی —— میں اس کا گھر تباہ نہیں کر سکتی اس کا بھی کیا قصور —— ہونی تھی پکڑ لیا ——"

"اور تو اپنی ماں کو تباہ کر سکتی ہے ——"

"جو اللہ کی مرضی —— میں تو کسی کو بھی تباہ نہیں کرنا چاہتی تھی چودھرائن جی۔"

"اچھا ابھی دائی بصری آئے گی۔ صبح تک اللہ نے چاہا تو صفائی ہو جائے گی۔ میں نے اسے بلا بھیجا ہے —— اور کان کھول کر سن لے مریاں اب اگر تو نے اس سے کوئی غرض رکھی تو جان سے مار دوں گی ——"

"نہیں جی —— وہ خود ہی بہت ڈر گیا ہے —— وہ کیوں مجھ سے کوئی غرض رکھے گا۔ اس نے آخر گاؤں میں رہنا ہے کہ نہیں۔"

رات بھر چودھرائن جاگتی رہی۔ دل اس کا بھی عورت کا تھا ایسی عورت جو دودھ بھی پلا رہی ہو اپنی رضائی گدا دری سب مریاں کو دی۔ مکھن دودھ شکر بادام سب کا منہ کھول دیا۔ دوسری رات عشاء کی اذان کے بعد شادو بھاگی اندر آئی لیکن چودھرائن کی بڑی نند عصمت کو گود میں لیے بیٹھی تھی شادو کچھ دیر چودھرائن کو بلانے والی نظروں سے دیکھتی رہی پھر چپ چاپ واپس چلی گئی۔

آدھی رات کے قریب بصری دائی نے آکر چودھرائن کو جگایا۔

"پیچھے چلیں شادو کو کچھ ہو گیا ہے ——"

چودھرائن ہڑبڑا کر اٹھی مریاں کو کچھ ہو جانے کے امکان تھے لیکن شادو کی خبر کے لیے وہ تیار نہ تھی۔

"بچے کو ہم نے دالان ہی میں دفن کر دیا تھا —— لیکن ——"

چودھرائن اور بصری دائی جب پچھلے کمرے میں پہنچیں تو مریاں آخری دم لے رہی تھی۔ کونے میں شادو لوٹے میں ٹھنڈا پانی بھرے اپنے کپڑوں سمیت نہا رہی تھی وہ سر پر لوٹا لے جاتی اور ٹونٹی سے دھار گراتی آہستہ آہستہ پانی اس کی چھاتی پیٹ اور کہنیوں پر رسنے لگتا۔ چودھرائن نے مشکل سے اس کے ہاتھ سے لوٹا چھینا لیکن مریاں کا سانس اس وقت اکھڑ چکا تھا۔ شادو نے مریاں کی طرف دیکھنا گوارا نہ کیا وہ کچے دالان میں بھاگ گئی اور کوٹھڑی کے آگے آگے چکر لگانے لگی۔ شادو اپنی عزت تو بچا چکی تھی لیکن اب اس کے پاس ایسا کوئی سہارا باقی نہ رہا تھا جس کی ٹیک لے کر وہ زندگی بسر کرتی۔ وہ سارا سارا دن

www.iqbalkalmati.blogspot.com

دیواروں کے ساتھ ساتھ دالانوں کے اندر گاؤں کے باہر گول گول چکر کاٹنے میں مشغول رہتی۔ جیسے چمگادڑیں شام کے وقت راستہ بھول کر اندروں میں آجاتی ہیں۔ اور ایک دیوار سے دوسری تک چکر لگاتی رہتی ہیں۔ کہتے ہیں جس رات چوری کے گھوڑے پچھلے دالان میں باندھے گئے ان میں سے ایک سفید گھوڑی ساری رات ایسے ہی دالان میں چکر لگاتی رہی تھی اور بارش میں کچی مٹی میں اس کے سموں کے نشان پڑ گئے تھے۔

مریاں کے مرنے کے پورے ایک ہفتے بعد مسجد کے پچھواڑے پر سے دروازے والا مکان خالی ہو گیا اس میں جان محمد رہتا تھا۔ اس نے اپنی ساری زمینیں اونے پونے بیچ دیں۔ داڑھی رکھ لی اور گاؤں چھوڑ کر چلا گیا جانے سے پہلے اس نے اپنے سارے کپڑے گاؤں والوں میں بانٹ دیئے — تسری چادریں بوسکی کی قمیضیں ملتانی کھسے۔ جس وقت وہ گڈ پر بیٹھ کر گاؤں سے رخصت ہوا اس کے جسم پر صرف ایک چار خانہ کھیس اور تہمد تھی۔ اس کی لاڈلی بیوی نے نیوی بلو برقعے کا نقاب اُٹھا کر کئی دفعہ اس کی طرف دیکھا لیکن جان محمد نے گلے سے وہ چاندی کا تعویذ بھی اتار پھینکا جو کئی سالوں سے اس کے گلے میں تھا۔

مریاں کے جانے کے بعد اس کوٹھڑی میں صرف ایک اور مہمان ٹھہرا — چودھرائن کو ادھر سے ہول آتا تھا۔ وہ کسی کو پچھلے دالان میں جانے تک نہ دیتی تھی۔ لیکن اسی اکتوبر میں چودھری کا بڑا پیارا کتا اکتوبر کے مہینے میں پاگل ہو گیا۔ چودھری صاحب کتے کو شہر سے لائے تھے لیکن پاگل پن کا ٹیکہ لگوانے میں غفلت ہو گئی ——

سنہرے بالوں والا چھوٹا سا پلا اسے تو رکابی میں سے دودھ بھی پینا نہ آتا تھا۔ عصمت کو تو کتا دیکھتے ہی اس سے عشق ہو گیا۔ سارا دن جھولی میں چھپائے پھرتی۔ چودھرائن لاکھ کہتی —— "دیکھ عصمت تیرے کپڑے ناپاک ہوتے ہیں —"

"ہونے دیں امی —— میں ناپاک ہی اچھی —"

عصمت نہ صرف لاڈلی تھی۔ بلکہ ایک حد تک چودھرائن اس سے ڈرتی بھی تھی۔ کالج میں

پڑھنے والی لڑکی کا ان پڑھ ماں پر قدرتی رعب ہوتا ہے جیسے دانشور کے بول بانٹ سے معمولی آدمی خوفزدہ ہو جاتا ہے۔ چودھرائن سب کو ڈانٹ ڈپٹ لیتی تھی۔ حتیٰ کہ چودھری صاحب بھی اس کی آمد پر گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جاتے لیکن عصمت کے سامنے چودھرائن ایسے پھرتی جیسے دبو کتا ٹانگوں کے اندر دم دبائے پھرتا ہے —— آواز بھی چودھرائن کی نرم پڑ جاتی اور اس کا جی چاہتا کہ کم از کم اپنے کھردرے ہاتھ تو کہیں چھپا ڈالے بغل کے اندر ہاتھ ڈال کر جب وہ بات کرتی تو بات میں زور باقی نہ رہتا ایک بے بسی سی آجاتی ——

کتا دیکھتے دیکھتے شیشے جڑے پلنگ جتنا اُونچا ہو گیا۔ عصمت نے اس کا نام جمی رکھا تھا۔ مزارع کمی کمین مستی سارے جمی کو لیے پھرتے تھے کیونکہ وہ چودھری جی اور عصمت کی گودیوں میں پلا تھا۔ اور جیسے یہ بات بہت اہم ہوتی ہے کہ بچہ کن گودیوں میں پرورش پاتا ہے ایسے ہی اگر مفید جانور بھی بڑے لوگوں کی گودیوں کا مزہ چکھ چکے ہوں تو ان کی اہمیت بڑھ جاتی ہے اور پھر ان سے پاکی پلیدی وابستہ نہیں رہتی۔ گاؤں کے دوسرے کتوں کو وہ پاس بھی پھٹکنے نہیں دیتے تھے۔ جمی تو انہیں انسان لگتا جو ساری باتیں چودھری صاحب کو بتانے کا اہل تھا۔

گرمی جا چکی تھی سردی ٹھیک طور پر آئی نہ تھی۔ جس روز بی۔ اے کا امتحان دے کر عصمت گھر آئی اسی رات کا واقعہ ہے کہ جمی نے رات کے وقت مزارع کو پنڈلی پر کاٹ کھایا۔ اس سے پہلے جمی حویلی میں آنے والوں کو بھونکا ضرور کرتا تھا۔ لیکن اس نے کبھی کسی پر حملہ نہ کیا تھا۔ مزارع خدا بخش کو تو اسی وقت ہسپتال روانہ کر دیا گیا لیکن خود جمی کا کہیں پتہ نہ تھا۔ پہلے تو چودھری صاحب نے خیال کیا کہ شاید خوفزدہ ہو کر کہیں چھپ رہا ہے لیکن جب پورا دن وہ نہ ملا۔ رکابی میں اس کا راتب اور آنگن میں اس کی سنگلی خالی رہی تو اس کو تلاش کرنے کے لیے کمی کمین نکلے — گاؤں میں یہ بات پھیل گئی کہ چودھری صاحب کا جمی پاگل ہو گیا ہے لیکن کوئی اونچی آواز میں یہ بات کرنے جوگا بھی نہ تھا۔ گاؤں والے دو دو تین تین کی ٹکڑیوں میں بڑے بڑے لٹھ لے کر جمی کی تلاش کو نکلتے تھے۔ حالانکہ عصمت کو یہی بات بُری لگتی تھی۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"بزدل کہیں کے ۔۔۔ کتّا ڈھونڈنے جاتے ہیں اور لاٹھیاں ساتھ لے کر جاتے ہیں وہ بیچارہ کسی کو کیا کہتا ہے اسی لیے تو ہمارا ملک ترقی نہیں کر سکتا۔ مردوں میں ہمت ہی باقی نہیں رہی۔"

سرکاری سوتے سے لے کر مائی سبھاگی کی جھگی تک رات گئے تک لالٹین لے کر سب تلاش کرتے رہے لیکن جمی کا کہیں پتہ نہ تھا۔ چاند کی آخری راتیں تھیں اور موسم میں ایک خاص قسم کی مستی تھی۔ مالٹے کے درختوں پر کچے مالٹوں پر ہلکا ہلکا غبار مٹی کا چڑھا تھا۔ اونچے اونچے گنّے کے کھیتوں میں رات گئے تک ٹڈیری بولتی تھی۔ آسمان بے داغ تھا۔ کہیں کوئی بادل نہ تھا۔ کہیں بارش کے آثار نہ تھے۔

پھر خشک سوتے میں بھاگتا ہوا جمی رات کے پچھلے پہر بابے سراج نے دیکھا۔ وہ نہ تو رات کو تہجد پڑھتا تھا نہ صبح فجر لیکن ایک عرصہ سے وہ تہجد کے وقت اٹھتا اور یہ گاتا ہوا سوتے کے ساتھ ساتھ چلتا رہتا۔

"جیہڑے ادب نئیں کردے ماواں دا
منہ کالا بے حیاواں دا
کہو لا الٰہ الا اللہ ۔۔۔ پڑھو لا الٰہ الا اللہ ۔۔۔"

جس وقت گھیر گھار کر جمی کو حویلی میں لائے اس کے منہ سے جھاگ نکل رہا تھا۔ لیکن بھوک اور بھاگ دوڑ کی وجہ سے وہ نڈھال بھی ہو چکا تھا۔ کسی کمّی میں یہ جرأت نہ تھی کہ وہ چودھری صاحب کے حکم کے بغیر جمی کو گولی مار دیتا اس لیے صبح کے وقت سب نے مل کر جمی کو حویلی کے پچھلے کمرے میں مقفل کر دیا اور اسباب پر خدا کا شکر کیا کہ کسی کو جمی نے کاٹا نہیں۔

جس وقت چودھری صاحب فجر کی نماز پڑھ کر فارغ ہوئے مقفل کمرے میں جمی بھونک بھونک کر دیوانہ ہو چکا تھا۔ اس نے وہ گھڑا توڑ دیا تھا جس سے آخری بار شادو نے اشنان کیا۔ چارپائی کے اوپر کھدر کی رضائی بوٹی بوٹی ہو گئی ۔۔۔ اور خود دروازے اور کھڑکی سے ٹکریں مار مار کر جمی کی سنہری پوستین لہولہان ہو چکی تھی۔ چودھری صاحب تو شاید خود بندوق سے جمی کو نشانہ بناتے لیکن عصمت شہر کی پڑھی لکھی تھی وہ جمی کو مارنے کا تصور بھی نہ کر سکتی تھی۔ چارپائی پر اوندھے لیٹ کر اس نے رو رو کر آنکھیں سُرخ کر لی تھیں۔

چودھرائن نے تو پہلے ہی حکم صادر کر دیا تھا کہ بندوق کھڑکی کی سلاخوں میں سے نکال کر جمی کا صفایا کر دو لیکن عصمت کی آنکھیں دیکھ کر دوبارہ حکم دینے کیلئے حوصلہ نہ پڑا۔

سارا دن جمی کے بھونکنے کی آوازیں آتی رہیں۔ پھر مغرب کے قریب یہ آواز بالکل بند ہو گئی۔ چودھری صاحب خود کئی بار مقفل کمرے تک گئے اور بند دروازے کی درزوں میں سے دیکھنے کی کوشش کی لیکن اندر اتنی چپ چپیتن تھی کہ ہر بار وہ دروازے کی چوکھٹ سے لوٹ گئے۔

عصمت کونونٹ کی پڑھی لکھی فیوڈل لڑکی تھی۔ اس کے ماحول نے اسے ہاٹ ہاؤس کے پھول کی طرح پالا تھا کالج کی تعلیم نے اس پھول کو کٹ گلاس کے گلدان میں سجا دیا تھا۔ عصمت کو آرام دہ آسائش بھری زندگی نے بڑا آدرشی بنا دیا تھا۔ وہ جانتی ہی نہ تھی کہ حویلی کے پار یا کالج کی دیوار کے اس پار چوری، بدمعاشی، زنا، فریب ہوتا ہے اس کا خیال تھا کہ غریبی اور اس سے متعلقہ تمام جرائم اس لیے ہوتے ہیں کہ حکومتیں ادھر کافی توجہ نہیں دیتیں۔ وہ گناہ کو انسان سے وابستہ کر ہی نہ سکتی تھی۔ اسے معلوم نہ تھا کہ دِل میں جیسے گندہ اور صاف لہو ساتھ ساتھ بہتے ہیں ایسے ہی ہر انسان کے اندر نیکی اور بدی ساتھ ساتھ پٹڑی کی طرح بچھی ہے جس پر بڑے توازن کے ساتھ زندگی کی گاڑی چلتی ہے۔ کچھ اللہ کے نیک بندے نیکی کی پٹڑی ایسی پختہ بنا لیتے ہیں کہ ان کی گاڑی ایک پہیے پر چلنے لگتی ہے لیکن ایسا ہونا کچھ سہل کام نہیں۔

اتنی آدرشی لڑکی کو یہ سمجھ نہ آئی کہ جمی کو مارنے کی کیا ضرورت ہے! اس نے پورا دن اور رات جمی کو دیواروں سے سر مارنے کے لیے چھوڑ دیا۔ صبح فجر کے وقت جب مؤذن نے اذان دی تو عصمت ننگے پاؤں پچھواڑے گئی۔ کہیں بھی کھٹکا کاڑکا نہ تھا۔ پچھواڑے آنگن میں ابھی تک

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سفید گھوڑی کے سموں کے نشان پکی مٹی میں دھنسے ہوئے تھے۔ پتہ نہیں عصمت کو کیوں یقین تھا کہ اگر جمی زندہ ہے اور دیوانہ بھی ہو چکا ہے تب بھی وہ عصمت کو نہیں کاٹے گا۔

عصمت نے پیچوں والے جندرے میں گول چابی پھرائی۔ تالا کھل گیا۔ تو وہ مامتا سے بھری آواز میں جمی جمی پکارتی دیوانہ وار کوٹھڑی کے اندر داخل ہوئی۔ لالٹین کے باوجود تھوڑی دیر تک اسے اندھیرے میں کچھ نظر نہ آیا پھر اچانک اس نے دیکھا سلاخوں والی کھڑکی کے عین نیچے وہ اوندھا پڑا تھا۔ اس کے نتھنوں سے خون بہہ بہہ کر دور تک جم گیا تھا اور اس کی خوبصورت آنکھیں نیم وا تھیں عصمت بے خوف جمی کے پاس جا بیٹھی۔ اس نے جمی کا سر اپنے زانو پر رکھا اور اپنے شفون کے دوپٹے سے اس کے چہرے کو صاف کرنے لگی۔ پتہ نہیں کیوں اسے کونونٹ کی انگریزی، سکول کی اردو اور گھر کی پنجابی بھول گئی اور وہ اپنی دادی کے ریاستی لہجے میں بولنے لگی "مرونجن شہدے علاج نہ کر سکدے ہن ایس غریب دا —" جب دن چڑھے چودھرائن اسے ڈھونڈتی ہوئی ادھر آئی تو وہ ابھی جمی کے آدھے دھڑ کو گود میں لیے ہولے ہولے اپنی دادی کے لہجے میں بین کر رہی تھی۔ جب چودھرائن منت سماجت کر کے عصمت کو ساتھ اندر لے گئی تو اسے ایسے ہلہلا کر بخار چڑھا کہ کئی ہفتے علاج کراتے رہے پھر آب و ہوا کی تبدیلی کے لیے چودھری صاحب خود عصمت کو کراچی لے گئے۔

جمی کے پاگل ہونے کے بعد عصمت کو گاؤں سے حویلی سے پتہ نہیں کیوں ڈر آنے لگا تھا۔ بیٹھے بیٹھے وہ ماں سے پوچھتی —" اماں میں پاگل تو نہیں ہو جاؤں گی —؟"

چودھرائن پہلے پہلے تو اسے لاڈ سمجھتی رہی پھر اس نے چودھری صاحب سے بات کی کہ عصمت شہدی کو شہر بھیج دیں جب تک اس کی شادی کا بندوبست ٹھیک طور پر نہیں ہوتا اگر یہ اپنے چچا شیر محمد کے گھر رہے تو اچھا ہے۔ ایم۔ اے میں داخلہ دلوانا چاہیں تو دلوا دیں لیکن پڑھی لکھی لڑکی کا گاؤں میں یوں ڈولتے پھرنا اچھا نہیں۔

عصمت کچھ عرصہ چچا شیر محمد کے پاس رہی پھر اس نے ایم۔ اے میں داخلہ لے لیا اور ماں باپ کی اجازت کے بغیر یونیورسٹی کے ہاسٹل میں شفٹ کر گئی۔

باپ کی اجازت کے بغیر یونیورسٹی کے ہاسٹل میں شفٹ کر گئی۔ چودھری صاحب جلد از جلد بیٹی کو نکاح میں دینا چاہتے تھے لیکن جوں جوں عصمت کی تعلیم بڑھ رہی تھی ماں باپ کا حوصلہ اس کے سامنے کم ہو رہا تھا۔ اب وہ کئی باتیں انہیں بتائے بغیر کر لیتی انہیں پتہ بھی چلتا لیکن وہ درگذر کرتے۔ وہ اس کے علاوہ اور کر بھی کیا سکتے تھے؟ عمر کے ایسے حصے میں داخل ہو چکے تھے جب اندر باہر آدمی ڈھیلا پڑنے لگتا ہے —

شادی تو عصمت کی بڑی آسانی سے ہو سکتی تھی کیوں کہ وہ عین مین چودھرائن کی جوانی کا نقشہ تھا — چودھری اور چودھرائن اس کے لیے کسی نسلی گھوڑے کی تلاش میں تھے۔ کسی کے سم میں نقص نکلتا کسی کی ایال درست نہ نکلتی کوئی دل کی چال میں فیل تھا کوئی پویا میں۔ عصمت کی ذاتی جائیداد کا یہ عالم تھا کہ شہری اور دیہاتی جائیداد اور دولت دس خاندانوں کو رئیسانہ زندگی گزارنے کی کفیل ہو سکتی تھی — لیکن سب سے بڑی مشکل یہی درپیش تھی کہ کہیں لالچی چالاک فریبی لوگ عصمت کو محض اس کی دولت کی خاطر بیاہ کر نہ لے جائیں۔

عصمت نے فقط وقت کٹی کے لیے ایم۔ اے میں داخلہ لیا تھا۔ لیکن ایم۔ اے فائنل میں پہنچ گئی اور کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔ لمبے ستواں ناک سانولی رنگت خوبصورت ہونٹوں والی لڑکی کو بر نہ مل سکا پھر جب وہ امتحان دے کر گھر لوٹی تو ہر وقت کھوئی کھوئی رہنے لگی۔ ابھی تک ماں باپ عربی نسل کا گھوڑا تلاش کرنے میں سرگرداں تھے۔ کسی کا خاندان گھٹیا تھا تو کسی کی جائیداد معقول نہ تھی۔ یہ اڑچنیں تو تھیں ہی لیکن اب سب سے بڑی پھلانگ یہ تیار ہوئی کہ لڑکا پڑھا لکھا بھی ہو کیونکہ لڑکی ایم۔ اے کا امتحان دے چکی تھی ادھر عصمت چپ کے دورانیے بڑھاتی جا رہی تھی ماں بیٹی میں واجبی سی بول چال رہ گئی تھی۔ ماں اسے بلاتی ڈرتی کیونکہ عصمت اگر انگریزی میں جواب دے دیتی تو پھر چودھرائن کو بات آگے بڑھانے کے لیے مشکل درپیش ہوتی۔ گاؤں کے معاملات میں عصمت کو کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ سارا دن اپنے کمرے میں بھاری بھاری پردے برابر کیے بیڈ لیمپ جلائے ایسے ناول پڑھتی رہتی جو شہر سے وہ اپنے ساتھ لائی تھی۔ ان رسالوں سے چھٹی ہوتی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تو وہ ڈیک پر ڈسکو میوزک سننے میں مشغول ہو جاتی۔ اس سے پہلے اسے غزلیں سننے کا شوق تھا اور اس کی ماں گو غزلوں کو سمجھتی نہیں تھی لیکن وہ موسیقار کی آوازوں کے سحر میں ضرور گم ہو جاتی تھی اس نئی موسیقی کی لے چال سے تو چودھرائن بالکل ناواقف تھی۔ اس کے علاوہ چودھرائن کو رفتہ رفتہ احساس ہونے لگا کہ پڑھی لکھی لڑکی اس کی صحبت میں فوراً اچاٹ ہو جاتی ہے اور پڑھتے پڑھتے اٹھ کر الماریاں ٹھیک کرنے، اپنے بال برش کرنے، خط لکھنے میں مشغول ہو جاتی ہے۔ اسی لیے چودھرائن نے عصمت کے کمرے میں آنا جانا قریب قریب چھوڑ دیا تھا۔ پھر سب سے بڑی اور اکلوتی وجہ یہ بھی تھی کہ چودھرائن اپنے اور بیٹی کے طور طریقوں میں کوئی مماثلت نہ پاتی تھی۔ عصمت چھری کے ساتھ تھوڑا سا مکھن ٹوسٹ پر لگانے کے بعد سارا دن مکھن کی شکل نہ دیکھتی۔ چودھرائن بل دار پراٹھے کو بھی مکھن کے ساتھ کھانے کی عادی تھی۔ عصمت کے لیے کوک کے کریٹ شہر سے آتے تھے چودھرائن ان بوتلوں کو دواء سمجھتی تھی۔ پہناوا بھی عصمت کا چودھرائن کو عجیب لگتا نہ ڈھنگ کی جوتی نہ حساب کا دوپٹہ نہ شرع سے ڈرنے والی قمیض — رفتہ رفتہ عصمت اور چودھرائن دو الگ الگ کیمپوں میں بٹ گئیں۔

لیکن جس روز عصمت کا اصل دِل پسند دُولہا تلاش کر لیا گیا اور منگنی کی رسم ادا ہو گئی اس رات بڑے زور کا گڑا برسا۔ ہزار تلاش کے بعد چودھری صاحب کی پھوپھی کا بیٹا ملا تھا یہ سپوت برسوں سے امریکہ میں تھا۔ اور ایم بی اے کرنے کے بعد وہیں ملازم ہو گیا تھا اچانک اس کی واپسی سے چودھرائن کا مسئلہ طے ہو گیا۔ یہ منگنی کی رات کا واقعہ ہے جب خاندانی زیورات کے ساتھ ساتھ نئے ہیروں کے سیٹ عصمت کے پلنگ پر بے جوڑ پڑے تھے کہ چودھرائن کو عصمت نے بڑے سادہ الفاظ میں بتایا کہ وہ ماں بننے والی ہے۔

"تو پھر تو منگنی پر کیوں مانی — بدبخت میں ان سب کو — میں چودھری جی کو کیا منہ دکھاؤں گی!"

عصمت کے جسم پر ابھی منگنی کا جوڑا تھا۔ اور اس کے چہرے پر کئی دِنوں کے بعد لپ سٹک

کی چمک تھی۔

"منگنی ٹھیک ہے ماں مجھے منگنی پر تو کوئی اعتراض نہیں —"

"لیکن اگر لڑکے کو پتہ چل گیا —"

"وہ اتنے برس امریکہ رہا ہے وہاں ایسی باتوں کا کوئی نوٹس نہیں لیتا آپ فکر نہ کریں؟

"تو..... تو..... تو اس شہدے کے ساتھ نہیں کر سکتی تھی جب اتنا بڑا قدم اٹھا ہی لیا تھا تو اللہ رسول کے حکم کی پابندی ہو جاتی!"

عصمت نے منہ پھیر کر آہستہ سے کہا "اس کی پسلی نہیں ہے اماں — وہ شادی نہیں کروا سکتا۔"

"ہائے میرے اللہ تو نے تو ہمیں دو کوڑی کا نہ چھوڑا عصمت..... جو پھوپھی کو پتہ چلا تو کیا وہ منگنی رہنے دیں گی!"

"آپ مجھے ایک بار اعجاز سے ملنے دیں وہ منگنی نہیں توڑیں گے..... آپ فکر نہ کریں۔"

پتہ نہیں کیوں چودھرائن سناٹے میں آ گئی اس نے ایک زناٹے دار پورے ہاتھ کا تھپیڑ عصمت کے منہ پر مارا اور چلائی "بول کون ہے وہ کمبخت..... بول بتا — تیری جرأت کیسے ہوئی تجھے ہمت کیسے پڑی —"

چودھرائن کے سامنے اس کی ساس کھڑی تھی۔ عصمت ویسے ہی ڈانگ کی ڈانگ کھڑی رہی نہ اس کا چہرہ بدلا نہ تھپیڑ کے کوئی آثار اس کے چہرے پر آئے۔ وہ انگریزی اردو اور پنجابی اچھی طرح جانتی تھی لیکن پتہ نہیں کیوں ایسے لمحوں میں وہ اپنی دادی کی زبان بولنے لگتی۔

"کدی توں کسے شہدے نال پیار ناں کیتا آئی اماں تینوں کی پتہ —— اپنا آپ وارنا کی ہندا آئی —"

چودھرائن کی اپنی بولی یہ نہ تھی۔ وہ اپنی ساس کو سامنے کھڑا پا کر خاموش ہو گئی۔ بڑی دیر کے بعد بولی۔

"تجھے پتہ نہیں تھا کہ تیرے باپ کا اُونچا شملہ ہے اور وہ کسی حرام کے پلّے کو پال نہیں سکتا۔"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

عصمت ویسے ہی کھڑی تھی۔ کندھوں پر سُرخ پھلکاری اوڑھے ——— ہونٹوں پر باسی لپ سٹک جمائے اس کی آنکھوں کے دیئے بڑے روشن تھے جیسے وہ زندگی سے ہر قسم کی آس لگائے ہو۔ اسے چہرے سے ذرا سی بھی شکستگی ظاہر نہ تھی۔

"میرا تو خیال تھا اس گھر میں اتنے گھوڑے، اتنے کتے، اتنی بھینسیں پل رہی ہیں میرا بھی بچّہ پل جائے گا ——— ایک اور لاوارث سے کیا فرق پڑتا ہے۔" عصمت نے جملہ مکمل نہ کیا۔

پچھلا کمرہ خود بڑی رازداری کے ساتھ رات کے پچھلے پہر چودھرائن نے تیار کیا۔ اور بھری دائی کے آنے سے گھنٹہ بھر پہلے عصمت کو وہاں منتقل کر دیا گیا۔

جس وقت عصمت اور بھری نے اندر سے دروازہ بند کیا اور چودھرائن نے باہر تالا ڈالا۔ اس کے بعد جیسے چودھرائن پر شادو کی روح طاری ہو گئی ——— وہ کچے آنگن میں گول گول چکر کاٹنے لگی اس کے ہونٹوں پر ایک ہی دُعا تھی ——— "یا اللہ میں تجھ سے ایک ہی دُعا مانگتی ہوں میری عزّت بچ جائے ———"

یہ پچھلا آنگن بالکل کچّا تھا۔ لیکن موسموں نے اس کی کچّی مٹّی کو مضبوط اور پکّا کر دیا تھا اس پر ایک سفید گھوڑی کے سموں کے گہرے نشان تھے۔ ان نشانوں میں اونچے نیچے پاؤں دھرتی دونوں ہاتھ کبھی آسمان کی طرف اٹھاتی کبھی سینے پر مارتی چودھرائن ایک ہی دُعا مانگے جا رہی تھی۔

کہتے ہیں دُعا مانگنے کا سلیقہ بھی کسی کسی کو ہوتا ہے۔

سنتے ہیں جب عصمت کو نہلا دھلا کر میّت کی چارپائی پر ڈالا۔ تو چودھرائن پچھلے آنگن میں پرانے گھڑے سے کپڑوں سمیٹ نہانے میں مصروف تھی! پتہ نہیں کب چودھری صاحب اسے اپنے کھیس کی بکل میں لپیٹ کر اندر لائے اور کب ان کی عصمت ہمیشہ کے لیے حویلی سے رخصت ہو گئی؟ لیکن کہتے ہیں کہ اس روز ایسی بارش ہوئی ایسی بارش ہوئی کہ پچھلے آنگن سے پرانے سموں کے تمام نشان ہمیشہ کے لیے صاف ہو گئے ———

مشک نافہ

پہلے آسمان پر مسکراہٹ برابر بدلی آئی پھر موسلا دھار قہقہے برسنے لگے۔

یونہی بدرنگ سی بدلی۔ پھر خدا جانے کیسے وہ نیچے اُترتی چلی آئی اور آتے آتے گھنگھور گھٹا بن کر یوں چھاجوں برسی کہ گھر والے تار پر سے گیلے کپڑے نہ اُتار سکے۔ بدلی کی طرف کسی نے نگاہ اُٹھا کر نہ دیکھی اور جب وہ دل بادل بن کر گرجی تو اندر باہر سب پھوار کی زد میں آ گئے۔

جس وقت آمنہ چھوٹا سا سوٹ کیس لے کر کار کی پچھلی سیٹ سے اُتری تو یوں لگا شہتوت کی باریک چھڑی کو کسی نے چکن کا پاٹ باندھ دیا ہے۔ وہ ساری کی ساری کملائی ہوئی مرجھائی ہوئی بغیر پانی کے گھاس ایسی مُرمُردہ تھی۔ صرف اُس کے کولہے چار بچوں کی ماں جیسے پلے ہوئے تھے۔ باقی سب کچھ راشن پر۔ بولتے وقت اس کا رنگ فق ہو جاتا۔ بیٹھتی تو ہر زاویے سے اس کے کولہے اُسے نظروں کے سامنے رکھتے۔ آمنہ میں وہ کچھ نہ تھا جس سے خوبصورت عورتیں بنتی ہیں، لیکن اس میں شاید وہ سب کچھ تھا جو اُسے یادگار عورت بنا سکتے تھے ———

یہ گھر ہاتھیوں اور چیونٹیوں کا تھا۔ کبھی ہاتھیوں کے پاؤں تلے چیونٹیوں کا بھون آ جاتا۔ کبھی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کبھار چیونٹی رینگتے ہاتھی کی سونڈ میں پہنچ جاتی۔ تین منزلوں میں بسا ہوا کنبہ اور ایسی بھانت بھانت کی بولیاں بولنے والا گلشن دیکھتے ہی دیکھتے اُجڑے ہوئے مندر کی طرح ہو گیا جس میں رات کے سمے چمگادڑیں اُلٹی لٹکی ہوں۔ ہوا ٹوٹے پٹ بجاتی ہو اور طاق سے گزرنے والی ہوائیں سیٹیاں سناتی دیں۔

یہ بڑی ماں کا پرُوار تھا۔ بیٹے بیٹیاں، بھانجے بھتیجے، بہنیں، نندیں، بھابیاں، دیورانیاں، جٹھانیاں سب اس گھر میں آنے جانے والے ہوا کے جھونکے تھے۔ چھوٹے بڑے لمبے کھلے منہ بند سانس بند۔ صبا، نسیم، شمیم آندھی، طوفان، جھکڑوں کے ننھے ننھے بچھنے،

بڑی ماں باہر دالان میں تخت پوش پہ بیٹھی اندر باہر خالی خالی نظروں سے دیکھتی اور سوچتی یہ کس کا گھر کا ہے؟ میں یہاں کیوں چوکیدار سے کو بیٹھی ہوئی ہوں؟ تخت پوش سے اندر وہ کمرہ نظر آتا تھا۔ جہاں وہ شادی کی رات پہلی بار اُتری تھی۔ وہ بڑا پلنگ جس پر مچل مچل کر پٹیاں پکڑ پکڑ کر اس نے سات بچے جنے تھے ـــــ وہ سات بچے کہاں تھے؟ اتنا درد زہ اٹھانے کے بعد اتنے برسوں انہیں پالنے پوسنے کے بعد وہ سائے کے سائے کہاں گئے؟ بچیوں کو اُس نے ہاتھوں بیاہ دیا۔ بیٹے اسی گھر میں ہے، پہاڑ اوجھل نہ ہوئے پر آنکھ اوجھل ضرور ہو گئے۔

یہ سب کچھ کیا تھا؟ وہ کہاں سے آئی تھی۔ اُسے کہاں جانا تھا؟ اس کے ساتھ کون تھا؟ اس کے ساتھ کبھی کوئی تھا بھی کہ نہیں؟ ساری عمر اُس نے اپنے شوہر کی بڑی سیوا کی۔ باورچی بنی، جھاڑو بہارو، سینا کترنا .... لیکن شوہر کے دل کی کوئی کھڑکی نہ کھلی لے دے کے جب کبھی کوئی ناکام عشق ہو چکتا تو کچھ وقفے کے لئے وہ دم دلاسا دینے کو اس کے قریب ہو جاتی۔ شوہر کے ساتھ اُس کا تعلق ایسا تھا جیسے بہت بھوک لگنے پر کوئی دال روٹی بھی رغبت سے کھالے۔

عمر کے بوجھ سے ٹوٹے ہوئے تناور درخت کو دیکھ کر وہ سوچتی۔ یہ غرّاٹے کرنے والا، پٹھوں کو مالش کراتے وقت ہائے ہائے کرنے والا یہ بڈھا آدمی کون ہے؟ ساری زندگی اتنے بڑے خاندان کا بوجھ اُٹھانے والا یہ بدنصیب کون تھا؟ وہ اُٹھ کر اس کے پاس جانا چاہتی، لیکن بڑھاپے نے خود اس کی کمر توڑ دی تھی۔ ساری عمر رنگ رنگ کے اندھے شیشے اُن کے درمیان رہے اب بڑھاپا آخری دوری بن کر اُن کے درمیان پھیل گیا تھا۔ یہ سارا کارخانہ! ـــــ یہ گھر کی چکی جس کا ایک پاٹ وہ خود اور دوسرا پاٹ وہ بدنصیب تھا۔ یہ چکی کب سے چل رہی تھی، جیسے کوئی مکڑی کا جالا ہوا میں ڈولتا پھرے اسی طرح اُس کا دل سائیں سائیں کرتے گھر میں بے مصرف ہلکورے لیتا۔ کسی کونے میں چپک جانے کی اب اُس میں ہمت باقی نہ رہی تھی، کیونکہ دل بھی اُس کے جسم کی طرح بے ہمتا ہو گیا تھا۔

اُس کا کونسا گھر تھا، وہ مائیکہ چھوڑ کر سسرال کس کے پاس آئی تھی؟

وہ اُن باتوں کو سننا چاہتی تھی۔ جو اُس سے پرے کی جاتی تھیں اور اُن سے غافل رہتی تھی جو اس کے سامنے ہوتی تھیں۔ وہ کون تھی ـــــ وہ کس کا حق تھی؟ کس کی امان تھی؟ ٹوٹے پر والی کبوتری کی طرح وہ سارا دن آنگن سے برآمدے، برآمدے سے کمرے تک اپنی ہی تلاش میں گھومتی رہی ـــــ پھر آسمان پر ایک چھوٹی سی بدلی چھا گئی۔ بالکل بیسہ برابر۔ یہ بدلی آمنہ تھی۔

آمنہ کے آنے کے پورے دو مہینے بعد ماں جی کے دونوں بڑے بیٹوں میں بول چال بند ہو گئی۔ آمنہ کیوٹیکس لگانے کے لیے ہمیشہ اُوپر جانے والی آخری سیڑھی پر بیٹھ جاتی تھی۔ اس طرح اُس کی پشت دیوار کے ساتھ اور اُس کے کولہے سیڑھی سے آدھے اُترے ہوئے نظر آتے۔ جلیل کا کمرہ تیسری منزل پہ تھا۔ جب آمنہ پرانی کیوٹیکس ادھیڑنے اور نئی پالش جمانے کے لئے ننھے ننھے روئی کے پھاہے۔ سیڑھیوں پہ پھینکتی تو کئی بار جلیل کو اُوپر سے نیچے اور نیچے سے اُوپر جانا پڑتا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"معاف کیجئے"

سیڑھیاں اُترتے ہوئے جلیل کو کہنا ہوتا۔

آمنہ اپنے زرد زرد سے سڈول پاؤں پیچھے کر لیتی ـــ اور کھڑے زانو سے موافت کے فاصلے پر جلیل دم بخود اُتر جاتا یا چڑھتا چلا جاتا۔

قدیر نچلے کمروں میں رہتا تھا، لیکن آمنہ جب کیوٹیکس لگانے بیٹھتی اُسے دوسری منزل میں کوئی کام یاد آ جاتے۔ وہ بھی عینک کو درست کرتا بغلوں کی تیز خوشبو چھوڑتا۔ چپ چاپ اُوپر نیچے آتا رہتا۔ آمنہ کے پاس سے گزرتے ہوئے لحظہ بھر کو اس کے نتھنے رونے والے ہو جاتے اور پھر وہ FASTING BUDHA کی طرح کہیں اندر غائب ہو رہتا۔

قدیر اور جلیل کے تعاقب میں اُن کی بیویاں یوں رہتیں جیسے دن کے پیچھے رات لگی رہتی ہے۔ وہ اپنے شوہروں کی زندگی میں چانن تو نہیں کر سکیں تھیں ہاں انہیں اس بات کا اچھی طرح سے احساس دلا دیا تھا کہ زندگی جیل سے کم نہیں، ایسی جیل جس سے چھوٹ کر کبھی کوئی آدمی گھر نہیں جاتا۔ شوہر عمر قید اور بیویاں عمر بھر پہرے کے لئے آپس میں جڑ گئے تھے۔

پہلے جلیل کی بیوی نے بڑی ماں سے شکایت کی "بڑی ماں آپ آمنہ کو ہوسٹل میں کیوں نہیں بھیج دیتیں۔ دیکھیں ناں کتنے جوان لڑکے ہیں۔ لڑکی کی آخر بڑی ذمہ داری ہوتی ہے ـــ"

جلیل کی بیوی کو یہ فکر تو نہ تھا کہ جوان لڑکے لڑکیوں کے ساتھ کیا کرتے ہیں۔ البتہ اُسے جلیل کی طرف سے ایک دھڑکا پیدا ہو گیا تھا۔ جلیل اب دفتر سے لوٹ کر سیدھا پلنگ پر لیٹ جاتا۔ پھر شام گئے جب وہ اُٹھتا تو اس کا چہرہ تروتازہ لگنے کے بجائے اور بھی تھکا تھکا بے جان نظر آتا۔

"آپ کسی ڈاکٹر کو دکھائیں جی آپ کی صحت ٹھیک نہیں ہے۔"

"بس دفتر میں کام زیادہ ہے۔"

کسی سیر تفریح پر جلیل کا دل مائل نہ ہوتا۔ بس جب وہ سیڑھیوں پر بیٹھی آمنہ کو دیکھ لیتا تو تھوڑی دیر کے لئے اُس کے نتھنے خوشی سے پھیل جاتے۔

دوسری شکایت قدیر کی بیوی نے کی۔

"بڑی ماں ـــ اس کو ہمارا گھر پسند نہیں ہے آپ اسے اصرار سے یہاں نہ رکھیں ہوسٹل جانے دیں۔"

"بڑی ماں تڑپ کر بولیں" ہائے سب میری بھانجی کے خلاف ہو گئے ہیں۔ اتنا سارا پروار لیتا ہے۔ یہاں ایک مسکین بے گھر لڑکی کو سہارا نہیں مل سکتا ـــ اُس کے لئے دو روٹیوں کا کال ہے اس گھر میں۔"

"دیکھ لیں آپ ماں جی ـــ"

"کیا دیکھ لوں میں! بتاؤ میرا اپنا ہے کون میرے میکے گھر کا ایک فرد اس گھر میں آ کر رہا ہے اور سب کے کان کھڑے ہو گئے ہیں کتنے برسوں کے بعد مجھے اتنی اجازت بھی نہیں؟"

"ہائے ماں جی کیسی باتیں کرتی ہیں آپ ـــ" قدیر کی بیوی روہانسی ہو کر بولی۔

"بے چاری کا ہے کون اس دُنیا میں باپ بیچارہ شیدا مر گیا۔ ماں دائم المریض۔ کچھ پڑھ لکھ کر کمانے جوگی ہو جائے گی تو ماں کا بوجھ بھی اُٹھا لے گی۔"

"جی اللہ کرے نیک نصیب ہوں کوئی اچھا بر مل جائے اپنے گھر کی ہو جائے" قدیر کی بیوی خوفزدہ ہو کر بولی اُسے بڑی فکر تھی کہ آمنہ اپنے گھر کی ہو جائے۔

"اللہ کرے ـــ اللہ کرے پر کیا پڑا ہے شادی میں ـــ بچے پر بچہ جنتے جوانی گزر جائے گی اور بچے پر بچہ کھوتے بڑھاپا آ جائے گا کیا پڑا ہے شادی میں ـــ اپنا کمائے کھائے موج سے رہے۔"

"آپ ایسی باتیں اُس کے دماغ میں نہ ڈال دیں ماں جی ـــ ہمارے ملک میں بھلا گزارہ ہوتا ہے مرد کے بغیر ـــ"

"اکیلی عورت کو موہبت ——" بڑی ماں نے آنگن میں نظریں پھرا کر کہا۔

یہ سب کیا تھا؟ اتنی گہما گہمی کے باوجود اتنی اُداسی کیوں تھی۔ دن کے وقت بھی اندھیرا سا کیوں چھایا رہتا تھا؟ اندھیرا بھی ایسا جس میں سب کچھ نظر آتا، لیکن کچھ ایسے کہ پتہ نہ چلتا کونسی چیز کیا ہے؟ وہ یہاں کیوں چوکیدارے کو بیٹھی تھی؟ اس کا اپنا گھر کہاں تھا؟ گھر جانے کے لئے کونسی گھڑی کونسا وقت مقرر تھا؟ جن دنوں وہ جوان تھی اور اکیلی تھی تو کیسے اُسے ہر موڑ پر سب بیگانے ہو کر ملتے تھے اور اب وہ بھرے پُرے پروار میں ٹوٹی کرسی کی ٹانگ جیسی بیکار پڑی تھی۔ کسی طرف سے اپنے پن کی خوشبو نہ اُٹھتی تھی۔ ہر کمرے میں ہر کرسی میں ہر پیڑھی پر اپنے بیگانہ وار بیٹھے تھے۔

پتہ نہیں اندر ہی اندر کچھ تھا بھی کہ نہیں ہو سکتا ہے کہ قدیر کی بیوی کے وسوسے بے بنیاد نہ ہوں،—— بظاہر گھر کی سطح جھیل کے پانیوں کی طرح پُرسکون تھی۔ صرف اب قدیر اپنی بیوی کی ہر بات پر نکتہ چینی کرنے لگا تھا۔

"یہ آج کیا پکایا ہے؟"

"کالی توری"

"صبح کا سالن ہوگا"

"نہیں جی ابھی پکایا ہے سالن شام کو"

"فریج میں رکھ دیا ہوگا۔ ہے نا ——"

"نہیں تو جی"

قدیر کی بیوی دبکی رہتی۔ اُسے اب قدیر سے بات کرتے ہوئے خوف سا آتا تھا۔ وہ سارا دن اسی خوف میں بڑے بڑے وہموں میں اس درجہ اُلجھی رہتی کہ کئی کام آپ سے آپ غلط بھی ہونے لگتے۔ پھر ان غلط کاموں پر ٹھیک کا پردہ ڈالنے کے لئے مزید کئی غلطیاں ہوتیں کئی اور جھوٹ بولنے پڑتے۔

"میرا پاجامہ دھو دیا تھا؟"

قدیر کی بیوی کا رنگ فق ہو جاتا۔ وہ ہاں اور نہیں کے درمیان لٹکی رہ جاتی۔

"وہ جی میں دھونے لگی تھی پر ڈاکیا آ گیا اُسی وقت رجسٹری لے کر۔ اُوپر سے ابّا جی نے شور مچا رکھا تھا کہ کوئی IODEX مل دو میرے گھٹنے پر۔"

"یعنی کہ پاجامہ نہیں دُھلا؟"

"میں جی بتا رہی ہوں کہ ——"

"مجھے EXPLANATION نہیں چاہیئے۔ سیدھا سا سوال ہے پاجامہ دُھلا ہے کہ نہیں"

"نہیں جی ——" عادی مجرم کی طرح قدیر کی بیوی کی گردن ڈھلک جاتی۔ پھر وہ دل ہی دل میں اپنے آپ کو نوکروڑ گالیاں دیتی، ٹھیک ہی تو ہے جو مجھ سے یوں کھنچے رہتے ہیں کوئی کام اُن کا مجھ سے ہوتا بھی ہے ڈھنگ سے ایسی تو میری ماں نے تربیت کی ہے میری شادی کا علم سکھاتے نہیں اور شادی پکڑ کے کر دیتے ہیں یہ قصائی ماں باپ۔ وہ پلنگ پر اوندھی لیٹ کر کتنی کتنی دیر خود رحمی میں مبتلا ہو کر روتی رہتی۔

خدا جانے آمنہ کے ساتھ جلیل اور قدیر کا کچھ تعلق بھی تھا کہ نہیں خدا جانے یہ شور و غل صرف ان کی سائیکی میں رچ رہا تھا۔ دراصل بات صرف اتنی تھی کہ ایک نئی لڑکی گھر میں آئی ہوئی تھی۔ پھر ایک روز بڑے زور کا دھماکہ ہوا —— سب کھانا کھا رہے تھے کہ جلیل اور قدیر سیاسی بحث کرتے کرتے مینڈھوں کی طرح اُلجھ گئے۔

پہلے سن پینسٹھ کی جنگ پر بحث ہوئی۔ آمنہ کے آنے سے پہلے جلیل اور قدیر ہم خیال تھے کہ سن پینسٹھ کی جنگ میں پاکستانی بے جگری سے لڑے اور اُن کا جذبہ قابلِ قدر تھا۔ اب اُن دونوں میں جانے کیا خمیر لگ چکا تھا کہ دودھ علیحدہ اور پانی الگ ہو کر ایک دوسرے کو گھور رہا تھا۔

"یہ مسلمان قوم کا جذبہ ہے بھائی جی سترہ دن تو چلتا ہے سترہ سال نہیں چلتا ——"

قدیر نہ اپنی بہادری کا قائل رہا تھا نہ اپنے جذبے کا۔ اُسے تو سرے سے مسلمان قوم پر سے ہی اعتبار جاتا رہا تھا۔

"مسلمان ہمیشہ مصیبت پڑنے پر متحد ہو جاتا ہے۔ بڑی سے بڑی قربانی دینے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔"

آمنہ جلیل سے ایک کرسی چھوڑ کر بیٹھی ہوئی تھی اور ہر بار ڈش اُٹھا کر جلیل کی طرف بڑھا دیتی تھی۔

"مسلمان کا CALIBRE تباہ کن حد تک بگڑ چکا ہے۔ اس کی MORAL VALUES نہیں رہیں اس کی EMOTIONAL IDENTITY ختم ہو چکی ہے بھائی جی۔ مشکل یہ ہے کہ ابھی تک ہم اپنا تشخص نہیں کر سکے ہمیں یہ معلوم نہیں کہ پاکستان کیوں بنا؟ اس کی بقا کیوں ضروری ہے۔"

"تمہیں معلوم نہیں۔ باقی سب کو معلوم ہے۔" شان سے جلیل نے آمنہ کی طرف دیکھ کر کہا اور ون اپ ہو گیا۔ جلیل اور قدیر کی بیویاں کھانا بہت آہستہ آہستہ کھا رہی تھیں۔ اُن کے نوالے اُن کے حلق میں پھنسنے لگے تھے۔

آمنہ ہاتھ دھونے کے لئے اُٹھی تو بحث نرم پڑ گئی۔ وہ واپس آئی تو سن ۷۱ء کی جنگ کا ذکر ہو رہا تھا۔

اس جنگ کے بعد دونوں بھائی متفقہ طور پر اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ جنگ ۷۱ء دراصل بیرونی ممالک کی خود غرض ضرورتوں کو پیشِ نظر رکھ کر لڑی گئی۔ اس جنگ کو لڑانے، جتانے اور ہمارے لئے ایسی بے شرمی کا باعث بنانے کے لئے نہ ہماری ذاتی کوتاہیاں، نہ ہندوستان کی اسلام دشمنی، نہ بنگالی زود رنجی کافی تھی، اس جنگ کو اتنے بڑے المیے میں تبدیل کرنے والے چند بڑے ملک تھے۔

واپسی پر آمنہ کے ہاتھوں میں آم کی بھری ہوئی پلیٹ تھی جو اس نے قدیر کے سامنے رکھ دی اور خود بھی قدیر کے پاس والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ جونہی اُس نے پہلا آم کاٹ کر قدیر کو پیش کیا جلیل کے نظریوں میں تپش آ گئی۔

"کسی حرامزادے مُلک کی جرأت ہے کہ ویت نام کے مسئلوں میں دخل دے، کسی ماں کے خصم بڑے ملک کی مجال ہے کہ چین کے معاملات میں دخل دے۔ ایک لے دے کے ہم ہی ایسے نامرد رہ گئے ہیں کہ ہر بڑا ملک جو چاہتا ہے۔ ہمارے ساتھ کرتا ہے۔" اس کے بعد انہوں نے دو تین بڑی ثقہ قسم کی گالیاں اپنے آپ کو اور پاکستانیوں کو دیں۔ جلیل کی بیوی ڈرتے ڈرتے کھانسی۔

قدیر اب آم کی گٹھلی مزے لے لے کر چوس رہا تھا۔ اُس نے کنکھیوں سے ایک بار آمنہ کی کیوٹکس لگی انگلیاں دیکھیں اور پھر شیر ہو گیا۔

"کیا بات کرتے ہیں آپ بھائی جی۔ پاکستانیوں نے کوئی ظلم نہیں کئے۔ بنگلہ دیش میں یہ سب فارن پریس کے کرشمے ہیں۔ جو صدیوں سے اسلام دشمن ہے۔ اسلام دشمنی میں تو آپ کو پتہ ہے کہ عیسائی اور یہودی تک یکجان ہو جاتے ہیں پھر وہ ہندوؤں کے ہم زبان کیوں نہ ہوں گے۔"

اب جلیل پرسنل سطح پر آ گئے۔

"تمہاری کھوپڑی چھوٹی ہے اس لئے تم ہر مسئلے کو چھوٹی دوربین سے دیکھتے ہو! تم میں باتوں کی تہہ کو پہنچنے کی صداقت نہیں ہے۔"

"معاف کیجئے ضروری نہیں کہ ہر تربوز کے اندر رس بھی میٹھا ہو۔"

قدیر چھوٹا تھا۔ عمر میں، قد میں، تعلیم میں ___ لیکن آمنہ کے سامنے یوں کتر بیونت کرواتے ہوئے بڑی شرم آ گئی۔

"مسلمان خود نکمّے، کاہل، وقت کی ضرورتوں کو نہ سمجھنے والے ہیں۔ ذرا اُن کو دولت میسّر آ جائے۔ کبھی یہ ہسپتال نہیں بناتے۔ کبھی کوئی لائبریری تعمیر نہیں کرتے۔ کسی یتیم خانے

کسی رفاہی کام کے لئے ان کی دولت نہیں ہے۔ یہ تو ذرا ادھر دولت گھر میں آئی، ادھر دوسری شادی کا سوچیں گے۔ زانی، عیاش ——آوارہ——" قدیر چلایا۔

قدیر کی بیوی کے اندر ٹھنڈ پڑ گئی۔ کم از کم قدیر دوسری بیوی کو اچھا نہیں سمجھتے تھے۔

جلیل کو یہ تیر زہر میں بجھا ہوا لگا، کیونکہ پچھلے ہی دنوں اُسے دس ہزار کا بونس ملا تھا۔

"آپ کو خدا دولت دے گا تو آپ بھی یہی کچھ کریں گے بھائی جی——آپ بھی مسلمان ہیں۔ آپ بھی زانی ہوں گے۔ عیاش بنیں گے اور آوارہ کہلائیں گے۔"

اب جلیل نے آم سے بھرے چھلکوں کی پلیٹ پورے زور سے قدیر کی جانب چلادی۔ کمرے میں سناٹا چھا گیا۔ پلیٹ دیوار سے ٹکرائی اور دونوں بیویاں جلدی سے بھاگ کر کرچیاں اور چھلکے جمع کرنے میں مشغول ہو گئیں۔

بڑی ماں ٹیلی ویژن نہیں دیکھتی تھیں۔ ٹیلیویژن میں جو پروگرام ہوتے ہیں۔ اُن سے عموماً اُن کے من چاہے نظریوں کو بڑی ٹھیس پہنچتی تھی۔ ہر شام کو جب اُن کا بڈھا چھڑی لے کر لمبی سیر کو نکل جاتا اور شام کا اندھیرا دالان میں چھانے لگتا تو انہیں کمروں سے خوف آنے لگتا۔ ٹیلیویژن سے آنے والی آوازیں اور موسیقی عجیب قسم کا شور بن کر باہر دالان میں آتی۔ جب بڑی ماں جوان تھیں تو شام بڑے مقدس طریقے سے آیا کرتی تھی۔

پہلے سہ پہر آتی۔ سائے اور دھوپ کا رنگ بدلتا پھر ہولے ہولے قدم قدم پورے پورے سورج کی سواری چلتی۔ شیام روپی شام ملگجے اندھیروں میں لپٹی آتی۔ چڑیاں رین بسیرے لینے چلی جاتیں۔ آسمان پہ کوے ڈار در ڈار اُڑتے نظر آتے۔ گھاس پودے درخت سب سوگوار ہو کر رات کے منتظر ہوتے سہ پہر سے لے کر رات کے آنے تک بڑا لمبا وقت ہوتا تھا۔ نمازیں پڑھنے، چائے پینے، ملنے ملانے والیوں سے باتیں کرنے کے بعد بھی شام کا کچھ نہ کچھ بچ جاتا تھا، لیکن اب تو سرِ شام سارے گھر سے عجیب عجیب آوازیں آنے لگتیں۔ کہیں ٹیپ چلتے کہیں گیت گونجتے، کہیں ٹیلیویژن دھاڑتا، کہیں سکوٹر کار ریس دے کر شور مچاتی نکلتی۔

بڑی ماں کبھی ٹیلیویژن کے کمرے میں اور کبھی باہر ڈولتی پھرتی۔

یہ سب لوگ کیا دیکھتے رہتے ہیں؟ کیسے بھلے لوگ ہیں جن کا دل ایسی تصویروں سے ایسے شور سے بھر جاتا ہے؟

لیکن ٹیلیویژن والے نیم برآمدے نیم کمرے میں کچھ اور ہی رنگ رہتا تھا۔ آمنہ عموماً صوفہ کے ساتھ پشت لگا کر قالین پر بیٹھا کرتی کچھ ایسے رنگ ڈھنگ سے کہ اُس کے کولہے بہت بڑے اور باقی جسم منحنی سا نظر آنے لگتا۔ عام طور پر اس صوفے پر بڑے خالو آ کر بیٹھ جاتے، لیکن بڑے خالو ہمیشہ گھاٹے میں رہتے۔ کیونکہ وہ اس طرح آمنہ سے قریب ہو کر اس کی نظروں سے پشت ہونے کے باعث بہت دور ہو جاتے۔

اب نظروں کے عمل کے لئے سامنے آرام کرسی پہ بیٹھنے والا شاہد خوش نصیب ہو جاتا۔ آمنہ کو ہر جملے، ہر لطیفے پر اچھے منظر کے بعد نوٹ ملانے کی ضرورت پیش ہوتی اور شاہد سے زیادہ کوئی اس کا ذوقِ سلیم نہ سمجھتا تھا۔ ٹیلویژن پروگراموں کی وساطت سے وہ ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئے تھے۔ جتنی دیر پروگرام چلتے نظروں کا ٹرانسمیٹر بھی جاری رہتا۔ پسند ناپسند پر جانبین کی طرف سے مہریں لگائی جاتیں۔ جونہی پروگرام ختم ہوتا، ان پر تفصیل سے بحث جاری ہوتی۔ یہ بحث کچی لسی کی طرح جتنی چاہی جاتی بڑھائی جا سکتی تھی۔ گو بظاہر سارا خاندان اس بحث، تبصرے میں شامل ہوتا، لیکن ٹیلیویژن سے نظریں ہٹا کر آپس میں ملائے رکھنے والے اس بحث میں پیش پیش رہتے۔

پتہ نہیں شاہد کے ساتھ آمنہ کتنے پانیوں میں اُتری؟

پتہ نہیں وہ تخلیے میں کبھی ملتے بھی تھے کہ نہیں، باتیں رسمی تھیں کہ ذومعنی۔ بس بڑی ماں کے پُروا میں ایک اور زور کا دھماکہ اس روز ہوا جب اندر ہی اندر شاہد نے پاسپورٹ بنوا کر لندن جانے کا اعلان کر دیا۔ کچھ دن تو بڑی ماں سے سب چھپاتے رہے؛ کیونکہ شاہد ماں جی کا پیٹ گھروڑی تھا۔ ہر ماں چاہے بیٹے ہی کے کمرے میں رہے، چاہے بدیس بسے

بیٹے کے تیور سے پہچان جاتی ہے۔ ایک روز انہوں نے شاہد کا کندھا پکڑ کر پوچھا۔

"سنا ہے بیٹے تو لندن جا رہا ہے"

"جی؟"

"اس جمعرات کو؟"

"آپ سے کس نے کہا"

"آمنہ کہہ رہی تھی"

کسی اور نے یہ بات ماں جی کو بتائی ہوتی تو شاہد اس کے گلے پڑ جاتا۔ اب محض تلملا کر پہلو بدل کر بیٹھا رہا۔

"کیوں؟"

"جی ایک سال کا کورس ہے"

"اچھا؟"

"شاید دو ایک مہینے پہلے ہی آجاؤں؟"

جانے سے پہلے شاہد سب سے باری باری اُن کے کمروں میں ملنے گیا وہ ملنے ملانے کو فرض نبھانے کی شکل دینا چاہتا تھا، آمنہ کے کمرے تک پہنچتے پہنچتے اُسے ایک لیکچر سا حفظ ہو گیا۔

"سلام علیکم"

آمنہ چارپائی پر بیٹھی ناخنوں پر کیوٹکس لگا رہی تھی۔

"وعلیکم السلام"

"وہ جی میں جا رہا تھا سوچا ـــ کہ .... رات آپ نے BE WATCHED دیکھا تھا"

"جی ـــ ؟ اچھا تھا"

آمنہ اب اُسے اس پروگرام کی کہانی سنانے لگی۔ وہ اتنے قیمتی وقت کو اس طرح رائیگاں

نہ کرنا چاہتا تھا! لیکن آمنہ اُس کے آنے جانے سے بے نیاز کیوٹکس لگانے اور کہانی سنانے میں مشغول تھی۔

"میں جی لندن جا رہا ہوں" کہانی کے اختتام پر شاہد بولا۔

"اچھا ـــ" آمنہ نے ایسے کہا جیسے شاہد ماموں کانجن جا رہا ہو اور شام کو اس کی واپسی یقینی ہو ـــ"

"کچھ واقعے کچھ لوگوں کے دل میں مورچے کر دیتے ہیں ـــ" بڑی دیر بعد شاہد بولا۔

"مورچے؟" نظریں اُٹھا کر آمنہ نے پوچھا۔

"میں ـــ وہ آپ ...." یکدم شاہد کو بریک لگ گئی۔ ابھی تک اُس کے ہاتھ میں منگنی کی انگوٹھی جگمگا رہی تھی۔

"جی ـــ ؟"

"آپ نے LONG HOT SUMMER دیکھا اس ہفتے کا ـــ"

"ہاں ـــ کمزور تھا اس بار ـــ"

اب وہ ہیرو کے لباس پر لمبی چوڑی تنقید کرنے لگی۔

"آپ ائرپورٹ نہیں چلیں گی"

"کیوں؟"

"میں جا رہا ہوں ـــ لندن ـــ"

"اوہ ـــ آپ نے مجھے پہلے کیوں نہ بتایا؟"

"بتایا تھا!"

"کب ـــ ؟"

"ابھی دس منٹ ہوئے"

"اچھا؟"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"تو چلیں گی آپ؟"

"جی اب میں کیسے جا سکتی ہوں۔"

"کیوں؟"

"اب تو میں نے سر کو تیل لگا لیا ہے۔"

"تیل کیا کہتا ہے؟"

"دیکھیں تو سہی میں لگ کیا رہی ہوں چوہی سہی!"

شاہد نے کچھ کہنا چاہا، لیکن پھر یہ سوچ کر کہ آخری دس منٹ کی گفت و شنید سے فائدہ؟ چپ ہو رہا۔ ہاں ائرپورٹ پہنچ کر جب سارا پروار باری باری اس سے بغلگیر ہو کر اشک شوئی میں لگا ہوا تھا۔ شاہد نے اپنے ہاتھ سے انگوٹھی اتاری اور اسباب وزن کرنے والے کنڈے کے پاس ماں جی کو لے جا کر شرمساری سے بولا۔

"ماں جی یہ انگوٹھی آپ واپس کر دیں۔ میں عبیدہ سے شادی نہیں کر سکتا۔"

ائیرپورٹ پر بہت شور تھا۔ گنگنی آواز میں بار بار ایک لڑکی ہوائی جہازوں کے متعلق مائیکروفون پر کچھ کہہ رہی تھی، لیکن کچھ سمجھ میں نہ آ رہا تھا۔ دور ملبے کالے صوفے پر ماں جی کا بڈھا صافے سے آنسو پونچھنے میں مشغول تھا۔

یہ بدنصیب کون تھا؟

ساری عمر اس نے اتنے لوگوں کا بوجھ اپنے کندھوں پر کیوں اٹھایا۔ کوہکن نے تو ایک نہر کھود کر اتنا نام پایا، لیکن اس نے ساری عمر روپے کی آسائشوں کی محبتوں کی ان گنت نہریں کھودیں اور محلے میں بھی اُس کا نام نہ ہو سکا۔ کوہکن نے تو اپنی محبت سچی کرنے کو مشقت جھیلی، لیکن اُس نے تو اُن کے لئے بھی جفا جالی جن سے اس کا کوئی دلی کوئی روحانی رشتہ بھی نہ تھا۔ اس کوہکن کو کون یاد رکھے گا؟

اس کا سفر کب سے شروع تھا؟ اس کا سفر کہاں ختم ہو گا؟

یہ بدنصیب کون تھا؟ خدا نے اس کے لئے کیسی سزا مقرر کر رکھی تھی؟

"جی میں عبیدہ سے شادی نہیں کر سکتا۔"

بڑی دیر بعد ماں جی کو سمجھ آئی کہ شاید اپنی بچپن کی منگنی توڑ رہا ہے۔ انہوں نے اس اجنبی لڑکے کو پہچاننا چاہا۔

لیکن آنکھوں کے سامنے ساتھ یادداشت کے بچپن ہول بھی خالی خولی ہو گئے تھے۔

"میں جانتا ہوں کہ آپ کو بڑی تکلیف ہو رہی ہے، لیکن کیا کروں میں مجبور ہوں۔"

آج اُسے اپنے آنسوؤں سے شرم نہیں آ رہی تھی، کیونکہ آج سب سے بچھڑ کر رونا بزدلی نہیں تھی۔ آج یہ اظہارِ محبت تھا۔ اپنے بزرگوں کی خوشنودی کو حاصل کرنے کے مترادف تھا۔

لیکن جب سے جلیل اور قدیر اپنے اپنے گھر چلے گئے تھے اتنا بڑا دھماکہ ماں جی کے گھر میں نہ ہوا تھا۔ وہ کچھ دیر سوچتی رہیں۔ پھر یہ دھماکہ بھی اُن کے اندرونی شور میں ایسے جا ملا کہ انہیں تشخیص کرنا مشکل ہو گیا کہ وہ کس چیز کا اس قدر غم منا رہی ہیں۔

شاہد انگوٹھی پھینک کر چلا گیا، لیکن عبیدہ اُسے اتنی آسانی سے معاف نہ کر سکی۔

جس طرح ٹیکسی چلتی ہے تو آپ سے آپ میٹر کچھ نہ کچھ بتاتا رہتا ہے، اسی طرح عورت کے اندر بھی ایک میٹر چلتا رہتا ہے نہ جانے کیوں شاہد کے جانے کے بعد عبیدہ نے آمنہ کے خلاف پروپیگنڈا شروع کر دیا۔

"کرلی سی! سمجھتی کیا ہے اپنے آپ کو۔"

ایک دو اور دل جلی مٹیاریں جو گھر کے کونے کھدروں میں چھچھوندروں جیسی زندگی بسر کر رہی تھیں۔ عبیدہ کی فوراً ہم خیال ہو گئیں۔

"کل دیکھا تھا؟ دیکھا تھا؟ شیفون کی آستینیں اور مرن جوگی سر پہ بازو رکھ کر ٹیلیویژن دیکھ رہی تھی۔ سارے بیٹھے تھے۔ بڑے خالو، زمرد بھیا۔"

کم صورت، بھدی دو خالہ زاد بھی اس گفتگو میں شریک ہو گئیں۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"سارے جسم پر آدھ آدھ انچ لمبے بال ہیں۔"

"اُن کو ہائیڈروجن سے سنہرے کرتی ہے۔"

"قد بہت چھوٹا ہے۔"

یہ بہت اچھا پوائنٹ تھا، کیونکہ واقعی اُس کا قد بہت چھوٹا تھا۔ فاصلے سے نویں جماعت کی طالبہ لگتی تھی —— اس خاندان کی ساری عورتیں کھڑے کھڑے دروازوں کی ریلنگ پر پردے ٹانگ لیتی تھیں۔

"جب تک عورت کا قد نہ ہو —— ہائے حُسن کیسا؟"

"شاعروں نے تو کہا ہے لانبا قد، سرو جیسا۔"

"شاعر کوئی احمق تھوڑے ہوتے ہیں۔ کسی نے کبھی ٹھنگنی عورت پر نظم لکھی ہے اُس کی تعریف کی ہے ——" اس پر بظاہر ساری ٹکڑی مطمئن ہو جاتی۔ لیکن وسوسے بالکل ختم نہ ہوتے۔ مچھلیاں سطحِ آب سے ایک ہی چھڑاپے میں تہہ آب چلی جاتیں۔

ماں جی کا پرِوار ایک عرصہ سے مادی زندگی بسر کر رہا تھا۔ اب اُوپر سے نیچے تک احساس کی انگیٹھیاں سی سلگ گئیں۔ سب کی آنکھوں میں اپنے اپنے زاویوں کی سوچ جھلکنے لگی۔ بڑے خالو گھر کی سب سے جامع شخصیت تھے اور گو وہ یہاں مستقل طور پر نہ رہتے تھے لیکن اب ان کا قیام لمبا ہوتا جا رہا تھا۔ پہلے خالہ کے دانت انہوں نے ڈینٹسٹ سے ٹھیک کرائے پھر مکمل طور پر اپنا اور خالہ کا میڈیکل چیک اپ کرایا۔ روز کراچی سے ٹرنک کال آتی کہ بزنس میں گھاٹا پڑ رہا ہے، لیکن وہ نئی نئی تھیوریاں نکالنے میں سارا دن صرف کرتے۔ جان ہی نہ رہی تو بزنس کیا خاک رہے گی؟

اب اُن کا زیادہ وقت گھر کی لڑکیوں بالیوں سے باتیں کرنے میں گزرتا۔ جہاں بڑے خالو ہوتے وہاں اُن کے مریدان کی ٹکڑی پرے جا کر بیٹھ جاتی۔ الف سے یے تک سارا اخبار زیرِ بحث آتا۔ یہ طبائع اور شخصیت کی مکمل جنگ تھی۔ بڑے خالو ہار ماننے والوں میں

سے نہیں تھے۔ خاموش، خربوزے کے بیج کھاتی، بڑے کولہوں والی آمنہ جب اس ٹکڑی میں شامل ہوتی تو خالو کو اپنی تفریح، اپنے کاروبار اپنی زندگی کے ہر شعبے کے لئے آمنہ کی مہر درکار ہوتی جیسے کوئی لمبی چھٹی کی عرضی لئے آفیسر کے سامنے کھڑا ہو۔ نہ جانے کیوں اور کیسے وہ مکمل طور پر آمنہ کو مرعوب کرنا چاہتے تھے اور مرعوب کرنے کے بجائے۔ مرعوب ہوئے چلے جا رہے تھے۔ بڑے خالو آمنہ کو اپنے عشق میں مبتلا کرنا چاہتے تھے، لیکن اس کے برعکس وہ خود پکی عمر کے عشق کا المیہ ہو چکے تھے۔ آمنہ کو دیکھ کر اُن کا جی چاہتا کہ لڑکوں جیسی حرکتیں کریں۔ دیوار پر درختوں پر اپنا اور آمنہ کا نام کرید کر ساتھ ساتھ لکھیں، اُلٹ بازیاں لگائیں، سائیکل کے ڈنڈے پر بٹھا کر سارے شہر کا چکر لگائیں۔ یہ عشق محبوبہ، بیٹی اور بیوی کا تین رنگا جھنڈا تھا۔ جسے وہ اپنی معمری کی وجہ سے کہیں بھی نصب نہیں کر سکتے تھے اور دل کے ایوان پر اس کو لہرانے سے دل کی ویرانی اور ہیبت ناک ہو جاتی تھی۔

پھر اچانک خالو اپنی بیوی بچوں کو بڑی ماں کے پاس چھوڑ کر کراچی چلے گئے۔

یہ فیصلہ اچانک ہوا۔

اور اس فیصلے کے تین دن بعد اچانک بڑی ماں کے بڑے بھتیجے نے خودکشی کر لی۔ اسی روز آمنہ فلم دیکھنے گئی ہوئی تھی۔ رات گئے فلم ختم ہونے کے بعد وہ اپنی سہیلی کے ساتھ چلی گئی، جب سہیلی کے گھر سے اُس کا فون آیا خرم کو مرے پورا گھنٹہ ہو گیا تھا —— "کون ہے؟"

"ہیلو..... ہیلو..... بھئی آج رات میں گھر نہیں آسکوں گی۔ ہاں! —— میری سہیلی کا ڈرائیور بیمار ہو گیا ہے اچانک..... جی میں..... یہیں ٹھہر رہی ہوں۔ شاہ جمال میں اس کے پاس..... جی؟ —— کس نے..... خرم نے؟ —— کیسے ——"

پھر فون دونوں جانب سے بند ہو گیا۔

خدا جانے آمنہ پر اس کا کیا اثر ہوا؟ کیونکہ جب وہ دوسرے دن گھر لوٹی تو اس کا چہرہ ستا ہوا لیکن آنکھیں خشک تھیں۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

دیکھتے دیکھتے دری برابر بدلی گھٹا ٹوپ اندھیرا بن کر سارے گھر پر چھا گئی۔ اندر باہر پھوار پڑنے لگی۔ پھر ژالہ باری میں کئی شیشے ٹوٹ گئے۔ باہر کے ندی نالوں سے زیادہ اندر جل تھل ہو گیا۔

آمنہ کے خلاف ووٹ بہت تھے۔ اس کے باوجود جب قیس کا رشتہ اُس کیلئے آیا تو سب حیران رہ گئے۔ قیس تو ولایت پلٹ، ہاتھی دانت تھا۔ گھر کی ساری کنواریاں مدتوں اُس کی آس میں ورمالا پروئے بیٹھی ہوئی تھیں۔ قیس کی باتیں مصری کی ڈلیاں، اُس کی چال ڈھال مغربی ایکٹروں جیسی اور اُس کی آمدنی کسی پختہ سرمایہ دار جتنی تھی۔

رات کو جب سب سو گئے اور آخری بار خرم کی ماں نے بڑی ماں کے آگے ہاتھ جوڑ کر کہا: "ماں جی خرم تو چلا گیا، خدا جانے کیوں؟ میں کسی پر الزام نہیں لگانا چاہتی پر۔۔۔ پر آپ آمنہ کو ہوسٹل نہیں بھیج سکتیں؛ جلیل قدیر نے کبھی قدم نہیں رکھا اس گھر میں شاہد کا خط لندن سے نہیں آیا ــــ آپ گھر کو مردوں سے پاک کرنا چاہتی ہیں؟ ــــ

اسی رات ہلکی ہلکی ٹھنڈ تھی، لیکن بڑی ماں اب بھی بلڈ پریشر کی وجہ سے باہر آنگن میں پلنگ ڈالے اُوپر سے نیچے تک تین منزلہ مکان کو دیکھ رہی تھیں۔ انہیں اس مکان کی کھڑکیاں دروازے دہلیزیں چوکھٹ سب یاد تھیں۔ انہوں نے پورے تیس سال اس مکان میں دنیا آباد کرنے کی کوشش کی تھی، لیکن اب وہ جانتی تھیں کہ شعوری کوششوں سے کچھ نہیں ہوتا۔ شعوری کوشش سے ایک گھاس کا پتہ تو انسان اگا نہیں سکا۔ پھر کائنات کیسے بسا لیتا ایک تین منزلہ مکان میں۔

"آپ نے مجھے بلایا بڑی ماں؟"

"آؤ بیٹھو۔"

آمنہ پائنتی اس طرح بیٹھی کہ ایک ٹانگ دوسری ٹانگ کے ساتھ نوّے کا زاویہ بنانے لگی۔

"سنو آمنہ۔ یہ زندگی عجیب جھنجھٹ ہے۔ یہاں انسان کی آدھی عمر معافیاں مانگتے اور

آدھی عمر معافیاں دیتے گزر جاتی ہے۔ معافی مانگتے ہوئے اور معافی دیتے وقت ہمیشہ دو آدمیوں کا رشتہ خدا اور بندے کا رہتا ہے۔ کبھی انسان انسان کے قریب نہیں آتا۔"

"آپ نے مجھے بلایا تھا ماں جی؟"

"بلایا تھا۔ تو میری بہن کی اکلوتی نشانی ہے اور میری بہن کی ہی نہیں، میرے مائیکہ گھر کی آخری نشانی ہے۔ عجیب جگہ ہے مائیکہ چھوٹ کر اور بھی پیارا ہو جاتا ہے۔ جیسے حضرت آدمؑ کو چھوٹ کر جنت پیاری ہوئی۔ سُن آمنہ دو راستے ہیں ــــ ہر دو راستے دو ہو کر بھی ایک ہیں۔ آدمی چاہے اپنی مرضی سے کسی راستے پر جائے۔ آخر کو راستہ ایک ہی رہتا ہے۔"

"کونسا ماں جی؟"

"تنہائی کا ــــ انتظار کا ــــ زندگی کے ختم ہونے کا انتظار!"

"آپ نے مجھے بلایا تھا ماں جی!"

"بلایا تھا ــــ ضرور بلایا تھا۔ دیکھ آمنہ عورت جوان ہو اکیلی ہو اور بے دھیانی ہو تو اُسے مرد بہت ــــ! بھلا کیا کہا میں نے؟"

"جی عورت اکیلی ہو جوان ہو اور بے دھیانی ہو تو اُسے مرد بہت ــــ"

"ٹھیک" بڑی ماں بولیں ــــ "مرد بہت ــــ پر چھایا ہر جگہ پڑتا ہے عمر کا دام ہر جوانی کو زیر کرتا ہے۔ پھر اکیلی عورت بے دھیانی نہیں رہتی ــــ اور ــــ جب وہ بے دھیانی نہیں رہتی تو بھیڑ چھٹنے لگتی ہے ــــ تنہائی کا کنکھجورا رات کے پچھلے پہر تکیے پر رینگنے لگتا ہے ــــ یہ راستہ بالآخر تنہائی کے سنگ میل بکھیرتا لمبا ہوتا جاتا ہے۔"

"آپ نے مجھے بلایا تھا ماں جی؟"

"دوسرا راستہ ــــ یہ ہے ــــ ساری جوانی بچے جنتے اور سارا بڑھاپا بچوں سے وداع ہونے میں گزر جاتا ہے ــــ سارے مردوں پر دروازے بند کر بندی خانے میں عمر گزارنے کی عجیب سزا ہے ــــ تین منزلہ مکان میں کوئی تمہیں نہیں جانتا، کوئی تمہیں نہیں پہچانتا، سب

www.iqbalkalmati.blogspot.com

آپ کی عادتوں کو جانتے ہیں۔ آپ کے مزاج کے واقف ہوتے ہیں۔ کوئی آپ کو نہیں جانتا! یہ راستہ میلے میں اکیلے رہنے کا راستہ ہے ـــــ بالآخر راستہ ایک ہی ہوتا ہے آمنہ تنہائی کا راستہ۔"

"جی؟ ـــــ"

"سن آمنہ ہر انسان چاہے وہ مرد ہو چاہے عورت اندر سے وہ رب ہے۔ چھوٹا سا رب۔ ہر رب کی آرزو ہے کہ ـــ کوئی ایسا بھی زندگی میں آئے جو اُس کی ذات کے ساتھ کسی اور کو شریک نہ ٹھہرائے ـــــ جانتی ہے شرک کیا ہے؟ ہر مرد ہر عورت اُسی آرزو میں ساری عمر جھوٹے سچے عشق اور بڑی لمبی لمبی تنہائیاں سہتے ہیں ـــــ جانتی ہے شرک کیا ہے؟ ـــ"

"نہیں جی ـــــ"

"رب کی ذات کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا"

"پر ماں جی ـــــ"

"سب ـــــ ہر لولا، لنگڑا، بھوکا، پیاسا، خوبصورت، بدصورت، کالا، سفید..... جو بھی اس دنیا میں آتا ہے اسی آرزو کے ساتھ آتا ہے۔ ہر انسان چھوٹا سا رب ہوتا ہے ..... وہ چاہتا ہے کہ کوئی اور ایسا آئے جو اُس کی ذات کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائے۔ یہی وہ گناہ ہے جو حضرت آدمؑ نے کیا ..... انہوں نے ایک روز چوری چوری ..... باغ بہشت میں مائی حوّا سے پوچھا ـــ بول مجھے سجدہ کرے گی ..... اماں حوّا نے اُن کے قدموں میں اپنا سر جھکا دیا۔ حضرت آدمؑ نے سوال کیا ـــ بول کسی کو میرے ساتھ شریک ٹھہرائے گی ....

مائی حوّا نے اپنے رحم پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائی اور تو جانتی ہے کیا سزا ملی دونوں کو.... کیا کہا ہمارے رب نے حضرت آدم سے؟"

"کیا ماں جی؟"

"اللہ نے کہا ـــ جا زمین پہ چلا جا اور اس شرک کی سزا بھگت ـــ جا حوّا ـــ تیرے

شرک کی یہی سزا ہے کہ تو خدا کو جب بھی ملے گی۔ آدم کی شکل میں ملے گی اور تجھے آدم خدا بننے کا شوق ایسا رُسوا کرے گا کہ تو ہر حوّا سے پرستش کروانے کے بعد بھی خالی رہے گا۔ خالی سیپی کی طرح .... یہی تیرے شرک کی سزا ہے ـــــ تو عورت سے محبت چاہے گا اور وہ چوری چوری اندر ہی اندر بچّہ پالے گی اور تیری محبت میں شرک کی مرتکب ہوگی۔"

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی ماں جی"

"دیکھ ـــــ عورت جوان ہو کر اکیلی ہو اور بے دھیانی ہو تو اُسے مرد بہت.... پر... راستہ یہ بھی تنہائی کو جاتا ہے اور تین منزلہ مکان میں رہے ساری عمر بچّے جنے پھر بھی راستہ تنہائی کو جاتا ہے ـــــ ہر ربّ کی قسمت میں بالآخر تنہائی ہے وہ چھوٹا ہو کہ بڑا ـــ بول تو نے اپنے لئے کونسا رستہ چنا ہے آمنہ؟

"میں نے ـــ؟ میں نے ـــ"

"قیس کا رشتہ بھی ہے ـــ اور ـــــ جب تک آنکھ کا دیا روشن ہے سنجوگ بھی ہر رنگ کا مل سکتا ہے بول ـــ کونسی صلیب چُنے گی تو اپنے لئے ـــ مشکِ نافہ بن کر پاگل کرے گی سب کو بکھر جائے گی آخر کہ سیپ کے کیڑے کی تنہائی موتی بنائے گی سب سے چھپ کر؟"

آمنہ نے اپنے اردگرد دیکھا۔

خرم، شاہد، جلیل، قدیر... کالج کے کئی خوبرو اُس کی نظروں کے سامنے گھوم گئے اس ستائش گاہ کا کیا اعتبار؟

"تیرے لئے قیس کا رشتہ آیا ہے ـــ بول تو ہاں کر دوں؟"

آمنہ نے مائی حوّا کی طرح اپنے رحم پر ہاتھ رکھا اور بڑی ماں کے سامنے جھک کر بولی۔

"میں شرک کے لئے تیار ہوں بڑی ماں آپ ہاں کر دیجئے"

"دیکھ لے مرد کی محبت نہیں ملے گی ـــ پھر ـــــ"

"میں جانتی ہوں ـــ" وہ آہستہ سے بولی۔

"مجھے جنت میں رہتے بہت عرصہ ہو گیا ہے۔ ماں جی"

---

www.iqbalkalmati.blogspot.com

رنگروٹ

سامنے گٹھلیوں کا ڈھیر تھا اور سب عورتیں پہلا کلمہ پڑھنے میں مشغول تھیں۔ سفید چادر پر جا بجا چکنی کھجور کی گٹھلیوں کی پاؤ، آدھ پاؤ، سیر سوا سیر کی ڈھیریاں لگی ہوئی تھیں۔ شیخ وجاہت کی موت کا کسی کو یقین نہ آ رہا تھا لیکن اتنی بات پر سارا محلہ متفق تھا کہ ایسا راسخ العقیدہ سچا اور پکا مسلمان جب سے پاکستان بنا، محلے والوں نے نہ دیکھا تھا۔ سنتے ہیں کہ پاکستان بننے سے پہلے دو گلیاں چھوڑ کر بابا ڑلیا کھیس بیچنے والا رہا کرتا تھا۔ قصور سے کھیس خرید کر لاتا۔ اسی قدر کھیس بیچتا جس سے دن بھر کی روٹی چلتی اور باقی وقت اللہ اللہ کرنے میں گزارتا۔

بابا ڑلیا کے متعلق تو شاید کسی کو شبہ بھی ہو لیکن شیخ وجاہت کے متعلق اندر باہر کسی کو خیال بھی نہ آ سکتا تھا کہ وہ اللہ کا نیک پسندیدہ چنیدہ آدمی نہیں بلکہ جس وقت جنازہ گھر سے رخصت ہوا کئی رقیق القلب ملاقاتی یہ فیصلہ کر چکے تھے کہ وہ ان ۷۰ ابدالوں میں سے ایک تھا جن کے سہارے دنیا کا نظام قائم رہتا تھا۔

پتہ نہیں گٹھلیاں زیادہ تھیں کہ بیبیاں پڑھ پڑھ کر تھک چکی تھیں۔ پتہ نہیں کس طرف سے آواز آئی:

”کیوں بیوی جی۔ تم نے تو کئی بچوں کو قرآن پڑھایا ہے۔ بتائیے کیا قبر کا عذاب ہوتا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہے کہ نہیں"۔

"ہوتا کیوں نہیں۔ منکر نکیر جو آتے ہیں قبر میں"۔ بوا جی نے سفید دوپٹہ کانوں کے دونوں طرف اڑس کر کہا۔

"لیکن جی۔ . . . حساب کا دن تو مقرر ہے۔ اس دن سے پہلے حساب کیا؟" کانونٹ کی پڑھی ہوئی بڑی بہو نے پوچھا۔

اب مصالحت کے انداز میں، بیوی جی بولیں:

"اے بھئی اپنے اپنے عقیدے کی بات ہے۔ بریلویوں کا کچھ عقیدہ ہے ___ دیوبندی کچھ اور سمجھتے ہیں۔ ہم تو سمجھتے ہیں اپنا عقیدہ چھوڑو نہیں۔ کسی اور کا عقیدہ چھیڑو نہیں"۔

منی جو دیر سے اپنی ماں کی بغل میں گھسی آئس کریم کے لئے روپیہ مانگ رہی تھی جھٹ دوپٹہ سے منہ نکال کر بولی ___ "آنٹی۔ کیا شیخ صاحب کو بھی قبر کا عذاب ہوگا؟"

ساری محفل پر جیسے گٹھلیوں کی بارش ہوگئی۔ عورتوں کے دلوں پر گومڑ پڑ گئے۔

"یہ لو روپیہ اور بھاگو یہاں سے"۔

"ان کو بھی منکر نکیر پوچھنے آئیں گے"۔ منی نے ایک اور حملہ کیا۔

بوا جی نے دونوں کانوں کو ہاتھ لگایا اور سر دائیں بائیں ہلا کر بولیں:

"لو . . . . شیخ صاحب کو عذاب کیسا ___ وہ تو پھولوں میں گئے ہیں۔ خوشبوؤں میں بسے ہوئے۔ ان کا حساب کیا؟ حساب تو ہم جیسوں کا ہوتا ہے ہم جیسوں کا"۔

اس وقت کوئی بی بی موقع کی نزاکت سمجھ کر اونچے اونچے رونے لگی۔ سارے میں سسکیاں، آنسو اور، ہچکیاں ٹرانسمٹ ہوگئیں۔

لو بھلا شیخ صاحب کو عذاب کیسا؟

لو بھلا شیخ صاحب کا حساب کیسا؟

جب میں پہلے پہل شیخ صاحب سے متعارف ہوا وہ محلے کے تین معتبر لوگوں کیساتھ میرے گھر عصر اور مغرب کے دوران آئے تھے۔ میں محلے میں نووارد تھا لیکن شیخ صاحب کی آواز، نشست و برخاست، ان کا لباس، ہاتھ رکھنے اور اٹھانے کا طریقہ غرضیکہ ان کی تمام شخصیت کا پھیلاؤ دیکھ کر ہی میں اس نتیجے پر پہنچ گیا تھا کہ شیخ صاحب بڑے نیک متقی اور پرہیزگار آدمی ہیں۔

وہ چاروں حضرات میرے پاس مسجد کی تعمیر کیلئے چندہ لینے آئے تھے۔ کم از کم اس وقت میں یہی سمجھا تھا۔ میں نے جیب سے سو روپے کا نوٹ نکالتے وقت اپنے آپ کو حاتم وقت سمجھا تو شیخ صاحب نے میرے بڑھے ہوئے ہاتھ پر اپنے دونوں ہاتھ رکھ کر کہا:

"نہیں حضرت! مسئلہ یہ نہیں ہے ___ مسئلہ ذرا دقیق ہے"۔

میں ان کا منہ تکنے لگا۔ باقی تین حضرات جیسے جمرات کی مانند صرف کنکریاں کھانے آئے تھے، چپ رہے۔

"دیکھئے مسجد تو قریب قریب مکمل ہو چکی ہے۔ میں نے اس کی تعمیر خود کھڑے ہو کر کروائی۔ آپ چل کر ملاحظہ کر لیجئے کہ میری محنت کا کیا صلہ ملا ہے ___ بس اب پنکھے لگنے ہیں اور فرش پڑنا ہے"۔

"میری تو اس سے زیادہ پہنچ نہیں ہے"۔ میں نے لجاجت سے کہا۔

"نہیں نہیں۔ ہم آپ سے چندہ لینے نہیں آئے"۔ شیخ صاحب نے محبت سے میرا ہاتھ سہلاتے ہوئے کہا ___ "یہ جو آپ کے گھر کے سامنے سرخ مکان ہے یہاں سے سنگ مرمر کا فرش بنانے کے لئے بیس ہزار کا چیک ملا ہے ___ رقم اتنی بڑی ہے کہ فرش بھی لگ جائے گا اور پنکھوں کا انتظام بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن . . . . ."

"لیکن کیا شیخ صاحب ___ چیک بھنوائیے اور کام چالو کیجئے"۔

"مشکل یہ ہے صاحب۔ یہ جو لال مکان والے ہیں ان کا رزق مشتبہ ہے ___

www.iqbalkalmati.blogspot.com

آپ تو اس محلے میں نئے ہیں لیکن ہم سے تو کچھ چھپا نہیں"۔

"کیا کہتے ہیں شیخ صاحب۔ بے چارہ سیدھا سادہ ٹھیکیدار ہے۔ موٹر سائیکل پر آتا جاتا ہے۔ بڑا شریف آدمی ہے"۔

"لیکن بدقسمتی سے اس کی گھر والی کی ماں کا رزق حلال نہیں تھا ــــ وہ ادھر اُس بازار کی تھی ــــ کون جانے اس رقم میں اس کا کتنا حصہ ہو ــــ آپ کو طریقے طریقے سے یہ بات اُن تک پہنچانا ہے یعنی اگر ہم کہیں گے تو پڑوسی ہونے کی رعایت سے ان کی دل شکنی ہونے کے امکانات ہیں" ــــ لیکن آپ اجنبی ہیں اس محلے میں۔ آپ مناسب الفاظ میں انہیں ہمارا اعتراض پہنچا دیجئے"۔

میں حیرانی سے شیخ صاحب کا چہرہ دیکھتا رہا۔

جمرات خاموش رہے۔

"ہماری آرزو ہے کہ یہ پیسہ پہلے آپ ٹھیکیدار صاحب سے ادھار لے لیں۔ وہ بھلے آدمی ہیں ضرور ادھار دے دیں گے۔ پھر اپنی طرف سے ہمیں چندے میں دیں۔ یہ قرض آپ کو لوٹانا نہیں پڑے گا۔ دیکھئے اللہ کے گھر کی تعمیر کا سوال ہے ــــ شبہ والی بات نہیں ہونی چاہئے۔ آپ کو ثواب ملے گا"۔

میں ثواب کے چکر میں پڑ گیا۔

"لیکن ــــ لیکن شیخ صاحب! میں اس گھر میں نیا ہوں۔ محلے میں نووارد ہوں۔ یہ ٹھیکیدار مجھے کیونکہ بیس ہزار ادھار دے گا"۔

"دیکھئے ہم ان کی دلآزاری نہیں کر سکتے۔ ہم محلے میں پرانے ہیں۔ آپ کو ان کے پاس جا کر جھوٹ بولنا ہو گا کہ ..... کہ آپکو بیس ہزار روپیہ درکار ہے اور شیخ صاحب آپکو وہ چیک دے سکتے ہیں۔ کچھ دنوں کے لئے جو انھوں نے مسجد کی تعمیر کے لئے بھجوایا ہے پھر آپ وہ چیک ہمیں دے دیں۔ بس اتنی سی بات ہے ــــ ساتھ ہی باتوں باتوں میں یہ

بھی بتا دیں کہ شیخ صاحب کیوں چیک نہیں لے سکتے"۔

گو بات میرے پلے نہ پڑی لیکن وہی کچھ ہوا جو شیخ صاحب نے فرمایا تھا۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ جو تین جمرات شیخ صاحب کے ساتھ آئے تھے انہوں نے بات LEAK کر دی اور ٹھیکیدار کی بیوی کئی راتیں روتی رہی۔ اس نے اپنے شوہر سے وعدہ لیا کہ وہ کبھی مسجد میں نماز پڑھنے نہیں جائیں گے۔ کچھ عرصہ ٹھیکیدار صاحب مسجد میں تشریف نہ لائے پھر یہ خاندان خدا جانے کہاں جا بسا اور ان ہی کے گھر میں ایک انجنیئر آ بسے۔

انجنیئر سے مجھے یاد آیا کہ انجنیئر اکرام اللہ سے بھی میری پرانی یاد اللہ ہے۔ اس نوجوان نے ابھی پانچ سال پہلے ساہیوال میں سروس شروع کی تھی۔ وہاں اس انجنیئر سے میرے بڑے اچھے مراسم تھے۔ ہر نوجوان آدمی کی طرح جو سروس شروع کرتا ہے ان کے بھی بہت سے اصول تھے آدرش تھے۔ یہ رشوت کے نام پر بدکتا تھا۔ اس کا تکیہ کلام تھا کہ اگر حکومت کی چوری ہی کرنا ہے تو اس کے خزانے سے چراؤ۔ اس کا وقت نہ چراؤ۔ وقت کی پابندی کا یہ عالم تھا کہ ماں فوت ہو گئی تو پورا دفتر اٹنڈ کرنے کے بعد لاہور گیا۔ اکرام اللہ کے دفتر میں کبھی کسی نے انبوہِ دوستاں، گروہِ سفارشاں، جماعتِ خوشامد پسنداں نہ دیکھی۔ اس کی میز پہ کبھی کوئی فائل بھی جمع ہو کر کالی صندوقچی میں پڑی نہ رہتی تھی۔ دوست ملنے آ جاتا تو فوراً پوچھتا:

"فرمایئے۔ کوئی کام کہ گپ شپ؟"

دوست بیچارہ کھسیا کر عندیہ بیان کرتا تو فرماتے: "جناب آج شام پانچ بجے میرے گھر۔ میرا خانساماں پکوڑے بہت اچھے بناتا ہے"۔

اکرام اللہ کے خلاف رفتہ رفتہ کافی بغض جمع ہو گیا۔ چالاک ٹھیکیداروں، رشوت خور ایس ڈی او، پبلک کے متعلقہ غرض مند لوگوں نے مل ملا کر اکرام اللہ کی تبدیلی کروا دی۔

جس روز نئے محلے کی مسجد میں سنگِ مرمر کا فرش دھو دھلا کر پہلا جمعہ پڑھایا گیا تو خطبے کے وقت میری نظر سامنے والی صف پر گئی۔ پشت سے تو آدمی انجنیئر اکرام اللہ ہی لگتا تھا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

لیکن گردن اور کندھوں پر وافر چربی دیکھ کر مجھے کچھ شبہ سا بھی پڑ گیا کہ شاید پانچ سال میں اکرام اللہ اتنا موٹا نہ ہو گیا ہو۔ بلکہ آدمی ہی کوئی اور ہو۔

نماز ختم ہونے کے بعد جب میں باہر نکل رہا تھا تو کسی نے مجھے پیچھے سے پکڑ لیا۔ پلٹ کر دیکھا تو اکرام اللہ تھا۔ وہ اب پہلے اکرام اللہ کا جمبو سائز تھا۔ بہت تپاک سے ملنے کے بعد اس نے مجھے اپنے دفتر کا پتہ بتا دیا:

"یار تم میرے پاس کل دفتر آنا ــــ بالکل پبلک لائبریری کے سامنے ــــ ساتھ ہی سموسے ملتے ہیں۔ خوب مزے دار ــــ ضرور آنا۔"

دوسرے دن میں اکرام اللہ کے دفتر پہنچا۔

اس کی کرسی کے سامنے چھ آدمی بیٹھے تھے۔ تمام میں جو آدمی سب سے ممتاز تھا وہ شیخ صاحب تھے۔ سامنے ایک پلیٹ میں سموسے تھے۔ ایش ٹرے سگرٹوں سے بھری ہوئی تھی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ یہ حضرات کافی دیر سے یہاں بیٹھے ہوں گے۔

میں کوئی آدھ پون گھنٹہ بیٹھا رہا۔ پہلی ٹکڑی میں سے کوئی شخص بھی نہ اٹھا۔ ہاں دو چار اور اشخاص کا اضافہ ہو گیا۔ بالآخر جب میں چلنے لگا تو اکرام اللہ بولا:

"یاد ہے یار۔ میں ساہیوال میں کس قدر احمق اور کھٹرا آدمی ہوا کرتا تھا۔ مجھے تو شیخ صاحب نے انسان بنایا۔"

شیخ صاحب بھینی بھینی مسکراہٹ مسکرائے:

"بس جی۔ آپ کانوں میں نہ گھسیٹئے۔ آپ کا دفتر راستے میں پڑتا ہے۔ میں یہاں ٹولنٹن مارکیٹ گوشت خریدنے آتا ہوں۔ ساتھ ہی آپ کو بھی مل لیتا ہوں۔ ایک پنتھ دو کاج۔"

اکرام اللہ نے آواز گرا کر کہا ــــ "بخدا پہلے پہلے جب یہ آتے تھے تو مجھے غصہ چڑھ جاتا تھا ــــ لیکن اب ان کی وجہ سے میرا نکتۂ نظر تبدیل ہو گیا ہے۔ میں اب اپنے جاب کو اپنے لئے وبال نہیں بنانا ــــ آخر پچیس سال کام کرنا ہے ــــ RELAX کر کے

کرنا چاہئے ــــ شیخ صاحب کی مہربانی ہے کہ مجھے اپنے پیشے میں نارمل بنایا۔"

پتہ نہیں کیا بات ہے کہ اس روز کے بعد میں نے اکرام اللہ سے ملنے کی کوشش نہیں کی بلکہ مسجد میں بھی جب وہ جمعہ پڑھنے آتے تو میں ان سے نظریں چار کرنے سے گھبرا جاتا۔

شیخ صاحب سے البتہ ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ وہ واقعی بہت سچے، معاملے کے پکے صوم و صلوٰۃ کے پابند، حساب کتاب کے کھرے آدمی تھے۔ محلے میں جو اہمیت انکی رائے کو تھی کسی اور کو نہ تھی۔ امانتیں ان کے پاس آنکھیں بند کر کے رکھوائی جاتیں۔ لوگوں کی مدد وہ بے دریغ کرتے۔ غرضیکہ شیخ صاحب محلے کے ماڈل آدمی تھے۔

میری بیوی میری عادتوں سے نالاں ہو کر کہہ اٹھتی:

"ایک شیخ صاحب بھی تو ہیں۔ ان کی مثال سے آدھا محلہ مسلمان ہو گیا۔ ایک آپ ہیں آدھی آدھی رات تک آپ برج کھیلتے ہی نہیں تھکتے۔ کم از کم یہ تو دیکھ لیجئے کہ اولاد پہ کیا اثر پڑ رہا ہے۔"

میں چڑ کر کہا کرتا ــــ "تم اثر پڑوانے وہاں جایا کرو۔ شیخ صاحب کے گھر۔ کوّے کے گھر میں کوّے ہی پیدا ہوتے ہیں۔ بگلا بگلے کو ہی جنم دیتا ہے۔"

یہ رمضان سے دو دن پہلے کی بات ہے کہ میں نجم صاحب کے گھر گیا۔ ان کا گھر ہمارے محلے میں نہیں لیکن محلے سے متصل گلی میں موجود ہے۔ عصر اور مغرب کے درمیانی وقفے کا ذکر ہے۔ تمازت بہت تھی اور حبس گلی میں یوں بیٹھا تھا جیسے کوئی شخص گرم بھاپ میں کمبل بھگو کر آپ کو اس میں دم پخت کرنے کیلئے بیٹھا ہو۔ پہلے تو میں نے ارادہ کیا کہ نجم صاحب سے پھر ملاقات کی جا سکتی ہے لیکن مجھے کیمرہ درکار تھا اس لئے میں نے با دلِ نخواستہ دروازے پر دستک دی۔ شیخ صاحب نے میرے لئے دروازہ کھولا۔

اب باتیں شروع ہوئیں۔ شیخ صاحب میرے سامنے اپنا مطلب بیان کرنے سے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

قاصر تھے۔ میں شیخ صاحب کے سامنے کیمرہ مانگنے سے قاصر تھا۔ بالآخر مغرب کی نماز جیت گئی۔

شیخ صاحب کو فکر تھی کہ کہیں وہ مسجد نہ پہنچ سکیں اس لئے میری موجودگی کے باوجود انہیں اپنا عندیہ بیان کرنا پڑا۔

"سعیدہ کا کچھ سامان دوبئی سے آرہا ہے۔ دو ایک دن میں ڈرائی پورٹ پر پہنچ جائے گا۔"

بعد میں مجھے پتہ چلا کہ سعیدہ شیخ صاحب کی منجھلی بیٹی ہے اور اس کا شوہر دوبئی میں ایک امریکی فرم کا منیجر ہے۔

"دو ایئر کنڈیشنر ہیں ایک فریج ہے۔ باقی کچھ چھوٹا موٹا بجلی کا سامان ہوگا ــــ اگر تم انتظام کر دو تو مہربانی ہوگی۔ سعیدہ کو تو اس میں کچھ دلچسپی نہیں۔ بچوں کی چیزیں ہیں۔"

نجم ڈرائی پورٹ پر بڑی توپ چیز تھا لیکن اس کے متعلق مشہور تھا کہ وہ اپنا سامان بھی مکمل ڈیوٹی ادا کئے بغیر کبھی نہیں نکالتا۔ اس وقت اس کا رنگ فق ہو گیا۔

"بات یہ ہے شیخ صاحب کہ آپ ہفتے کے روز میرے پاس پہنچ جائیں۔ میں آپکو سہولت کے ساتھ گودام میں سے سامان نکلوا دوں گا ــــ وہاں عموماً تین تین مہینے سامان پھنسا رہتا ہے۔ بس میں تو اسی قدر کر سکتا ہوں۔ باقی ڈیوٹی وغیرہ تو جس قدر مقرر ہے آپ کو ادا کرنی ہی ہوگی۔"

اب شیخ صاحب نجم کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اُسے کمرے کے آخری صوفے پر لے گئے میں خاموش بیٹھا رہا۔ کبھی کبھی کنکھیوں سے دیکھ لیتا۔ نجم کبھی سر کھجلاتا نظر آتا کبھی ٹھوڑی ــــ کبھی ابرو کھینچتا کبھی ناک میں انگلی پھیرتا۔ شیخ صاحب بڑے استقلال سے بیٹھے تھے جیسے لکڑی کے بنے ہوں۔ ان کا ایک ہاتھ نجم کے کندھے پر تھا اور دوسرا اپنی جھولی میں پڑا تھا۔ ایکبار بھی ان کی جبیں زبان میں تلملاہٹ گھبراہٹ یا شرمندگی کا اظہار نہ ہوا۔

جس وقت مسجد سے عشاء کی اذان شروع ہوئی نجم صاحب رام ہو چکے تھے۔ وہ شیخ صاحب

کے ساتھ میرے پاس سے گزرے اور مدھم آواز میں بولے:

"بس اب آپ فکر نہ کریں شیخ صاحب! کہہ جو دیا سعیدہ میری بہن ہے۔ آپکو فکر کی ضرورت نہیں۔"

پتہ نہیں سعیدہ کا سامان بغیر ڈیوٹی کے گھر پہنچ گیا کہ نہیں صرف نجم نے مجھے کیمرہ ادھار دینے سے انکار کر دیا۔

یہ مت سمجھئے کہ شیخ صاحب بگلا بھگت آدمی تھے۔ ان کی سلیٹ مکمل طور پر صاف تھی۔

ان کی آمدنی میں کبھی ایک کوڑی بھی حرام کی شامل نہ ہوئی۔

وہ کبھی رشوت دینے یا لینے کے مرتکب نہ ہوئے۔

وعدے کے پابند۔

حقوق العباد پہ سختی سے کاربند

سارا محلہ گواہ ہے کہ شیخ صاحب بڑے سچے آدمی تھے۔

یہ اور بات ہے کہ ان کی وجہ سے کئی ایسے سچے آدمی جھوٹ پر آمادہ ہوئے جو ابھی شیخ صاحب کی طرح سچے نہ بنے تھے (جو ابھی اپنے راستے پر مکمل یقین نہ رکھتے تھے راسخ العقیدہ نہ تھے۔

میں ابھی ابھی شیخ صاحب کے گھر سے آیا ہوں۔

وہ پلنگ پر ایسے پڑے ہیں جیسے کاٹھ اخروٹ کی لکڑی سے بنے ہوں۔ ناک آنکھیں، ٹھوڑی، پیشانی سب میں موسموں کو جھیل لینے کی سختی ہے۔ اپنے مسلک پر جمے رہنے کا پختہ یقین ہے ــــ عورتیں تو ضعیف الاعتقاد ہوتی ہیں۔ خواہ مخواہ سوچتی ہیں کہ شیخ صاحب جیسے آدمی سے بھی منکر نکیر حساب لیں گے؟

حساب کتاب سے شیخ صاحب کا تعلق؟

اور پھر یہ بھی اعتقادات کی بات ہے۔

بھلا ایسے آدمی کا حساب کیا جس کی اپنی پلیٹ بالکل صاف ہو۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ شیخ صاحب کی وجہ سے کئی لوگ بھٹک گئے۔ لیکن شاید ان لوگوں کو بہر کیف شاہراہ سے پگڈنڈیوں پر اترنا ہی اترنا تھا!

ایسے رنگروٹ تو ہر وقت برائی کی تعلیم لینے کو تیار رہتے ہیں۔ اس میں بھلا شیخ صاحب کا حساب کتاب کیسا؟

کینچلی

میں اپنے برآمدے میں گھر کی گھنٹی بجانے کے بعد بالکل کسی مہمان کی طرح منتظر بیٹھا تھا گھر والے شاید سو رہے تھے۔

لوگ گرمیوں میں شام کے چار بجے عموماً سویا ہی کرتے ہیں۔ گھنٹی بجانے والوں کو یہ بات تو بھول جاتی ہے۔ وہ صرف اس قدر یاد رکھتے ہیں کہ اب تو چار بج چکے ہیں ملنے ملانے کا وقت ہو گیا ہے۔ گھر والے بیدار ہو چکے ہوں گے۔ میں نے دوبارہ گھنٹی بجائی اور پھر اینگل آئرن کے غیر آسودہ صوفے پر بیٹھ گیا۔

شاید میری دونوں بیٹیاں اپنی ماں کے ساتھ شاپنگ پر گئی ہوں۔ بیٹا گھر کی خاموشی سے تنگ آ کر ہمسائے میں کسی دوست کے گھر کیسٹ سننے چلا گیا ہو۔ رفیق ملازم تھوڑی تھا۔ وہ تو اس گھر کا چوہدری تھا اس لئے عین ممکن ہے کہ اس وقت وہ ریڈیو فل بلاسٹ لگائے پنکھے کو فل سپیڈ پہ چلائے بنیان پہنے الانی چارپائی پر فل ٹاس سو رہا ہو۔

لیکن یہ لوگ اگر جاگتے بھی ہوتے۔ اگر میں گھر کے اندر داخل بھی ہو جاتا تو ایک عرصہ سے اس گھر کے لوگ کہیں چلے گئے تھے۔ میری بیوی اور بیٹیاں ایک ٹولا تھیں۔ منگنیاں، شادیاں، آمین، میلاد، مینا بازار، انارکلی، پینوراما سنٹر ان کے کئی ساجھے کھاتے تھے۔ وہ تینوں آپس میں خوش تھیں۔ دونوں بیٹیوں کے جہیز بن رہے تھے۔ کپڑے اور زیور کی باتیں میں سنتا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

نو رہتا لیکن جیسے آدمی ٹیلی فون پہ باتیں سنتا ہے - آدھا حاضر آدھا غائب۔ میری بیوی بھی سینگ کٹا کر بچھڑوں میں شامل ہو گئی تھی۔ نئی تراش کا لباس، نئی وضع کے بال، باتوں میں آزادی۔ قہقہوں میں عجیب قسم کی بے حیائی ..... بیٹیوں سے مستعار لی ہوئی جوانی۔

میری بیٹیوں کو مجھ میں صرف اتنی دلچسپی رہ گئی تھی کہ میں چیک لکھ کر دیتا رہوں اور وہ خرچ کرتی رہیں۔ باقی وقت وہ بازاروں میں اپنی ماں کے ساتھ گزارتی تھیں جو تھوڑا بہت وقت پیسوں کی طرح بچ جاتا اسے وہ ٹیلی فون پہ صرف کر دیتیں۔

ساجد بے چارہ تھرڈ ایمپائر تھا۔ گم سم سا نوجوان ـــــ ابھی ٹھیک سے زندگی کے ساتھ سمجھوتہ نہ کر سکا تھا۔ اس کی موری بند جینز اور تولیے کے کپڑے کی بنیان تلے ایک دبلا سا جسم تھا۔ ہنسلی کی ہڈیاں ابھری ہوئی اور آنکھوں کے نیچے گوشت دھنسا ہوا تھا۔ اس دُبلے پن کے باوجود وہ صبح پانچ بجے جوگنگ کرنے جاتا۔ اپنی ڈائٹ کنٹرول کرنا فرض سمجھتا اور شام کو سوئمنگ کے لیے چلا جاتا۔ اس کے مشغلے محدود تھے۔ موٹر سائیکل چلانا، کیسٹ پہ ڈسکو موسیقی سننا، رغبت سے کوک پینا، آئسکریم کھانا، ٹیلی فون کھڑکانا، ٹیلی وژن دیکھنا، اور دوستوں کو باپ کے سٹیٹس سے مرعوب کرنا ..... لیکن بیوی بچوں پہ ہی کیا موقوف تھا پتہ نہیں شہر کے جملہ لوگ کہاں چلے گئے تھے۔ چلو میرے جگری دوست خواجہ اور مظفر کی تو تبدیلی ہو گئی لیکن باقی میل ملاقات کو کیا ہوا۔ جہاں جہاں میں جوانی میں اپنی بیوی کے ساتھ باقاعدہ جایا کرتا تھا اب ان گھروں میں پانچ سات منٹ کے بعد گفتگو کے سگنل ہی آنے بند ہو جاتے۔

کچھ ایسے دوست احباب بھی تھے جن کے ساتھ میری بہت پرانی دوستی تھی لیکن یہ دوست جیسے کپڑا شرنک ہو جائے تو فٹ نہیں آتا، یہ دوست بھی وقت کے ساتھ شرنک ہو گئے تھے یا شاید میں ہی کسی اور سمت میں نکل گیا تھا۔

میں نے گھڑی دیکھی تو چھ بج رہے تھے۔ گھنٹی بجائی اور جالی کے دروازے کے ساتھ کندھا لگا کر کھڑا ہو گیا۔

بنیان اور پاجامے میں ملبوس رفیق نے دروازہ کھولا۔

"آئیں سر جی۔ بڑی مزیدار فلم ہو رہی ہے۔ ہیرو کو مار پیٹ رہی ہے۔"

"میں دو گھنٹے سے گھنٹی بجا رہا ہوں دروازہ ہی نہیں کھلتا۔"

"بیگم صاحب کہہ رہی تھیں کہ دروازے پہ کوئی ہے۔ ہم سب سمجھ رہے تھے سر جی کہ فلم میں گھنٹی بجتی ہے۔ آجائیں آجائیں ....."

رفیق مجھے دعوت دے کر پھر کوٹھے پر اوپر والے لاؤنج میں چڑھ گیا۔ غالباً سب وی سی آر پہ کوئی ہندوستانی فلم دیکھ رہے تھے۔ میں آہستہ آہستہ اپنے کمرے میں گیا۔ غسل کیا۔ کپڑے تبدیل کیے۔ اپنا پاسپورٹ ویزا دراز میں سنبھال کر رکھا اور پلنگ پر لیٹ کر جب میں نے تکیہ تہ کر کے گدّی کے نیچے رکھا تو اوپر کی فلم ختم ہوئی اور وہ سب سلیپر گھسیٹتے ہنستے ہنساتے گردنیں پونچھتے میرے کمرے میں آ گئے۔ انہیں معلوم ہی نہ تھا کہ میں چار بجے کا آیا ہوا ہوں۔

"ویزا مکمل ہو گیا ....." بوڑھی نوجوان بیوی نے مسکرا کر پوچھا۔

"کس کس شہر کی اجازت ملی ابو ....." بڑی بیٹی نے سوال کیا۔

"دھرمسالہ، گورداسپور، امرتسر ....."

"ابو ..... کیا کریں گے آپ وہاں ..... ہمارے بغیر ....."

"کم از کم آپ مجھے ساتھ لے جاتے ابو ....." گہری آنکھوں والے ساجد نے قدرے غم سے کہا۔

لیکن میں تو ان سب کو ساتھ لے جانا نہیں چاہتا تھا۔ میں تو اپنے بچپن سے مصافحہ کرنے اپنی اوائلِ جوانی کی یادوں کو تازہ کرنے ان دوستوں سے ملنے جا رہا تھا جن کو میں ان گھر والوں سے بہت پہلے جانتا تھا۔ کوئی چیز کوئی جذبہ کوئی ایسی بات تھی جو مجھے یقین دلا رہی تھی کہ جس وقت میں دھرمسالہ کے کوتوالی بازار میں پہنچوں گا تو ایک بار پھر میں زندوں میں سے ہوں گا۔ میرے پیر زمین پہ ہوں گے اور میں زندگی سے لاتعلق نہ رہوں گا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

میرے اردگرد میرا خاندان ہندوستان کے متعلق سوالات کرتا رہا لیکن میں غیر حاضر تھا۔ میری نظروں میں وہ مناظر گھوم رہے تھے جن میں میرے شعور نے پہلی مرتبہ جنم لیا۔ بھاگسو ناتھ، گھنیارا، اپر دھرمسالہ، ڈل لیک،..... کیا اب بھی وہ مندر وہیں ہوگا جو کوتوالی بازار کی چڑھائی سے نظر آتا تھا۔ کیا اب بھی صبح کے وقت دھولی دھار کا پہاڑ سفید برف کا کوٹ پہنے پہاڑوں کے پیچھے سے نظر آتا ہوگا..... وہ ساری وادی جس میں یول کیمپ آباد تھا۔ جو رات کے وقت دیوالی کی طرح جگمگاتی تھی، کیا اب بھی وہ وادی ویسے ہی ہوگی..... نیچے بھیڈی خانے کی آبادی کیا ویسے ہی ہوگی..... اپر دھرمسالہ کے چوک میں کیا نارو جی کی دکان میں اسی طرح دھند آتی ہوگی..... کیا گوروں کے قبرستان میں لارڈ ایلگن کی قبر کے اردگرد اب بھی ڈیلیا کے پھول ہوں گے..... کیا قبروں کے اردگرد بنی ہوئی روشوں پہ سلیٹی رنگ کی بجری پڑی نظر آئے گی.....

وہ مناظر زندہ تھے..... ان پر چڑھنے والا سورج اور غروب ہونے والی چاندراتیں اب بھی سانس لے رہی تھیں۔ چیڑھ کے اونچے اونچے درخت، مرونت سے لدی ہوئی جھاڑیاں، سرخ پھولوں سے آگ بنے ہوئے بن کے درخت اور سڑکوں کے کنارے چمکیلی ہری کونپلوں والی آکھے کی جھاڑیاں..... میں ان تمام مناظر میں لوٹ جانے کے لئے بے قرار تھا۔ ان مناظر میں، میں زندہ ہو سکتا تھا۔ یہاں سے وہاں تک کل ۲۴ سال کا وقفہ تھا۔ ان ۲۴ سالوں میں جو بھی واقعات ہوئے جن لوگوں سے میں ملا وہ سب کچھ خواب میں گزارے ہوئے لمحات کی طرح تھے اور ان خوابوں کے پرے ایک حقیقت تھی..... ایک زندہ حقیقت.....

دھرمسالہ..... اور اس کی نوعمری۔

اس نوعمری میں قینچی موڑ پر وہ مجھے ملی تھی..... پہاڑی لڑکی..... ایسی پہاڑی لڑکی نہیں جیسی فلموں میں ہوتی ہے بلکہ ایک پڑھی لکھی پہاڑی لڑکی جو شانتی نکیتن میں پڑھتی تھی۔ اور کوتوالی بازار سے اوپر اس سڑک پر رہتی تھی جس سے ایک پگڈنڈی پردہ باغ کو جاتی تھی۔

اس کا چہرہ ہاتھ بازو سب زرد زرد تھے۔ لہو اس میں نام کو نہ تھا۔ موڑ کے بڑے پتھر پر وہ اکیلی بیٹھی تھی۔ شاید اسے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ اس جنگل میں بہت زیادہ بندر بھی رہتے ہیں کیونکہ وہ بڑی شانتی سے ایک اونچے درخت کی ہلتی شاخوں کو دیکھ رہی تھی۔ پھر اچانک ان ہلتی شاخوں سے بندر اچھل اچھل کر سڑک پر آنے لگے تو وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور شاید اس نے دل میں شکریہ ادا کیا کہ میں سڑک پر چلا آ رہا تھا وہ مجھ سے دو تین قدم پیچھے پیچھے چلنے لگی۔

اس کا ہر قدم سڑک پر نہیں میرے کہیں اندر پڑ رہا تھا ہم دونوں میں عمر کا غالباً کچھ زیادہ فرق نہ تھا۔ تعلیم کا بھی نمایاں فاصلہ نہ تھا لیکن ہم دونوں کے درمیان دو تین قدم کا فاصلہ ہمیشہ رہا۔ اس زمانے میں بہت قریب آنے کے اگر مواقع بھی مل جاتے تو حوصلہ نہ پڑتا۔

جب ہم دونوں کلب کے پاس پہنچے تو اس نے سڑک کے ساتھ ساتھ بہنے والی کول میں ہاتھ دھوئے۔ میں سڑک کے دوسرے کنارے اس کی طرف پشت کر کے کھڑا رہا۔ گو میرا چہرہ نیچے وادی کی طرف تھا لیکن میں اسے اچھی طرح دیکھ سکتا تھا۔ اس کے گھنے ہاتھوں کے بھیگے ہوئے ناخن، پنجوں پر اکٹھا جسم، سب میری نظر میں رہا۔

"میرا نام ریاض ہے"۔

میں نے ہوا میں کسی کو بتایا۔

"جیون ـــ" اس نے سڑک کو اطلاع دی۔

"جیون؟..... یہ کس کو جیون دینے کے لئے پیدا ہوئی ہے"۔

دھرمسالہ میں چڑا پونجی کے بعد بارش ہوتی ہے۔ جولائی اور اگست کے مہینے میں سورج دیکھنے کے لئے ترستے ہیں۔ پندرہ دن کی جھڑی لگتی ہے اور کہتے ہیں کہ کرلی اپنے انڈے سیتی ہے۔ اس دوران اگر سورج نکل آئے تو کرلی کے تمام انڈے تباہ ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد کرلا انڈوں پہ بیٹھتا ہے اور ایسی جھڑی لگتی ہے کہ پہاڑ اپنی جگہ سے سرکنے لگتے ہیں۔ لینڈ سلائیڈ ہوتے ہیں۔ کولیں پانیوں سے بھر جاتی ہیں اور گھروں کے اندر جوتے، قالین

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اور بستروں کو پھپھوندی لگ جاتی ہے۔

جیون مجھے ایسی ہی بارش میں بھگو گئی۔ وہ گرمیوں کا موسم گزارنے دھرمسالہ آئی ہوئی تھی۔ ستمبر میں پھر اسے شانتی نکیتن لوٹ جانا تھا۔ ان برساتوں میں وہ کئی بار مجھے سڑکوں پر ملی۔ ہر مرتبہ ہم دونوں نے اپنا اپنا تعارف کرایا۔

"مجھے ریاض کہتے ہیں"۔

"جیون۔۔۔۔"

اس کے چلے جانے کے بعد مجھے پھپھوندی لگ گئی۔ میں کئی بار اس کے گھر گیا۔ ٹھیکیدار صاحب اور اس کے گھر والے مجھے بڑی محبت سے ملتے اور پھر جیون کی باتیں ہوتیں جو شانتی نکیتن میں پڑھتی تھی اور سادھنا بوس کی طرح ناچتی تھی۔

نہ میں نے شانتی نکیتن کے درشن کئے تھے نہ میں نے کبھی جیون کو ہی ناچتے دیکھا تھا۔ ہم دونوں تو اپنا اپنا تعارف کرانے سے کبھی آگے نہ بڑھ سکے لیکن پتہ نہیں کیا بات تھی چونتیس برس گزر جانے کے باوجود ابھی تک اس تعارف کو مکمل کرانے کی آرزو مجھ میں کہیں دھڑک رہی تھی۔

اور پھر دھرمسالہ میں سریندر بھی تو تھا۔

ہم دونوں سکول اور کالج کے سیکنڈ ایئر تک اکٹھے پڑھتے رہے تھے۔ سریندر کا باپ وکیل تھا۔ اور گھنیارا والی سائڈ پر کھڈ کے پار رہتا تھا۔ وہ اور میں ڈل کے میلے پر اکٹھے جایا کرتے تھے بلکہ بھاگسو اور ڈل لیک سے مجھے متعارف کرانے والا ہی وہ تھا۔

"سریندر۔۔۔۔ سریندر۔"

وہاں وہ سب کچھ ہے جو یہاں نہیں ہے۔ وہاں جیون ہے۔ اور یہاں صرف ایک ایسا برآمدہ ہے جہاں کھڑے ہو کر گھنٹی بجانے پر بھی کوئی باہر نہیں نکلتا۔

اسی سب کچھ کی تلاش میں پاسپورٹ، ویزا، ہندوستانی کرنسی اور کئی واقف کاروں کے پیغامات لے کر میں ہندوستان روانہ ہوا۔ دل میں اپنے بچپن کے شہر کو دیکھنے کی آرزو دلہن

کی طرح شرمائی شرمائی بیٹھی تھی۔

جس وقت میں لوئر دھرمسالہ کے بازار میں اترا تو پہلی بار میں نے محسوس کیا کہ وہ شہر جو میں بچپن میں دیکھ چکا ہوں غالباً یہ وہ شہر نہیں ہے۔ سب جگہ آباد تھی۔ نئے نئے چہرے، نئے نئے گھر، آوازیں۔۔۔۔ ایسی آوازیں جو یہاں سے کبھی نہ آتی تھیں، آ رہی تھیں۔ مہذب انسان جہاں بھی جاتا ہے اتنا سارا شور ساتھ لے جاتا ہے۔

دل کو سمجھایا، تب دھرمسالہ کی کل آبادی پانچ ہزار تھی۔ اب تیس پینتیس ہزار کے لگ بھگ ہے۔ شور تو ہوگا ہی۔۔۔۔ اس میں دھرمسالہ کا قصور نہیں، لوگوں کا ہے۔

مناظر استعمال شدہ صوفے کی طرح تھے۔ جگہ جگہ سے روئی جھانک رہی تھی، سپرنگ ننگے ہو گئے تھے۔ آنکھ کے درختوں کی شکل بدل گئی تھی۔ نہ بھاگسو تھا نہ ڈل لیک۔

ڈل لیک ایک گدلے پانی کی جھیل تھی جس کا سیف الملوک کے پانیوں سے کوئی مقابلہ نہ تھا۔ صبح جب دھولی دھار نکلا تو اس کی اونچائی، ہیئت اور خوبصورتی بھی مشکوک تھی۔ ہوٹل سے سارا وقت ایسی خوشبو اٹھتی تھی جس کا ناک عادی نہ تھا۔

میں پھرتا رہا۔

اجنبی مناظر میں۔۔۔۔ اجنبی چہروں میں۔۔۔۔ فضا، ہوا، درخت پہاڑ سب بدل چکے تھے۔ اسی طرح پھرتے پھرتے میں نے سریندر کو تلاش کر لیا۔ وہ مجھے اپنے گھر لے گیا۔ گھر بڑا تھا۔ اس کی بیوی پڑھی لکھی اور بچے ماڈرن تھے۔ وہ سب بظاہر مجھ سے بڑی اچھی طرح سے پیش آئے لیکن ان کے چہرے پر ان کے دل کے اندر میرے خلاف کہیں کدورت تھی۔۔۔۔

۔۔۔۔ جیسے اس بیوی کے دل میں ہوتی ہے جس کا شوہر اسے چھوڑ کر نئی بیوی اپنا لے۔

سریندر نے مجھے ہندوستان کی معاشی ترقی کے متعلق بہت کچھ بتایا۔ اس کی تان ہر بار اس بات پر ٹوٹتی تھی کہ دیکھو ہندوستان ڈیزل انجن بناتا ہے، پاکستان ایسے انجن بنا سکتا ہے۔ نہیں بنا سکتا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"ہندوستان اپنی موٹر کار بناتا ہے . . . . . تم کاریں امپورٹ کرتے ہو"۔

"کتنی بُری بات"۔

"ہندوستان ہر سال اتنے کارخانے لگاتا ہے"۔

"ہندوستان میں مہنگائی نہیں ہے"۔

"ہم لوگ ساتھ ہیں وطن پرست ہیں"۔

میں سریندر کے پاس سارا وقت نہیں بیٹھا رہا بلکہ تھانے میں آیا بیٹھا تھا۔ اس کی تمام باتوں میں انکساری اور پیار کے باوجود ایک احساس برتری تھا۔ میں دوست سے ملنے گیا تھا۔ میری ملاقات ایک وطن پرست ہندوستانی سے ہوئی۔ وہ مجھے کئی جگہ لے گیا کئی کھانے کھلائے۔ کئی لوگوں سے ملایا۔

لیکن میری اس سریندر سے ملاقات نہ ہو سکی جس سے ملنے میں دھرمسالہ گیا تھا میں اس ملنساری سے ہاتھ ملانے نہیں گیا تھا۔ جو ہندوستان کے باشندے بطور قومی ذمہ داری کے ہم سے استعمال کرتے ہیں۔ وہ اور میں اکٹھے رہے اور اس کے باوجود میں نے محسوس کیا کہ وہ کسی اور سمت میں بڑھ گیا ہے اور میں کسی اور سمت میں پھیل گیا ہوں۔ ہماری شاخیں آپس میں گھتم گتھا نہیں ہو سکتیں۔

سریندر سے ملنے کے بعد میں جیون سے ملتے ڈرتا تھا۔

لیکن پھر بھی میں ٹھیکیدار صاحب سے ملنے گیا۔

پہلا مکان ڈھا دیا گیا تھا۔ اس کی جگہ اب نیا ڈھنگا تعمیر ہو چکا تھا اور ایک خوبصورت کوٹھی سڑک کے کنارے کھڑی تھی' بالکل گڑیا گھر۔ پہلے تو ان سب نے مجھے پہچاننے سے انکار کر دیا لیکن پھر جیون اندر سے آئی۔

اس کی شکل، آواز، جسم کسی ہیڈ مسٹریس جیسا تھا۔

چہرہ پورے چاند کی طرح گول اور ڈبل چن نے اس گولائی کو نیچے سے بیضوی بنا دیا تھا۔

جسم پر کاٹن کی خوبصورت ساڑھی تھی۔ ایسی ساڑھی جو پاکستان کی بیگمات بہت پسند کرتی تھیں بالوں کے جوڑے میں موتیے کی کلیوں کا ہار لپٹا ہوا تھا۔

"یہ جیون نہیں ہو سکتی"۔ میں نے اپنے دل میں کہا۔ یہ کسی کی جیون جوتی نہیں ہو سکتی۔ ایسی صورتوں اور جسموں والیاں تو جلتے دیئے بجھا دیتی ہیں۔ مجھے وہ جیون یاد تھی جس کا انگ انگ ہوا کے جھونکوں نے زرد کر رکھا تھا۔ جس کی لمبی سیاہ چوٹی میں ہمیشہ ایک جنگلی گلاب لٹکا ہوتا۔ ابھی گرا کہ گرا۔ جو شانتی نکیتن میں پڑھتی تھی۔ جس کے جسم کے ہر بل میں نرت تھا۔

یہ موٹی، دبنگ، اونچی آواز میں بولنے والی . . . . . سارے گھر پہ کار ڈر چلانیوالی کون تھی . . . . . کیا گھوڑے کے اندر سے گدھا نکل آیا؟ کیا تاکستان کی میٹھی بیل کو نمکولیاں لگنے لگیں۔

"میرا نام ریاض ہے۔" میں نے بمشکل تمام کہا۔

"میں نے پہچان لیا ہے آپکو . . . . . اف شرماں آپ کتنے بدل گئے ہیں۔ بال بھی سفید کر لیے ہیں . . . . . آؤ . . . . . نینا، منوج . . . . . بملا . . . . . انکل ریاض سے ملو . . . . . یہ بڑے ہینڈسم ہوتے تھے۔ لڑکیاں انہیں گھور گھور کر دیکھا کرتی تھیں . . . . ."

نینا، منوج اور بملا نے انکل ریاض پر نگاہ ڈالی اور پھر تعجب سے اپنی ماں کو دیکھا۔ تو یہ بڑی جنریشن بھی کتنے جھوٹ بولتی ہے۔ بھلا انکل ریاض کبھی ہینڈسم ہو سکتے ہیں؟

میں کتنی ہی دیر وہاں بیٹھا سامنے وادی کی طرف دیکھتا رہا جہاں دریائے بیاس کہیں دُور ایک لکیر نظر آ رہا تھا۔ میں نے کئی بار کوشش کی کہ میں پینتیس سال پیچھے چلا جاؤں۔ کئی بار جیون نے چاہا ہو گا کہ وقت ایکبار پردہ اٹھا کر ماضی کی ایک جھلک دکھا دے لیکن ہم دونوں ایک ہی دستانے میں ہاتھ ڈالنے کی کوشش کر رہے تھے۔ جس وقت میں ٹھیکیدار صاحب کے پہاڑی بنگلے سے باہر نکلا تو مجھے چیڑھ کے درخت پر کسی سانپ کی لمبی کینچلی نظر آئی۔ میں نے اسے احتیاط سے اتار کر ایک پلاسٹک کے لفافے میں بند کیا اور پاکستان لوٹ آیا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جس وقت میری بیٹیاں ہینڈ پرنٹڈ ساڑھیوں کے تحفے وصول کر چکیں۔ میری بیوی نے ڈائمنڈ کا لاکٹ گلے میں ڈال لیا اور ساجد نے کھدر کا کُرتہ پاجامہ بغل میں داب لیا تو میری بیوی نے پوچھا:

"آپ اپنے لئے کیا لائے ہیں"۔

"ہاں بتایئے ابو۔ اپنے لئے کیا لائے ہیں آپ؟"

"ضرور کافی لائے ہوں گے"۔

"نہیں نہیں کاجو"۔

"موتی سوپ۔ ہیں نا ابو۔ ان کا یہی صابن مشہور ہے"۔

"سپاریاں"۔

میں نے سوٹ کیس کے نیچے سے پلاسٹک کا لفافہ نکالا اور اس میں سے سانپ کی کینچلی نکال کر سب کو دکھائی۔ لڑکیوں نے کراہت سے اس کو چھوا اور میری بیوی نے حیران ہو کر میری طرف دیکھا:

"میں یہ کینچلی لایا ہوں دھرمسالہ سے جیسے سانپ اپنی کینچلی میں دوبارہ داخل نہیں ہو سکتا...... ایسے ہی کوئی شخص اپنے ماضی سے نکل آنے کے بعد پھر اس میں داخل نہیں ہو سکتا جب جوانی، بچپن، شہر، لوگ...... دوست، محبوبائیں بچھڑ جاتی ہیں تو پھر ان سے ملاقات نہیں ہو سکتی"۔

میرا خاندان ہمیشہ کی طرح میری باتیں سمجھنے سے قاصر رہا۔

صرف ساجد نے کینچلی کی طرف ہاتھ بڑھا کر کہا: "ابو اسے میں رکھ لوں اپنے کمرے میں۔ میرے دوست بڑے امپریس ہوں گے"۔

کیمیاگر

بابا خیرو بہت کم اس قصباتی بازار کی طرف آتا تھا لیکن جب کبھی وہ آتا دکانوں کی رونق بڑھ جاتی۔ اونگھتے دکاندار اونچی آوازوں میں ایک دوسرے سے باتیں کرنے لگتے۔ سید و نقشائی بغدے سے قیمہ بناتے ہوئے نعرہ لگاتا:

"اوئے بابا خیرو چلا آ رہا ہے...... بابا خیرو...... دینے پہلوان بابا خیرو ہی تو ہے...... دیکھتے نہیں"۔

دینا لباطی پنساری بھی تھا اور آڑھت کی دکان بھی کرتا تھا۔ بابا خیرو کو نکڑ کی گلی میں سے ابھرتا دیکھتا تو اس کی باچھیں کھل جاتیں۔ چھوٹی سی دکان کی متفرق اشیا پر جا گم بھاگ سی نظر ڈالتا ہوا مکڑی کی سیڑھیوں پر آ کر کھڑا ہو جاتا اور باآواز بلند کہتا: "شیخ جی شکنجہ پھر کس لینا۔ ادھر دیکھیں کون چلا آ رہا ہے"۔

لیکن شیخ صاحب کبھی نظر اٹھا کر خیرو بابا کی طرف نہ دیکھتے۔ وہ کاغذ کو لئی سے جوڑتے جاتے ابری کو انگلیوں سے ہموار کرتے اور رشید کو متنبہ کرتے ہوئے کہتے: "بیٹا رشید۔ دیکھ گتا ٹھیک کاٹنا۔ تو ایسی کاٹ ڈالتا ہے کہ مجھے پھر کتر بیونت کرنی پڑتی ہے اور انچ انچ گتا ضائع ہو جاتا ہے۔ پیسہ دو پیسے کی آس بھی ٹوٹ جاتی ہے"۔

لیکن جلد ساز کا بچہ رشید قینچی اور گتے کو زانو پر رکھ کر ٹاٹ ایک طرف کرتا اور دینے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کی دکان پر نظریں جما لیتا۔ دینے کی کتنی ساکھ تھی سبھی اسے بھاگ کر ادھار دیتے تھے۔ شام کو نفع نقصان کا پڑتا لگانے بیٹھتا تو سکّوں کی کھنکھناتی آواز دُور تک آتی۔ اور تو اور بابا خیرو بھی ہمیشہ دینے ہی کی دکان پہ آتا۔ جلد ساز کی دکان پہ تو سکول کے وہ ماسٹر جی آیا کرتے تھے جن کی عینک کی کمانی ٹوٹی ہوتی تھی اور پاؤں میں اکھڑے ہوئے ربڑ والے فلیٹ بوٹ ہوتے تھے۔

دینا کی دکان کی دائیں طرف مولا بخش موچی اپنی صندوقچی نما دکان میں رہتا تھا اور بائیں جانب حلوائی کی دکان تھی۔ بابا خیرو کا نام سنتے ہی مولا بخش آرا اور ستالی چھوڑ کے کھسک آتا اور ہنس کر کہتا: "دینے تیری ہٹی پہ تو ہن برستا ہے ہُن۔ بابا خیرو بھی آئے گا تو تیری چوکھٹ پر ہی آئے گا۔ ہمیں اس بھنڈار میں کون پوچھتا ہے۔"

چاچا چھو حلوائی گھان میں ہاتھ ڈالتا۔ کڑکڑاتے تیل میں پکوڑے چھوڑتا اور چمک کر کہتا۔ "کبھی دو پیسے کے پکوڑے تک ہم سے نہ لئے ہم بابا خیرو کا کیا یاد کریں گے بھلا۔"

دینا ہنستا رہتا اور بابا خیرو کا منتظر رہتا۔ بابا خیرو اس قصبے کا سب سے پراسرار شخص تھا۔ وہ قصبے سے دو میل دور ریل کے پھاٹک کے پاس رہتا تھا۔ قصبے کی آبادی کے لئے وہ ایک معمے سے کسی طرح کم نہ تھا۔ ایک آنکھ پہ سبز کاغذ کی اندھیری ہوتی۔ میلی کاسنی صدری کی جیبوں میں بہت سے رقعے اور نسخے جمع رہتے۔ یوں لگتا جیسے بابا خیرو نے جیبوں میں گیندیں چھپا رکھی ہیں۔ بابا خیرو لنگڑاتا ہوا دینے کی دکان تک پہنچتا۔ اپنی پھولی ہوئی جیب کو ٹٹولتا اور سبز تہمد کو احتیاط سے سنبھالتا ہوا سیڑھیوں پر ہی بیٹھ جاتا۔ بابا خیرو الف لیلیٰ کی داستان تھا۔ وہ اس بازار میں لکھ لٹ بادشاہ بن کر کبھی داخل نہ ہوا بلکہ وہ تو دھیلے پیسے پہ جھگڑتا تھا پھر بھی اس کی باتوں میں جادو تھا۔ وہ مٹی کو سونا کرنے کا فن جانتا تھا۔ اس کی پراسرار شکل۔ اس کا اندازِ گفتگو اتنا مختلف تھا کہ دکانداروں کی اس بستی میں ہلچل مچ جاتی۔ یہاں صبح سے شام تک خون پسینہ ایک کرنے والوں کا گروہ پیسے پیسے کے لئے سرگرداں رہتا۔ جب بابا خیرو جیبوں میں نسخے چھپائے دینے کی دکان پہ چڑھتا تو ان لوگوں کو اپنی تگ و دو پہ پشیمانی ہونے لگتی اور وہ بھی سوچنے لگتے کہ کاش پیسے بنانے کا کوئی سہل نسخہ ہاتھ آجاتا تو وہ بھی ہاتھ پہ ہاتھ دھر کر آرام سے بیٹھے رہتے۔ نہ کوئی فکر رہتا نہ فاقہ۔

دینے کی دکان پر بھیڑ بڑھ جاتی۔ سیدو قصائی بغدا، چھری اپنے شاگرد کے سپرد کر کے آبیٹھتا۔ پھیری والا اپنا ریڑھا پاس کھسکا لاتا اور مولا بخش نرمی کے چمڑے کو پہ رکھنا چھوڑ کر پوچھتا: "کیوں بابا آج پھر نسخہ بنوانے آئے ہو جی"۔

بابا خیرو مولا بخش کی بات کا جواب کبھی نہ دیتا۔ اور کہتا: "دینے مجھے جلدی ہے اگر سودا دینا ہے تو دے ورنہ میں چلا۔"

چاچا چھو حلوائی کی کڑاہی میں سے تازہ پکوڑوں کی خوشبو مہکتی اور سارے بازار کو لپیٹ لیتی۔ وہ ہنس کر پوچھتا:

"بابا خیرو۔ میں نے تو سوچا ہے اب یہ دھندا نہ کروں گا۔ اگر تو اپنے ساتھ لگا لے تو خدا کی قسم اللہ کی پیراں والے کے مزار پر پھولوں کی چادر چڑھاؤں۔ سنا ہے تو نے چاندی بنا کر شہر میں بیچی ہے ــــ چاندی بنا لیتا ہے بابا خیرو۔ بتا ناں!"

بابا خیرو ایک آنکھ سے لگے سڑے کاغذ کو ٹٹول ٹٹول کر پڑھتا اور پھر دینے سے مخاطب ہوتا۔ "ہڑتال ورقیہ دو تولے۔ . . . . دیکھ پچھلی بار جو کھائی ٹھیک نہ تھی۔ ساری محنت اکارت گئی"۔

دینا ترازو پر کُپّی جماتا اور ہاتھ بھر ترازو دور کرتے ہوئے کہتا: "تو خود جو کھ لے بابا خیرو تیری اپنی دکان ہے تجھ سے فرق کی بات کبھی کی ہے۔"

مولا بخش کے جی میں ہڑتال ورقیہ کا نام سن کر کھد بد ہونے لگتی۔ وہ بابا کی بے نیازی کو سوال کر پوچھتا: "کیوں بابا خیرو۔ کیا کبھی کچھ بنا بھی ہے یا یونہی ٹامک ٹوئیاں مارتا پھرتا ہے"۔

بابا خیرو لمحے بھر کو ترازو سے نظریں ہٹا کر مولا بخش کو گھورتا۔ پھر کہتا۔ "اور تیری طرح سارا دن بیٹھا ادھوڑی کے جوتے نہیں سیتا رہتا۔ باریک کام کرتا ہوں باریک کام ـــ تیری

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جگہ میں ہوتا تو پیمانہ لگا کر کسی دن جوتی کی جگہ اپنی کھوپڑی ہی جوڑی کر لیتا۔"

مولا بخش پر ان باتوں کا کبھی کچھ اثر نہ ہوا تھا۔ وہ اپنے ہاتھی جیسے دبلے تیشے نچلے لب پر جا کر ہولے ہولے ہنسنے لگتا۔ پھر ریڑھے والا نذیرا اپنی چلم بابا کو پیش کرتے ہوئے کہتا:

"لے بابا کش لگا کش ـــ حقے کے دو مزے ہیں۔ نشے کا نشہ باجے کا باجہ۔ جلترنگ بجتا ہے میرے حقے میں۔"

دینا بڑھ کر گڑگڑی پکڑ لیتا اور بابا خیرو کو پیش کرتے ہوئے بول اٹھتا: "بابا تو پورا چلم چٹ ہے۔ ایک منٹ میں چلم گُل بن جاتی ہے ساری کی ساری۔"

بابا منہال منہ سے لگاتا تو دم بھر کو نسخہ بھول کر باتیں کرنے لگتا۔ اس کی باتوں میں بڑی ترنگ آجاتی۔ وہ کہتا:

"جب جان تھی تو حقہ پیتا تھا۔ اب تو دل بہلایا کرتا ہوں۔ نہ کبھی سلفے کا دم لگا یا نہ کبھی چرس پی۔ خالی مولی دھوئیں میں کیا دھرا ہے۔ بے بھائی دینے جلدی سے دو تولے ورق چاندی کے تو تول دے مجھے دیر ہوتی ہے۔"

اب دینا لاڈ بگھار کر کہتا: "جا پھر بابا کچھ نہیں دوں گا تجھے کھڑے گاؤں سے آتا ہے تو بھی۔ دو گھڑی بیٹھ باتیں کر۔ پھر چلے جانا۔ سچ مچ تو نے چاندی بنا کر بیچی تھی نا؟ سنا ہے گورنمنٹ تیرے پیچھے لگی رہتی ہے۔"

بابا منہ سے منہال نکال کر سرخ رنگی داڑھی میں انگلیاں پھیرتا اور کہتا: "ارے چاندی بنانا کیا مشکل ہے۔ یہاں تو چکر ہی اور چل رہا ہے۔ دیکھو جو خدا کو منظور ہوا تو ایک دن تم سب میں موتی بانٹنے آؤں گا۔"

کلفی بیچنے والا لڑکا یک لخت بول اٹھتا: "او مجھے نہ بھول جانا اس دن بابا خیرو ـــ ہم بھی تیری رعایا ہیں۔"

پھر دینا دبی زبان میں طنز کرتا: "بیچارے شیخ کو بھی یاد رکھنا۔ بے چارا گتا باندھتا باندھتا

خود کاغذ بن گیا ہے۔۔۔۔۔"

سب دکاندار ہولے ہولے ہنسنے لگتے۔

لیکن رشید کی ناک پر پسینہ آجاتا۔ وہ سوچتا ابا دینے کی دکان پر کیوں چلا نہیں جاتا۔ گھڑی دو گھڑی اگر گپ بازی ہو بھی گئی تو کون سی قیامت آجائے گی۔ جب کبھی بابا خیرو آتا وہ ٹاٹ کا پٹ سرکا کر اسے دیکھتا رہتا اور وہ تمام باتیں بھی سنتا جو دینے کی دکان پر ہوتیں۔ اس کا جی چاہتا گتا قینچی پھینک کر دینے کی دکان پر چڑھ جائے اور بابا خیرو کے پاؤں پکڑ لے لیکن ساتھ بیٹھا ہوا باپ، بالکل ویسا پھاٹک بن کر مانع ہو جاتا جو بابا خیرو کی جھونپڑی کے کچھ ہی فاصلے پر پٹڑیوں کے ادھر کھڑا تھا۔

بابا خیرو کو رشید نے پہلی بار اسی پھاٹک کے قریب دیکھا تھا۔ رشید ان دنوں گلی سے نکل کر بڑی مسجد میں پڑھنے جاتا تھا۔ بستہ بغل میں داب کر تختی جھلاتا وہ اور اس کا ساتھی حفیظا کبھی کبھی ریل کا نظارہ کرنے مسجد ہی سے غائب ہو جاتے۔ میل دو میل پیدل چلنے کے بعد جب انہیں ریل کا پھاٹک نظر آتا تو وہ دونوں بھاگنے لگتے۔ شہر کو جانے والی گاڑی کیساتھ لٹکی ہوئی خلقت کھڑکیوں میں سے جھانکتے ہوئے چہرے، گارڈ کا جنگلے دار ڈبہ ان کیلئے کتنی پراسرار چیزیں تھیں۔ سیٹی بجاتا بھاپ چھوڑتا انجن جب دور افق میں غائب ہو جاتا تو وہ دونوں خود انجن بن کر دیر تک پٹڑیوں پر کھیلتے رہتے۔ لیکن انہیں روز روز گاڑی دیکھنا نصیب نہ ہوتی کیونکہ ان کے قصبے سے پٹڑی خاصی دور تھی اور گھر پہنچنے تک اندھیرا ہو جاتا تھا۔ جس روز بھی رشید گاڑی دیکھ کر لوٹتا شیخ جی کے ماتھے پر بل پڑ جاتا۔ وہ شیشے کی موٹی عینک ناک پر چڑھاتے قہر بھری نظروں سے اسے گھورتے اور پھر انگوٹھے اور شہادت کی انگلی میں کان پکڑ کر کہتے:

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"گدھے! میں اپنی گاڑھے کی کمائی تجھ پر صرف کر رہا ہوں اور تجھے گھومنے پھرنے کا چسکا پڑ گیا ہے۔ جلد ساز کی اولاد ہے بنٹے دینے کی نسل نہیں کہ تجوری میں سے توڑے نکال نکال کر ضائع کرتا رہوں گا۔"

لیکن ایسی جھڑکیوں کا رشید پر کچھ بھی اثر نہ ہوتا۔ اس کی نظروں میں تو انجن کے گھومتے پہیئے، دور سے کوکتی ہوئی سیٹی اور ریل کا پھاٹک گھومتا رہتا۔ باپ کی جھڑکیاں کھٹا کھٹ میں کہیں کھو جاتیں اور رشید گاڑی پر چڑھ کر شہر پہنچ جاتا جہاں اونچی اونچی عمارتیں، سینما گھر اور لمبی لمبی کاریں تھیں۔

کبھی کبھی جب فقیرا اور رشید لائن پر پہنچتے اور بڑی دیر تک ریل گاڑی نہ آتی تو وہ دونوں پٹڑی سے پتھر اٹھا اٹھا کر دور دور پھینکنے لگتے اور ایسے میں رشید اور فقیرے پر علمیت کا دورہ پڑ جاتا۔

رشید کہتا: "برادرا لانتظار شدید الموت۔"

فقیرا ہنستا اور کہتا: "در یں چہ شک؟ در یں چہ شک؟"

تھوڑی دیر بعد رشید پھر کہہ اٹھتا: "بھائی الانتظار شدید الموت۔"

اب فقیرے کو غصہ آ جاتا اور وہ کہتا: "کوئی اور محاورہ نہیں آتا تجھے...... لاتقنطو ...... لاتقنطو......"

رشید بھی بپھر جاتا اور چڑ کر پوچھتا: "اچھا تجھے کوئی اور محاورہ آتا ہے۔"

"ہاں ہاں ہاں۔" فقیرا لائن پتھر سے بجاتا ہوا کہتا اور پھر بڑی سوچ بچار کے بعد بات کرتا: "اونگھتے کو ٹھیلتے کا بہانہ۔"

اس محاورے کو سن کر رشید ہمیشہ گہری سوچ میں پڑ جاتا اور چونکہ فقیرا اس کا شاگرد تھا اسی لئے وہ اسی سے پوچھتا: "فقیرے یار۔ یہاں ٹھیلتے کے کیا معنی ہیں۔"

فقیرے کو دنیا جہان کے علموں سے واقفیت تھی۔ نیلی چڑیا کے انڈے چرانے کا طریقہ وہ

جانتا تھا۔ بخارات سے انجن کیونکر چلتے ہیں اور کیسے چلتے ہیں؟ ان کے متعلق اس کی معلومات بڑی وسیع تھیں۔ مسجد کے مولوی صاحب کونسا خضاب لگاتے ہیں اور خضاب بنانے کی کون کونسی ترکیبیں ہو سکتی ہیں ان کے بارے میں بھی وہ لمبی چوڑی تقریر کر سکتا تھا لیکن جب رشید اس سے محاوروں کے معنی پوچھتا تو وہ گڑبڑا جاتا اور کہتا: "ٹھیلتے کے معنی ہیں ٹھیلے پر جانا اور کیا؟"

"یعنی یہاں کیا معنی ہونے؟"

فقیرا بدحواس سا ہو جاتا اور جلدی سے بیان کرتا: "جب ٹھیلے پر سوار ہو تو اونگھ آ جاتی ہے اور آدمی گر جاتا ہے یعنی اونگھتے کو ٹھیلہ گرنے کا بہانہ ہو جاتا ہے۔"

"اچھا۔" رشید معنوں پر غور کرتا۔

فقیرا موضوع کو پتھر کے ساتھ دور پھینک کر کہتا: "الانتظار شدید الموت۔"

اب رشید کو موقع ملتا اور وہ شیخی بگھارتا ہوا چلاتا: "لاتقنطو...... لاتقنطو۔"

اور بار ہا ایسا ہوتا کہ دور سے ریل گاڑی کے پہیے لاتقنطو کا ورد کرتے فضا میں بھنبھناہٹ سی پیدا کرتے سنائی دیتے۔ ریل کا پھاٹک بند ہو جاتا۔ رشید اور فقیرا بستے اور تختیاں سنبھال گاڑی کے انتظار میں جھٹ بن کر کھڑے ہو جاتے۔ لیکن ایک دن گاڑی بہت لیٹ ہو گئی تھی۔ فقیرا گھر سے ایک پیسہ چرا کر لایا تھا اور انہوں نے یہ پیسہ لائن پر دس جگہ جما کر اٹھا لیا تھا۔ انھیں اُس دن گاڑی کا کتنا انتظار تھا۔ گاڑی آتی پیسہ پچکتا تو پھر کہیں ان کا تجربہ صحیح نکلتا۔ وہ چلتے چلتے پھاٹک کے بہت قریب آ گئے تھے۔ شام کے دھندلکے میں پھاٹک کے چوکیدار کی کڑکڑی کے پھول چمک رہے تھے اور دور سٹیشن کی بتیوں کی روشنی مدھم سا ہیولا بنی فضا کو منور کر رہی تھی۔

اس دھندلکے میں سٹیشن کی طرف سے ایک آدمی عین پٹڑی کے درمیان میں سے آتا ہوا دکھائی دیا۔ یہ آدمی دائیں پاؤں کو دبا کر لنگڑاتا ہوا چل رہا تھا اور اس کی تہمد ہوا میں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اڑ رہی تھی۔ فقیرا اور رشید خواہ مخواہ گھبرا کر ایک جھاڑی کے پیچھے چھپ گئے۔ بابا خیرو عین پٹڑی کے وسط میں ابھرتا آیا۔ اس کی مہندی رنگی داڑھی سیاہ نظر آ رہی تھی اور وہ اپنے آپ سے باتیں کئے جا رہا تھا۔ جب بابا ان سے کچھ فاصلے پر پہنچ گیا تو فقیرا نے رشید کو کہنی ماری اور پیچھے چلنے کا اشارہ کیا۔ بابا خیرو پھاٹک سے نکلا اور پکی سڑک پہ ہولیا۔ فقیرا اور رشید جونہی پھاٹک کے دوسری طرف پہنچے چوکیدار نے پھاٹک بند کر دیا۔ دُور فضا میں لاتقنطو پکارتی ہوئی گاڑی کی جھنجھناہٹ بلند ہوئی۔ لیکن آج ان کے سامنے ایک نئی کہانی تھی۔ ایک گاڑی سے بڑی پراسرار شخصیت لنگڑاتی چلی جا رہی تھی۔ انہیں تو یہ بھی بھول گیا تھا کہ لائن پر فقیرے کا اکلوتا پیسہ انجن کے انتظار میں ہولے ہولے لرز رہا تھا۔

بابا خیرو نے اپنی کوٹھڑی کا پٹ بند کر لیا تو رشید اور فقیرا نے درز میں سے جھانکنا شروع کیا۔ اندر اندھیرا تھا اور بابا خیرو بدروح کی طرح اِدھر اُدھر منڈلا رہا تھا۔ پھر طاقچے پر مٹی کا دیا جلا۔ بابا خیرو نے چٹائی پہ بیٹھ کر اپنی جیبوں کو ٹٹولنا شروع کر دیا۔ آہستہ آہستہ چٹائی پہ ننھی ننھی پڑیوں کا ڈھیر لگ گیا۔ پھر بابا خیرو نے کہیں سے ایک پرانا ترازو نکالا اور ایک ایک پڑیا تولنے لگا۔ انجن کی آواز اب بہت بلند ہو گئی تھی اور اس کی گڑگڑاہٹ چلا کر انہیں پکار رہی تھی۔ وہ دونوں لائن کی طرف بھاگے۔ چمکتے ہوئے جگنوؤں کی قطار بہت دور نکل چکی تھی۔ فضا میں غبار تحلیل ہو چکا تھا لیکن چمکتی لائن پر پھیلا ہوا پیسہ پڑا تھا۔ ان دونوں کو بابا خیرو بھول گیا اور وہ خوشی سے اچھلنے لگے۔

دوسرے دن وہ دونوں لائن پر نہ جا سکے لیکن رشید کے دل میں ہلچل سی مچی تھی۔ رہ رہ کر اس کے ذہن میں بابا خیرو کی تصویر ابھرتی رہی۔ وہ ساری رات بابا خیرو کے متعلق سوچتا رہا باوجودیکہ دونوں کان ابا جی کی تواضع کے باعث درد کر رہے تھے لیکن بابا خیرو کا پراسرار وجود

ان کی طرف توجہ بھی نہ کرنے دیتا تھا۔ رات بھر وہ عجیب عجیب خواب دیکھتا رہا۔ جیسے مدھم دیا جلا کر وہ غاروں میں پھرتا رہا ہو اور کوئی بڈھا لاٹھی اٹھائے اس کے تعاقب میں بھاگ رہا ہو۔ اس خواب نے کئی صورتیں اختیار کیں لیکن اس خوف کا تانا بانا قائم رہا جو اس کے دل کو گھیرے ہوئے تھا۔

مسجد میں سورۂ مزمّل کو رٹتے رٹتے وہ رک گیا اور فقیرا سے پوچھنے لگا:

"یار وہ آدمی کون تھا؟"

"کون سا آدمی؟" مولوی جی کی نظر بچا کر فقیرا نے جواب دیا۔

"وہی کل شام والا۔"

"وہ تو بابا خیرو ہے۔ ہماری دکان پر آتا ہے۔"

مولوی صاحب غیر متوجہ دیکھ کر گرجے: "ارے خنزیرو! گھر سے یہاں باتیں کرنے آئے ہو؟ ابھی مرغا بنا دوں گا تو سب باتیں اڑن چھو ہو جائیں گی۔ پتہ نہیں انہیں ایسی کونسی ضروری باتیں کرنا ہوتی ہیں۔ کیوں بے بنٹے کی اولاد۔ کیوں بھکار رہا تھا اس ٹٹ پونجیے کو۔"

"کچھ نہیں جی"۔ فقیرا منمنایا۔

"اب جو آواز آئی تو الٹا لٹکا دوں گا" مولوی صاحب گرجے۔

رشید نے پھر سورۂ مزمّل کو لمبی لمبی آوازیں لگا کر پڑھنا شروع کیا لیکن اس کی نظروں کے سامنے پھر جھونپڑی اور بابا خیرو آ گئے۔ وہ فقیرے کو کہنی مار کر بولا:

"یار تمہاری دکان پر بابا کیا کرنے آتا ہے"۔

دینے بساطی کے لڑکے فقیرے نے گردن اٹھا کر فخر سے کہا: "سودا لینے آتا ہے اور کیا؟"

"کیسا سودا؟"

"بعد میں بتاؤں گا۔ مولوی صاحب دیکھ رہے ہیں۔"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اتنے میں مولوی صاحب نے انہیں للکارا۔ دو دو دھولیں گدی پر جمائیں اور مکتب کے تمام بچوں کے سامنے مرغا بننے کا حکم صادر کر دیا۔

شام کو جب وہ دونوں گھر کی طرف پلٹ رہے تھے تو رشید کے لبوں پر سوالوں کی بوچھاڑ تھی فقط فقیرے کا موڈ خراب تھا۔ اسے رہ رہ کر مولوی صاحب کی جھڑکیوں پر غصہ آ رہا تھا۔ اس کا بس چلتا تو مولوی صاحب کو چٹکی بھر زہر کھلا دیتا۔

بستہ جھلاتے ہوئے وہ بولا: "مجھے ایک عمل آتا ہے اگر چالیس دن پڑھیں تو پھر جس کسی پہ پڑھ کر پھونک دیں بس وہیں بھسم ہو جاتا ہے۔ اس کی راکھ تک نہیں ملتی۔"

اگر کبھی پہلے دن ہوتے تو رشید کا تخیل بھڑک اٹھتا لیکن اس دن تو اس پر بابا خیرو سوار تھا۔ اس نے سنی ان سنی کر کے کہا:

"بابا خیرو تمہاری دکان پر کب آتا ہے۔"

"کبھی کبھی آتا ہے — مولوی صاحب کی کیا بساط ہے۔ بڑے بڑے اس عمل کے سامنے ٹھہر نہیں سکے بس پڑھنے کی دیر ہے۔ جتنی دیر یہ عمل کریں ناں تو ایک سبز چادر باندھ کر کسی کھجور کے پیڑ تلے چلہ کاٹنا پڑتا ہے۔"

"کیوں آتا ہے بابا خیرو۔"

"نسخہ بنوانے اور کیا؟"

"چاچا دینا علاج بھی کرتا ہے کیا؟" رشید نے پوچھا۔

"علاج؟ کیوں علاج کیا؟"

اب رشید نے خفیف ہو کر کہا: "خود ہی تو کہہ رہا تھا کہ بابا خیرو نسخہ بنوانے آتا ہے"۔

فقیرا دیر تک ہنستا رہا۔ مولوی صاحب کی بخشی ہوئی بے عزتی کا رونا ڈھل گیا۔ اسے یوں محسوس ہوا کہ ابھی اس سے بھی گھٹیا اور ذلیل لوگ دنیا میں زندہ ہیں۔ اس لئے جب ہنس ہنس کر تسلی ہو گئی تو بولا: "ارے گدھے! وہ کوئی بیمار تھوڑا ہی ہے۔ وہ تو دوسری طرح کے نسخے بنوانے آتا ہے۔ جادو کے نسخے . . . . گنڈے تعویز کی چیزیں لینے آتا ہے بابا خیرو۔"

"ہیں؟"

"اور کیا بابا خیرو تو جادوگر ہے. . . . . بڑے بڑے جن اس کے تابع ہیں۔ چاہے تو راتوں رات مولوی صاحب کی چارپائی اٹھوا کر قبرستان میں پہنچا دے چاہے تو تمہارے قصبے میں لال آندھی آ جائے۔"

"اچھا؟"

فقیرا اور بھی پھولنے لگا. . . . . "اور کیا۔ میرا چاچا باتیں کیا کرتا ہے۔ چاچا کہتا تھا کہ ایک دن بابا خیرو نے مٹی کو ہاتھ لگایا تو وہ چاندی بن گئی اور پھر وہ یہ چاندی لے کر بیچنے شہر چلا گیا۔"

رشید نے پریشان ہو کر پوچھا: "تو پھر بابا اس جھونپڑی میں کیوں رہتا ہے۔ اپنی کوٹھی کیوں نہیں بنوا لیتا تحصیل دار صاحب کی طرح. . . . ."

فقیرا نے قہقہہ لگایا اور ہنس کر بولا۔ "مولوی صاحب ٹھیک کہتے ہیں ہے تو ٹٹ پونجیا ارے یہ جادوگر غنی ہوتے ہیں غنی. . . . . انہیں ٹھرک ہوتا ہے اپنے کام کا. . . . چاچا کہتا ہے اگر یہ موہ مایا میں پھنس جائیں تو پھر قدرت جاتی رہتی ہے۔"

"موہ مایا۔ وہ کیا؟"

فقیرے نے دینے کی بات کو دہرا کر گویا اپنی ذہانت کا ثبوت دیا تھا اب اکڑ کر کہنے لگا:

"موہ مایا ایک چیز ہوتی ہے۔ ابھی تو بہت چھوٹا ہے تجھے ان چیزوں کی سمجھ نہیں، رفتہ رفتہ آپ ہی سمجھ آ جائے گی۔"

رشید فقیرے کی بات سن کر اپنے قد اور عمر کو دل ہی دل میں کوسنا چلنے لگا لیکن بابا خیرو کو دوبارہ دیکھنے کی تمنا اور بھی جوان ہو گئی۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

فیقرا تو مولوی صاحب کی مار سے نجات پا گیا لیکن جلد ساز کا رشید ابھی تک پھنسا ہوا تھا۔ پورے سات دن جب فیقرا مسجد نہ آیا اور مولوی صاحب کی لعنت پھٹکار اکیلے رشید کو برداشت کرنا پڑی تو اس کا جی ڈوب گیا۔ وہ سارا دن بیٹھا یہی سوچتا رہتا کہ کاش میں وہ عمل ہی فیقرے سے سیکھ لیتا تاکہ مولوی صاحب کو راکھ بنانے میں آسانی ہوتی لیکن فیقرا تو مسجد چھوڑ کر دکان پر بیٹھنے لگا تھا۔ شام کو شیخ جی نے کبھی رشید کو باہر نہ جانے دیا تھا اور دن بھر رشید کو مکتب سے چھٹی نہ ہوتی تھی کہ فیقرے سے ملاقات کرتا۔ یوں تو مکتب کے تمام بچے فیقرے کو چھیڑتے رہتے تھے اور اونچے اونچے گایا کرتے تھے:

"اوئے فیقرا تیری فیقری دُوراے"۔

لیکن فیقرا ان باتوں سے کبھی نہ چڑا تھا۔ اسے تو مولوی صاحب کی مار سے نفرت تھی۔ کس طرح وہ دونوں کانوں سے اٹھا کر الف کر دیتے تھے۔ کس طرح گدی میں تڑا تڑ دھولیں پڑتی تھیں۔ جس روز فیقرا اپنے باپ کی دکان پر بیٹھا ہے اس سے ایک دن پہلے اسے اور رشید کو بے حساب پڑی تھیں۔ فیقرا تو گھر آتے ہی بپھر گیا۔ تختی، بستہ، قلم دوات سب پھینک دی اور دینے سے کچھ اس طرح بات کی کہ دینے نے بھی فیصلہ کر لیا کہ مسجد میں چراغوں کے لئے تیل دینا اور جمعرات کو مولوی صاحب کے لئے روٹیوں کا انتظام کرنا بالکل گھاٹے کا سودا ہے فیقرا دکان پر بیٹھے گا۔ ایک ایک دو گیارہ۔ باپ بیٹا مل کر کام کریں گے تو ہزار قسم کے الل ٹپ سے نجات مل جائے گی۔ دینے نے تو اپنے پیسوں کو کھرے کرنے کی سوچی اور فیقرے کو دکان پر گدی نشین بنا کر بٹھا لیا لیکن جب رشید نے شیخ جی سے مکتب کا کچا چٹھا کہہ سنایا تو الٹی آنتیں گلے کو آئیں۔ شیخ جی نے رشید کا کان ہاتھ میں پکڑ لیا۔ عینک کان پر لٹک آئی نرخرا بجنے لگا اور وہ بل ڈاگ کی طرح غرائے:

"اوئے ککے کبوترا! آنہ آنہ کر کے تیرا بڈھا باپ پیسے جوڑتا ہے کہ تجھے کمیٹی سکول میں

ڈالے گا ــــ پڑھائے گا لکھائے گا لیکن تیرے جی میں آتی ہو گی کہ باپ کہیں مرے تو اس کے نانویں کو ڈبوئیں۔۔۔۔ مولوی صاحب نے مارا تو کیا بُرا کیا تیرے بھلے کی ہی کہتے ہوں گے بے چارے۔۔۔۔ تیری ماں آج زندہ ہوتی تو میں پوچھتا۔ کہتی تھی کہ میرا بچہ تو تحصیلدار بنے گا۔ یہاں مکتب ہی سے اٹھنے کی صلاح بن رہی ہے۔ دوبارہ اگر مولوی صاحب کی شکایت کی تو دھنک کر رکھ دوں گا۔۔۔۔ کھانے پینے کا لاڈ ہوتا ہے پہننے اوڑھنے کا لاڈ ہوتا ہے لیکن اولاد کو بگاڑنا کون سا لاڈ ہے ــــ بیٹھ جا ابھی اور تختی لکھ"۔

مولوی صاحب کے ساتھ ساتھ باپ کو بھی دل میں کوستا رشید اٹھا اور تختی دھونے بیٹھ گیا۔

فیقرا تو سات دن سے نجات حاصل کر چکا تھا لیکن رشید کو روز روز مرغا بننا پڑتا تھا۔ اس روز وہ ظہر کی نماز کے وقت مسجد سے کھسک گیا۔ سب سے بڑا دھڑکا اسے اس بات کا تھا کہ اگر شیخ جی نے بازار میں دیکھ لیا تو پھر خیر نہیں لیکن دل میں ٹھان چکا تھا کہ آج تو فیقرے سے وہ عمل پوچھ کر ہی آئے گا جس سے لوگوں کو بھسم کرنے کی طاقت اپنے میں آجاتی ہے۔ وہ بازار کی نکڑ پر بزاز کی دکان کے پاس بڑی دیر تک چھپا رہا۔ شیخ جی نے جب نماز کے لئے دکان بند کی تو اسی وقت ایک چھوٹی سی کار عین اس کے باپ جلد ساز کی دکان کے سامنے آ کر رک گئی۔ رشید اچھی طرح دیکھ نہ سکا کہ شیخ جی رخصت ہو گئے کہ ابھی کھڑے نئے گاہک سے باتیں کر رہے ہیں۔

تنگ بازار میں چھپتا چھپاتا وہ دینے کی دکان تک پہنچا۔ کالی کار کی آڑ لے کر اُس نے ایک بار باپ کی دکان پر نظر ڈالی۔ دکان کے تختے بند تھے۔ سامنے سیڑھیوں پر رنگین کاغذوں کی کچھ کترنیں بکھری پڑی تھیں اور ٹاٹ کا سائبان ہوا میں جھول رہا تھا۔ وہ ایک دکان پر چڑھ گیا۔ سامنے ہاتھ میں ترازو سنبھالے فیقرا بڑی چابکدستی سے کچھ تول رہا تھا اور ننھی لڑکی ردکن کے لئے تقاضا کر رہی تھی۔ جب رشید چوروں کی طرح بدن چرائے اسکے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پاس آکر بیٹھ گیا تو وہ بولا:

"دو پیسے کی چیز لیتی ہے اور اکنی کی حلوائی مانگتی ہے۔ جا بھاگ جا۔"

لڑکی بُرا سا منہ بنا کر بڑبڑاتی ہوئی چلی گئی لیکن رشید پہ یک لخت فیقرے کا کچھ رعب سا پڑ گیا۔ وہ بڑے مؤدب لہجے میں گویا ہوا:

"تم نے مکتب کیوں چھوڑ دیا فیقرے؟"

"مکتب؟ ارے وہاں کیا دھرا تھا؟ صبح سے شام تک مار مار مار..... یہاں مزے سے بیٹھتا ہوں۔ چار آنے روز چاچا مجھے دیتا ہے۔"

"وہ کاہے کو؟"

فیقرا مسکرایا اور کہنے لگا: "دستوری ملتی ہے۔ حق ہوتا ہے مول تول کرنے والے کا۔"

رشید کی آنکھوں میں رشک آ گیا اور وہ دانتوں سے ناخن کاٹنے لگا۔ فیقرا اور بھی فخریہ انداز میں بولا: "اور کچھ اوپر سے بھی آمدنی ہو جاتی ہے۔ صرف چاچا حساب کا بہت کھرا ہے۔ ہیرا پھیری کرنے کا موقع کم ملتا ہے۔"

ساتھ والی دکان سے چاچا چھجو حلوائی نے نعرہ لگایا: "کیوں بیٹا! یار بیلی آئے بیٹھے ہیں۔ ان کا منہ میٹھا کرانا ہو تو گرم گرم امرتیاں بھیجوں۔"

فیقرے کے ماتھے پہ بل پڑ گیا۔ وہ اونچی آواز میں لیکن مؤدب لہجے میں بولا۔ "نہیں چاچا گھر کی بات ہے۔ شیخ جی کا رشید ہے جی؟"

"اچھا۔"

کالی کار والا حلوائی کی دکان پہ پہنچا کچھ مٹھائی خریدنے لگا۔ فیقرے نے اپنی دکان سے ہانک لگائی۔ "سرکار کچھ ادھر بھی مہربانی کرنا۔ صبح سے بوہنی نہیں کی مندا حال ہو رہا ہے۔"

کار والے نے مسکرا کر کہا: "بھئی فی الحال تو کچھ نہیں چاہیے۔ ہاں اگر دس روپے کا توڑ ہو تو عنایت کرو۔"

"لیجیے سرکار ابھی لیجیے۔" فیقرے نے پیسے گن کر جب کار والے کے حوالے کیے تو ایک آنہ کم تھا۔ فیقرا اپنی تہمد سنبھالتا اٹھ کھڑا ہوا اور کہنے لگا:

"یہ جی میں اٹھا اکنی لے کر آیا ___ میرا تو خیال تھا پورے نکلیں گے۔ لیکن...."

"کوئی بات نہیں۔ اکنی کے لئے تردّد نہ کریں۔" کار والے نے ہاتھ ہلاتے ہوئے جواب دیا اور حلوائی کا حساب چکانے لگا۔

"جناب ایسے نہیں ہو سکتا۔ حساب حساب ہوتا ہے۔"

لیکن فیقرے نے یہ بات اتنی دیر سے اور ایسے مدھم طریق سے کہی کہ کار والا اکنی سے بے نیاز واپس کار میں بھی پہنچ گیا۔

فیقرے نے رشید کو آنکھ ماری اور بولا: "کیوں بے وہ مکتب والوں کا کیا حال ہے؟"

اب تک رشید بار بار عمل کے متعلق پوچھنا چاہتا تھا لیکن زبان پہ بات ہی نہ آتی تھی۔ جب فیقرے نے خود بات چھیڑی تو لجاجت سے کہنے لگا:

"مولوی صاحب نے تو ناک میں دم کر دیا ہے۔ اب تو اور بھی سخت ہو گئے ہیں۔ پل پل میں مار پڑتی ہے۔"

فیقرے نے گلّے میں سے ایک اکنی نکالی اور صدری کی اندرونی جیب میں اڑس لی۔

رشید کہنے لگا۔ "اگر تو مجھے وہ عمل سکھا دے تو بس ایک بار تو مولوی صاحب سے بدلہ لے لوں۔ کھجور کا درخت میں نے ڈھونڈ لیا ہے۔"

فیقرے نے تعجب سے پوچھا: "کون سا عمل۔"

"وہی دوسرے کو بھسم کرنے والا۔ اور کون سا؟"

"اچھا! بیٹا اس کے بھی اچھے اچھے منتر یہاں آتے ہیں لیکن یہاں نہیں چاچا آ رہا ہے تو شام کو وہیں پہنچ جانا میں آ جاؤں گا۔"

"کہاں؟"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

فیقرے نے اسے دکان سے اٹھاتے ہوئے کہا: "بھئی وہیں لائن پہ۔ اور دیکھ ساتھ پانچ پیسے بھی لانا نیاز کے لئے۔ سب کام بن جائے گا تیرا۔"

"پانچ پیسے کیوں؟"

فیقرے نے بڑے رعب سے کہا: "بابا خیرو سے تجھے تعویز لکھوا دوں گا۔"

رشید کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ وہ تعجب سے بولا: "بابا خیرو سے؟"

"ہاں بیٹا۔ اور اب بھاگ جا۔ میرے چاچے نے تجھے دیکھ لیا تو میری خیر نہیں۔ وہ دکان پہ یار بیلیوں کا گٹھ جوڑ پسند نہیں کرتا۔"

رشید کو مکتب چھوڑنے میں کچھ دیر لگی لیکن اسی دن فیقرے کی بدلی ہوئی حالت دیکھ کر وہ ایک بات کا فیصلہ کر چکا تھا یا تو فیقرا اسے بابا خیرو سے تعویز لا کر دے گا اور وہ مولوی صاحب کی بے جا مار سے بچے گا۔ اور اگر کسی وجہ سے یہ ممکن نہ ہو سکا تو مکتب کو خیرباد کہنا ہی پڑے گا۔

جب وہ بستہ اور تختی لے کر لائنوں تک پہنچا تو جھٹ پٹا سا ہو چلا تھا۔ مولوی صاحب نے اسے جمعرات کی روٹیاں اکٹھی کرنے بھیج دیا تھا اور وہ بددلی سے دو چار گھر دیکھ کر کھسک آیا تھا۔ دل میں اسے خوب علم تھا کہ دوسرے دن پھر دھواں دار گالیوں اور تابڑ توڑ مار کا سامنا کرنا پڑے گا لیکن اس کے جی میں ایسے پختہ ارادے جنم لے رہے تھے کہ ابا اور مولوی صاحب دونوں کی شخصیتیں منحنی ہو کر نظروں سے اوجھل ہو گئی تھیں۔

اس نے ہتھیلی میں پانچ پیسے اتنی زور سے بھینچ رکھے تھے کہ وہ پسینے میں بھیگ گئے تھے۔ یہ وہ پانچ پیسے تھے جو اسی رشیدہ نے روٹیوں کے ساتھ مولوی صاحب کو چراغوں میں تیل ڈالنے کے لئے بھیجے تھے۔ جب بھی اسے اپنی چوری کا خیال آتا اس کی ناک کی پھننگ پہ ننھے ننھے قطرے ابھر آتے۔

رشید کو لائن پہ بیٹھے بڑی دیر ہو گئی۔ پھاٹک کے چوکیدار نے لائن پار کرنے والی سڑک کے دونوں پھاٹک بند کئے۔ دور سے انجن کی خوش آئند سیٹی ہواؤں میں لہرائی۔ رشید کے جی میں آئی کہ ایک پیسہ نکال کر لائن کی چمکتی سطح پر رکھ دے لیکن اسے فیقرے کا انتظار تھا۔ اگر ایک پیسہ کم ہو گیا تو بہت ممکن ہے بابا خیرو تعویز لکھ کر نہ دے۔ جونہی شعلے اڑاتی دھوئیں چھوڑتی گاڑی اس سے کچھ فاصلے پر سے گزری وہ گزوں پیچھے بھاگ کر کھڑا ہو گیا۔ آج اسے انجن کے دھمکے سے لرزتی زمین سے نامعلوم سا خوف آ رہا تھا۔ ڈبوں کی جلتی ہوئی بتیوں کے عکس روشن تختے بنے اس کے پاس سے گزرتے جا رہے تھے۔ پھر انجن گاڑی کو اغوا کر کے بہت دور چلا گیا۔ پھاٹک کھل گئے لیکن کریا اور ڈبلیا سے چھپا ہوا علاقہ جیسے سہم کر رہ گیا۔ فیقرا ابھی تک نہ پہنچا تھا اور رشید کو بہت دیر ہو چکی تھی۔ وہ لائن کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا پھاٹک تک پہنچا اور پھر سڑک پہ ہو لیا۔

وہ بابا خیرو کی جھونپڑی تک پہنچ تو گیا لیکن اندر جانے کی اس میں ہمت نہ تھی۔ ٹوٹے ہوئے دروازے کے ساتھ ہی جابجا کوئلے کی راکھ کی چھوٹی چھوٹی ڈھیریاں تھیں۔ رشید نے دروازے کے ساتھ منہ لگا لیا۔ اور اندر جھانکنے لگا۔ اندر گھپ اندھیرا تھا اور کچھ بھی سجھائی نہ دیتا تھا۔ کتنی ہی دیر رشید ادھر ادھر سے جھانکنے کی کوشش کرتا رہا لیکن خستہ کوٹھڑی کے اندر روشنی کی ایک بھی کرن نہ پھوٹی۔ بالآخر رشید نے دروازہ دھکیلنا چاہا اور جونہی کواڑ ذرا سے جھولے کسی نے پیچھے سے اسے پکڑ کر اپنی طرف گھمایا۔ سامنے بابا خیرو کھڑا تھا۔ اس کا چہرہ غصے سے تمتمایا ہوا تھا۔ بھرے ہاتھ کا طمانچہ رشید کے منہ پہ جماتے ہوئے بابا بولا:

'کیوں بے حرامی۔ سارا شہر چھوڑ کر فقیروں کے گھر ہی ڈاکہ ڈالنا تھا؟ — حرامزادے پھر کبھی یہاں دیکھا تو تیزاب ڈال کر بھسم کر دوں گا۔"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پھر اس کے کان اینٹھ کر کہنے لگا: "اس دن بھی میں نے تجھے جھاڑیوں کے پیچھے دیکھا تھا جوتی چور۔ اٹھائی گیرا ـــــ کس کا لڑکا ہے تُو؟"

رشید کے تمام منصوبے، سارے ارادے حلق ہی میں خشک ہو گئے۔ اسے مار سے تو خوف نہ آتا تھا لیکن بابا خیرو تو جادوگر تھا اور کون جانے بستی سے اتنی دور اجاڑ سنسان جگہ میں ابھی پل بھر میں اس کا کلیجہ ہی نکال لیتا۔ رشید نے جلدی سے کان چھڑایا اور سرپٹ بھاگنے لگا۔ دُور تک بابا خیرو کی آواز اس کا تعاقب کرتی رہی۔ وہ للکار للکار کر کہہ رہا تھا: "حرامزادے۔ پھر کبھی ادھر آیا تو ہڈیاں توڑ دوں گا۔ میرا پتہ نہیں بابا خیرو ہوں خیرو۔۔۔۔"

جب تک قصبے کی بتیاں نظر نہ آئیں وہ بھاگتا ہی چلا گیا۔ بار بار مڑ کر دیکھ لیتا کہیں بابا خیرو تعاقب میں چلا تو نہیں آرہا۔ ساری راہ اس کی نظریں فیقرے کو ڈھونڈتی رہیں لیکن سوائے بھاگتی بیریوں کے اور کچھ بھی نظر نہ آیا۔ ڈیوڑھی میں پہنچ کر اسے اپنے پانچ پیسے اور تختی یاد آئی لیکن اس میں اتنی ہمت نہ تھی کہ ان چیزوں کو ڈھونڈنے نکلتا۔ چوروں کی طرح وہ گھر میں داخل ہوا۔ شیخ جی گھر میں موجود نہ تھے۔ ہنڈیا چولھے پہ دھری اُبل رہی تھی۔ اس نے چارپائی پر بیٹھ کر کٹورہ بھر ٹھنڈا پانی پیا تو جان میں جان آئی۔

اس کے بعد اس نے پھاٹک کی طرف جانا ہی چھوڑ دیا۔ فیقرے نے کئی بار اسے ترغیب دلائی لیکن رشید نے ٹال دیا۔

رشید کو مکتب چھوڑنے میں بڑی دقت پیش آئی کیونکہ شیخ جی کے دل میں اپنے اکلوتے رشید کے لئے بڑے بڑے خواب تھے جو پڑھائی کے بغیر پورے ہو ہی نہ سکتے تھے لیکن رشید نے فیقرے کی خوشحالی دیکھ لی تھی اور وہ بضد تھا کہ وہ بھی دکان پر کام کرے گا۔ بالآخر شیخ جی کو ہتھیار ڈالنا پڑے اور رشید بھی دکان پہ جانے لگا۔

جب سے فیقرے کو دکان کی سمجھ بوجھ پیدا ہوئی تھی دینا زیادہ وقت منڈی سے سودا لانے اور کھاتا بہی کی جانچ پڑتال میں وقت گزارتا۔ ترازو کی ڈنڈی اب فیقرے کے ہاتھ ہی میں رہتی تھی۔ گاہکوں سے مول تول کرنا، باقی دکانداروں سے لین دین رکھنا اور دکان کی تمام ذمہ داری اسی کی تھی۔ چھاچھو حلوائی سے اب فیقرے کے مراسم بہت اچھے ہو گئے تھے اور جونہی دینا منڈی جاتا وہ ربڑی، دودھ جلیبیاں خرید کر ضرور کھاتا۔ فیقرا تھوڑے ہی عرصہ میں کھبرو ہو گیا تھا۔ گالوں کے گڑھے بھر گئے تھے اور ٹھوڑی کے نیچے گوشت کی ننھی سی گہرائی اُبھر آئی تھی۔

شیخ جی ہمیشہ بازار کی جانب پشت کر کے بیٹھتے تھے۔ انہیں بازار کے شور و شغب سے کوئی سروکار نہ تھا۔ آرام سے بیٹھے جلدیں کسا کرتے۔ کبھی کبھار کوئی دلچسپ مسوّدہ ہاتھ لگ جاتا تو اسے علیحدہ رکھ دیتے اور گھر لا کر دیئے کی روشنی میں پڑھنے لگتے لیکن رشید ہمیشہ دینے کی دکان کا رخ کر کے بیٹھتا تھا۔ بار بار اس کی نظر سامنے اٹھ جاتی۔ دینے کی دکان پر جو بھیڑ رہتی تھی۔ بھانت بھانت کے گاہک آتے تھے ان کا نظارہ وہ اپنی دکان سے بیٹھ کر ہی کر لیتا۔ اسے لئی بنانے سے نفرت تھی۔ گتّا کاٹنا اور شکنجہ کسنا اسے بڑے فضول کام نظر آتے تھے کیونکہ صبح سے شام تک اتنی ساری کتابیں سینے، جوڑنے اور جلد بندی کرنے کے بعد اسے ایک آنہ بھی دستوری نہ ملتی۔ شیخ جی کی دکان پہ آتے ہی وہ لوگ تھے جو شکل سے ہی بھک منگے اور فقیر سے نظر آتے۔ کبھی کبھار کمیٹی سکول کے ماسٹر آتے لیکن وہ ہمیشہ بل پہ کام کرواتے تھے اس لئے اوپر کی آمدنی کا تو سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ مولوی صاحب کی قید سے چھوٹ کر بھی رشید کو آزادی نصیب نہ ہوئی اور آزادی سلب ہو جانے کا اُسے اتنا رنج نہ تھا جتنا دکھ اسے اس بات کا تھا کہ اب کمائو ہونے کے باوجود وہ ایک پائی کا حقدار نہ تھا۔ اس کی ذاتی پُونجی صفر تھی۔ نئی واسکٹ اور سرخ جوتی خریدنا تو درکنار وہ تو آج تک دو

www.iqbalkalmati.blogspot.com

آنے کی کلفی بھی نہ خرید سکا تھا۔ اس لئے جب ایک دن ایک لڑکا اپنی کتابیں بندھوانے آیا تو رشید نے اس سے چار آنے زیادہ وصول کر لئے۔

لیکن شیخ جی سے اس بچے نے کہیں جڑ دی۔ دوسرے ہی دن شیخ جی نے رشید سے پوچھا:—

"وہ ہسٹری جغرافیہ کی کتابیں حمید صاحب کا لڑکا بندھوا کے لے گیا تھا؟"

رشید لمحہ بھر کو کانپا اور آہستہ سے بولا: "جی!"

"ابری لگائی تھی؟"

"جی!"

اب شیخ جی اس کے قریب آ کھڑے ہوئے اور بولے۔ "کیوں میاں شکنجے میں جلدیں کس لی تھیں۔"

رشید نے گیدڑ بھبکی کے انداز میں چڑ کر کہا: "جی اور کیا ایسا ہی بے وقوف سمجھا ہے مجھے۔"

شیخ جی نے آنکھیں کھول کر لمحہ بھر کو اسے گھورا اور پھر کہنے لگے —— "جی۔ اور آپ کا کیا خیال ہے لئی دو گھنٹے میں خشک ہو گئی ہو گی"۔

"جلدیں تو خشک ہی لگتی تھیں۔"

"اور کتنے پیسے لئے تھے اس لڑکے سے"۔

اب رشید کی زبان کو تالا لگ گیا۔

"کیا رقم وصول کی تھی اس سے؟"

رشید خاموش رہا تو شیخ جی نے اسے کان سے پکڑ لیا اور بولے —— "اس اڈے میں ہیرا پھیری نہیں چلے گی۔ ایک دمڑی کا بھی فرق نکلا تو ہڈی پسلی ایک کر دوں گا۔ میں نے ساری عمر میں ایک زبان رکھی ہے۔ کبھی گاہک سے جھوٹ نہیں بولا۔ ایک وقت سوکھی کھائی ہے

لیکن جھوٹ کی نیو ڈال کر عمارت کھڑی نہیں کی —— تجھے رہنا ہو تو رہ جا ہو تو جا۔ لیکن میں لین دین کا کھرا ہوں۔ یہاں بھاؤ تاؤ کی گنجائش نہیں۔ کان کھول کر سن لے۔ اگر آئندہ ایسی حرکت کی تو کھڑے کھڑے نکال دوں گا۔"

رشید کو پھر کبھی ہیرا پھیری کرنے کی ہمت تو نہیں پڑی لیکن اس کی حسرتیں ان گنت ہو گئیں۔ وہ خالی وقت میں بیٹھ کر ایسی چیزوں کے خواب دیکھنے لگا جو بازار میں کھلے بندوں بکتی تھیں۔ جب کبھی فرصت ہوتی یا فیقرے کو کام نہ ہوتا تو وہ گھڑی دو گھڑی کے لئے اس کے پاس بھی جا بیٹھتا۔ لیکن فیقرے سے ملنے کے بعد اس کی طبیعت اور بھی پریشان ہو جاتی۔ وہ سوچنے لگتا کیا کوئی ایسا طریقہ نہیں ہو سکتا کہ راتوں رات انسان امیر ہو جائے کسی طرح چھپر پھٹ جائے اور سونے چاندی کی بارش ہونے لگے —— کہیں سے چھپا ہوا خزانہ چلتے چلتے مل جائے —— کوئی لکھ پتی اپنا وارث بنا کر مر جائے۔

ان خوابوں کو اور بھی تقویت ملتی۔ یہ تخیلات اور بھی رنگین ہو جاتے۔ اگر کبھی بازار میں بابا خیرو آ نکلتا —— وہ بابا خیرو کا سامنا کرنے سے ڈرتا تھا لیکن اس کی آنکھوں میں چمک آ جاتی۔ وہ ٹاٹ کا ایک سرا اٹھا کر دینے کی دکان بار بار دیکھنے لگتا۔ دینے بنئے کی دکان کی ساری باتیں کان لگا کر سنتا۔ اس کا کتنا جی چاہتا تھا کہ کسی دن ہمت کر کے بابا خیرو سے پوچھ ہی لے:

"بابا۔ کیا تمہیں سونا بنانے کا نسخہ آتا ہے۔ کیا تم نے چاندی بنا کر دیکھی ہے"۔

شیخ جی کا خیال تھا کہ سلیمہ سے شادی ہو جانے کے بعد رشید بھی فیقرے کی طرح دکان کا ہی ہو کر رہ جائے گا لیکن رشید تو اور بھی الجھ کر رہ گیا۔ شیخ جی نے اتنی محنت سے ایسی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جانفشانی سے اسے کتابت کا فن سکھایا تھا۔ شیخ سعدی کے اور حافظ کے اشعار لکھ لکھ کر قطعے لکھنے سکھائے تھے لیکن اب رشید کی لکھائی کا یہ عالم تھا کہ تمام گاہک شکایت کرتے تھے۔ نہ دائرے ٹھیک بیٹھتے نہ نوک پلک ہی درست ہوتی۔ نقطے بھی چھوٹے بڑے لگنے لگے تھے۔ سطر گھٹنے پر جمائے قلم کی نال روشنائی سے بھر کر وہ بیٹھا رہتا۔ چوری چوری شیخ جی اس پر نظر ڈالتے لمبی سانس بھرتے اور پھر عینک ناک پر جما کر جلدیں باندھنے لگتے۔ اب انہیں دینے بساطی کی زندگی پر رشک آنے لگا تھا۔ ان کا فقرا سارے بازار میں کس قدر معتبر تھا۔ گاہکوں سے لپک جھپک کر پیش آتا۔ اسے کھرے کھوٹے کی پہچان تھی۔ معاملے کی اہمیت کو پلک جھپکتے ہی پہچان لیتا تھا۔ شیخ جی نے دینے سے مشورہ کیا تو وہ جھٹ بولا:

"دو بول پڑھوا دو شیخ جی۔ بال بچے کی محبت سب کچھ ٹھیک کر دے گی۔ آپ ہی آپ سدھر جائے گا"۔

شیخ جی نے اپنی برادری کی سب سے سگھڑ لڑکی شہر سے لاکر اس کے گھر بسائی تھی۔ سلیمہ بڑی سلیقہ شعار اور نفاست پسند تھی۔ اس نے آتے ہی اپنے کمرے میں نیا کیلنڈر اور موتیوں سے کڑھی ہوئی خوبصورت تصویر دیوار پر لٹکائی تھی۔ اس کے ہاتھ کے بنے ہوئے میز پوش اور چادریں ہرے نیلے بسنتی پھولوں سے لدی ہوئی تھیں۔ بالوں میں چنبیلی کا تیل لگاتی تھی۔ دوپٹوں میں ساگودانے کی ایسی کلف لگاتی تھی کہ اچھی سے اچھی کتاب کی جلد بندی کے لئے کبھی رشید نے استعمال نہ کی تھی۔ رشید کی خاموشی اور بددلی کی شیخ جی کو تو سمجھ نہ آتی تھی لیکن سلیمہ ٹوہ میں تھی۔

ایک رات کھانے کے بعد رشید کھری چارپائی پر چپ چاپ لیٹا تھا۔ آنگن میں مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو اٹھ رہی تھی۔ طاقچے میں دھرے دیئے کی لو مسلسل کانپ رہی تھی۔ شیخ جی وضو کر کے ساتھ والی مسجد میں عشا کی نماز پڑھنے گئے تھے جب سلیمہ نے

نے اپنا چنا ہوا دوپٹہ اتارا اور بڑی بے تکلفی سے ادوائن کی طرف جا بیٹھی اور بولی:

"کیوں کسی سے نہیں بولنا کیا؟"

رشید نے کوئی جواب نہ دیا تو وہ رشید کا پاؤں کھجلا کر کہنے لگی: "سر شام نہ سو جایا کریں۔ صحت کے لئے بڑا خراب ہے"۔

رشید کو ہنسی آ گئی لیکن وہ بن کر بولا: "تنگ نہ کرو چھیماں میں سو رہا ہوں"۔

اب وہ چھپاک سے اٹھی اور کہنے لگی: "تو یہ دیا خواہ مخواہ جل رہا ہے۔ بجھا دوں اسے؟"

"نہیں رہنے دو"۔

چھیماں طاقچے کے قریب جا کھڑی ہوئی۔ دیئے کی مدھم لو میں اس کی کاجل بھری آنکھیں باہوں میں پڑے ہوئے کنگن اور ناک کی ننھی سی کیل چمکنے لگی۔ بالوں کی لٹ ماتھے سے پرے کرتے ہوئے چھیماں بولی:

"نہ جی۔ یہاں کیا سب نے جلنے کا ٹھیکہ لیا ہے۔ کم از کم دیا تو آرام کرے"۔

اس نے منہ سے سیٹی بنائی اور بگلے سی سفید گردن بڑھا کر دیا بجھا دیا۔ آنگن میں چاند کی چاندنی ہر طرف پھیل گئی۔ بیری کے پتے سیاہ اور سفید کے دھبے بن کر فرش پر منعکس ہو گئے۔

"ادھر آ چھیماں"۔ رشید نے آواز دی۔

چھیماں طاقچے کے قریب ہی کھڑی رہی۔

رشید بولا: "اس گھر میں سبھی کیوں جلیں۔ میں کافی نہیں ہوں کیا؟"

زیر لب چھیماں نے لاحول پڑھی اور جلدی سے بولی: "جلیں آپ کے دشمن"۔

رشید نے لمبی سانس بھری اور بولا: "تمہارے کرم جل گئے جو مجھ سا شوہر ملا۔ کسی اچھی جگہ بیاہی جاتیں تو کاہے کا غم ہوتا۔ صبح و شام چولہا جھونکنا..... ڈھنگ کا کوئی کپڑا

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں: www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

نہیں..... جب سے آئی ہو سونے کا زیور تو درکنار کانچ کی چوڑیاں بھی تمہارے لئے نہیں لا سکا۔ تمہارا کیا خیال ہے مجھے ان باتوں کا خیال ہی نہیں آتا؟ تمہارا خیال ہوگا پتہ نہیں کس معشوق کے لئے روتا رہتا ہوں میں!"

چھیماں کی باچھیں کھل گئیں۔ وہ بڑے انداز سے چارپائی کی طرف لپکی اور فرش پر ہی دو زانو ہو کر بیٹھ گئی۔ رشید نے پہلو بدل کر اس کی طرف دیکھا اور کہنے لگا:

"چھیماں۔ میں نے تو بڑی کوشش کی کہ کسی طرح ہمارے حالات سنور جائیں لیکن اباجی کے نزدیک تو ہر طرح کا نفع چوری ہے، ڈاکہ ہے، رہزنی ہے ـــــ یہاں تو جینے کا نام ہی ہیرا پھیری ہے۔ کوئی کیا کرے۔"

چھیماں نے حیرانی سے پوچھا: "لیکن چاچاجی تو خود دکانداری کرتے ہیں۔"

"اس دکان سے تو اتنا بھی نہیں ہوتا کہ رات کو ڈھنگ کا کھانا کھالیں۔"

"پھر!"

رشید نے چڑ کر کہا: "میں نے ایک بار مشورہ دیا تھا کہ جلد سازی اور کتابت کا کام چھوڑ کر ہم بھی آڑھت کریں لیکن انہیں تو چڑ ہے۔ جس کام میں نفع ہوگا اسی سے انہیں نفرت ہوگی۔ ایک بار میں نے شہر جا کر تجارت کرنے کا مشورہ دیا تو ٹال گئے۔ کہتے ہیں اسی دکان میں خدا برکت دے گا۔ اگر مولا نے چاہا تو یہیں کچھ سبیل بن جائے گی۔"

"پھر آپ کی کیا صلاح ہے۔ یوں چڑنے سے تو کچھ نہ بنے گا۔"

رشید نے ہولے سے آہ بھری اور بولا: "یہی اگر کچھ پونجی ہوتی تو میں اپنا کچھ کام چلاتا۔"

"توبہ توبہ..... اور چاچاجی کو بیچ منجدھار میں چھوڑ جاتے؟"

رشید نے تنک کر پوچھا: "تو کیا ہم نے ان کا عمر بھر کا ٹھیکہ لیا ہے۔"

چھیماں نے نرمی سے اس کے بالوں میں انگلیاں ڈبو کر کہا ـــــ "نہیں ٹھیکہ تو نہیں

لیا لیکن اس عمر میں انہیں دھکا بھی تو نہیں دے سکتے نا ـــــ کوئی ایسا کام کیوں نہیں کرتے جس کی خبر چاچاجی کو نہ ہو۔ بظاہر تم جلد سازی ہی کرتے رہو لیکن کچھ معقول آمدنی کی صورت بھی بن جائے۔"

رشید نے دکھی ہو کر جواب دیا۔ "بھلیئے لوک! کام تو بہت ہے، میں لیکن ناواں کہاں ہے۔ ناواں ہوتا تو تیرے لئے کانچ کی چوڑیاں نہ لے آتا۔"

چھیماں نے نظریں جھکا کر اپنے کنگنوں کی طرف بڑے پیار سے دیکھا اور پھر بولی: "یہ کنگن تو خیر میں نہیں دے سکتی، میری ماں کی نشانی ہیں لیکن میری دھگدھگی بیچ لیجئے۔ پورے سوا دو تولے کی ہے۔ لیکن ایک شرط ہے۔"

رشید نے دھگدھگی کا شکریہ ادا کرنے کے بجائے جلدی سے پوچھا: "شرط.. وہ کیسی ہے؟"

چھیماں نے کنگن گھماتے ہوئے کہا: "شرط یہ ہے کہ چاچاجی کو پتہ نہ چلے کہ آپ کوئی اور کام کر رہے ہیں۔ انھوں نے اپنی دکان پر بڑی محنت کی ہے اپنی اولاد کی طرح یہ پیشہ بھی انہیں بچوں کی طرح عزیز ہے۔ اگر انہیں پتہ چلا کہ آپ دکان سے بے وفائی کر رہے ہیں تو انہیں بڑا رنج ہوگا۔"

"اور اگر انھوں نے پوچھا کہ دھن کہاں سے برسنے لگا ہے تو؟"

"آپ کہہ دیجئے گا کہ دکان سے نفع زیادہ ہونے لگا ہے۔ آجکل وہ دکان پر کم جاتے ہیں انہیں شک نہ گزرے گا۔"

پھر آہستہ سے چھیماں نے پوچھا: "کوئی ایسا کام ممکن ہے کیا؟"

رشید نے ہنس کر اس کی لٹ کو ماتھے پر سے پرے کیا اور بولا: "چھیلئے! کام تو بہت ہیں۔ انشاءاللہ دیکھنا اب کیا بنتا ہے۔ دھگدھگی کے لئے گھبرانا نہ، نئی بنوا دوں گا۔"

چھیماں کی آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک ذرا سی دیر کو لہرائی اور پھر وہ بولی: "واہ۔ یہ

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

آپ سے اچھی ہے کیا۔"

اسی وقت شیخ جی کھنڈے سے راہ ٹٹولتے ڈیوڑھی میں پہنچے اور وہیں سے چلائے:

"کیوں چھیاں۔ آج دیا نہیں جلایا۔ مجھ بڈھے کی گر کر کوئی ہڈی ٹوٹ گئی تو بنوانے کے لئے پیسے کہاں سے آئیں گے"۔

چھیاں نے لپک کر دوپٹہ اٹھایا اور پھر طاقچے کی طرف بڑھ گئی۔

رشید نے دو سو روپے ریشمی رومال میں کس کر باندھے پھر انہیں اپنی قمیض کی جیب میں ڈالا۔ پھر واسکٹ کی اوپر والی جیب میں جلدی سے گھسیڑ دیئے۔ ممدو سنار کی ساری چمک دمک اور آن بان اس کی نظروں کے سامنے تھی۔ اسے ممدو کی دکان پر بیٹھے دو تین گھنٹے لگ گئے۔ بھیڑ کم ہوتی تو وہ غرض مدعا کرتا۔ اس کے سامنے سونے کے کنگن بکے۔ ایک دیہاتی نے اپنی بیوی کے لئے بہت خوبصورت پازیبیں خریدیں۔ ایک عورت دیر تک متذبذب بیٹھی سوچتی رہی کہ اپنی بیٹی کو ٹکنگی بنوا دے یا ہنسلی بہتر رہے گی — ممدو کبھی ہنسلی سبز کاغذ پر رکھ کر دکھاتا کبھی ٹکنگی لہرا کر پیش کرتا۔ اتنے خوبصورت اور چمکتے زیور دیکھ کر رشید پر عجیب کیفیت طاری تھی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ دگدگی بیچ کر ایک جڑاؤ بازوبند اور کانوں کی ہلکی ہلکی بالیوں کا ایک جوڑا خرید لے۔ چھیاں کے بھرے بھرے اور سفید بازو اسے یک لخت سونے سونے نظر آنے لگے۔ پھر اس کے جی میں آئی کہ اس جھنجھٹ سے یہی بہتر ہے کہ دھگدگی صاف کروا کر چھیاں کو لوٹا دے اور وہ اٹھ بھی جاتا اگر ممدو اس کے کندھے پر ہاتھ مار کر بے تکلفی سے نہ کہتا:

"کیوں شیخ جی — کچھ پیسے درکار ہیں"۔

"ہاں" چوروں کی طرح رشید نے جواب دیا۔

"اس وقت تو مشکل ہے شیخ جی۔ کاروبار مندا ہے — قسم پنجتن پاک کی سونے کے بیوپار کو ہی آگ لگی ہے۔ رتی تولے کا حساب کرتا کرتا انسان پاگل ہو جاتا ہے اور بچت کوڑی کی نہیں۔۔۔۔۔ پہلے اس میں ہزاروں کا لین دین رہتا تھا۔ اب تو سارا حساب ہی بٹا کھاتا بن گیا ہے۔"

پھر ممدو ہولے ہولے ہنسنے لگا اور شیشے کی صندوقچی پر رکھے ہوئے زیور واپس سبز لال اور پیلے کاغذ میں لپیٹنے لگا۔

رشید نے چند لمحے سوچ کر آہستہ سے دھگدگی نکالی اور اسے ہتھیلی پر رکھ کر بولا:

"چاچا جی یہ دھگدگی لایا تھا بیچنے کے لئے"۔

"توبہ! توبہ۔۔۔۔۔ تمہاری چیز میرے ہاں نہیں بک سکتی بیٹا"۔

رشید کی ٹانگیں کانپنے لگیں لیکن اسے یک گونہ سکون ملا کہ چلو خیریت ہوئی میرے ہاتھوں چھیاں کا زیور نہ بکے گا۔

"اچھا۔۔۔۔۔ تو میں چلتا ہوں"۔

ممدو نے اس کی قمیض کا کونہ پکڑ کر بٹھا لیا اور آہستہ سے بولا: "ارے نہ لسی نہ پانی بیٹھو بیٹھو۔۔۔۔۔ تمہاری ضرورت میری ضرورت ہے — کہو کتنے روپے درکار ہیں"۔

"جتنے میں یہ زیور بک سکے چاچا"۔

ممدو نے دھگدگی لے کر روشنی کی طرف گھمائی پھر بے پروائی سے صندوقچی پر ڈال کر کہا — "بازار کا بھاؤ مندا ہے بیٹا۔ سو سوا سو کی چیز ہوگی — کہو تو کچھ رقم تمہیں ادھار دے دوں"۔

"وہ آپ کی مہربانی ہے"۔

پھر ممدو نے صندوقچی سے کچھ نوٹ نکالے اور انگلیوں میں تھوک لگا کر جلدی جلدی گننے لگا۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"مجھے ڈھائی سو روپیہ درکار تھا کم از کم"۔

"سر دست تو صرف دو سو ہیں۔ تمہارا کام چل سکے تو چلا لو..... اور..... یہ تمہاری دھگدھگی میں رکھ لیتا ہوں۔ رقم ہوگی تو لے جانا..... اس کا نمونہ شہری ہے میں بنا لوں گا تو بکری ہو جائے گی میری"۔

"ہاں ہاں..... چاچا آپ رکھیں اسے۔" رقم پکڑتے ہوئے رشید نے کہا۔

رنگین رومال میں دو سو روپے باندھ کر رشید باہر نکلا تو بمشکل تمام بولا: "جی۔ اس بات کا ذکر ابّے سے نہ کرنا..... یہ میرا ذاتی معاملہ ہے"۔

مدو کسی فلم کے دلال کی طرح مسکرایا اور سر ہلا کر کہنے لگا: "بابا۔ مجھے بچہ سمجھا ہے کیا۔ کام بن جائے تو مہینے کے بعد اپنی چیز لے جانا..... بعد کو میں ضامن نہ رہوں گا..... ہاں!"

رشید زیور گروی رکھ کر جب دکان سے باہر نکلا تو اس کے ذہن میں کوئی پروگرام نہ تھا۔ اسے سمجھ نہ آ رہی تھی کہ ان دو سو روپوں سے وہ کیا کاروبار کرے گا اور کیوں کر یہ دو سو ہزاروں میں بدل سکیں گے؟ آج تک اس کے پاس کبھی اکٹھے پچاس روپے بھی نہ ہوئے تھے اور وہ خوابوں میں لاکھوں کما چکا تھا۔ کبھی سوچتا آٹا پیسنے کی مشین لگاؤں۔ کبھی جی میں آتا افیون کا کاروبار کروں۔ چوری چھپے کی آمدنی ہوگی' ابا کو کبھی خبر نہ ہو سکے گی اور بیوپار بھی لاکھوں کا ہوگا۔ پھر سوچنے لگتا کہ شہر چل کر قسمت آزماؤں تو وارے نیارے ہو جائیں گے یہ وارے نیارے کیونکر ہوں گے اس کے متعلق اس نے کچھ بھی نہ سوچا تھا۔

فیقرے کی دکان پر آج خوب رونق تھی۔ رشید نے چوری چوری گزر جانا چاہا لیکن فیقرے نے آواز دے کر کہا:

"کیوں میاں! اب تو بڑے آدمی ہو گئے ہو بات بھی نہیں کرتے"۔

رشید نے دینے کی دکان پر دیکھا تو بابا خیرو بیٹھا نظر آیا۔ وہ لکڑی کی سیڑھیوں پہ بیٹھا

ایک پرانا پرزہ پڑھ رہا تھا۔ رشید کے قدم خود بخود فیقرے کی طرف بڑھنے لگے۔ مولا بخش موچی بڑے جوش سے کہہ رہا تھا:

"کیوں بابا۔ اگر چاندی بن جاتی ہے تو بناتے کیوں نہیں"۔

بابا خیرو نے موٹی سی گالی سے مولا بخش کو نوازتے ہوئے کہا: "تُو بیٹھا اپنے جُوتے سی۔ چاندی سے تجھے کیا۔ فیقرے ارے فیقرے' بنئے کی اولاد! ارے پھندنے سے پکڑ کر تول..... ڈنڈی مارنے سے باز نہیں آتا ناں"۔

فیقرے نے ترازو بابا خیرو کی طرف بڑھا دیا اور جلدی سے بولا: "بابا۔ تم خود جو کھ لو۔ ہمارا پٹا الٹ جائے جو رتی کا بھی فرق ہو....."

چاچا پھو حلوائی نے لڈوؤں کے تھال پہ ورق سجاتے ہوئے کوئی ہزارویں دفعہ کہا:

"ہم تو اس مٹھائی کے دھندے سے بھر پائے ہیں ساتھ لگا لو بابا خیرو۔ سنا ہے تمہارے پاس بڑے بڑے نسخے ہیں۔ کوئی تعویذ ہمیں بھی لکھ دو اور کچھ نہیں تو اللہ اسی تیل گھی کے بیوپار میں برکت دیدے۔ چاہے آنے کا لابھ ہی ہو جائے"۔

بابا خیرو نے اپنی پوٹلیاں باندھتے ہوئے دیر تک کچھ زبانی حساب کتاب کیا اور پھر حلوائی سے مخاطب ہوا:

چاچا چھو پہلوان۔ یہ لمبے پھیر ہیں۔ سونا چاندی بنتا ہے لیکن لگن چاہئے لگن..... چاندی کا ورق بھی تو کسی نے بنایا ہی تھا ناں؟ اپنی تو بائیں آنکھ ہی ان تجربوں کی نذر ہو گئی ہے اور پوچھ لو کسی سے کبھی جی میلا نہیں ہوا..... لگن جو ہوئی"۔

یہ کہہ کر بابا خیرو اٹھا۔ اس نے اپنے چھوٹے سے تھیلے میں تمام پڑیاں لپیٹیں۔ پیسے چھکائے اور لنگڑاتا ہوا چلنے لگا۔ اس کے اوجھل ہوتے ہی چاچا چھو نے کہا: "بھید ضرور ہے کوئی۔ بڑھاپے کا تجربہ ورنہ یوں بے کار زندگی کٹنے سے رہی اور آج تک اسے بھیک مانگتے کسی نے دیکھا نہیں"۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مولا بخش ہنسا اور کہنے لگا: "شیرے نے مجھے بتایا تھا کہ اس نے خود بابا خیرو کو چاندی بناتے دیکھا ہے۔ بابا خیرو کے گھر میں چاندی کی پوری دیگ رکھی ہے۔"

"دیگ؟" — چلم کا کش ادھورا چھوڑ کر فضائی نے پوچھا۔

مولا بخش جلدی جلدی بولا: "اب تو شیدا بڑے گھر پہنچ گیا ہے ورنہ میں تمہیں سامنے بٹھوا دیتا۔ یاد نہیں اس کے ٹھسّے، بازار سارے کو خرید لیتا۔ ریشمی لنگی، تلّے کی جوتی، ڈب میں ہزاروں۔ گورنمنٹ پیچھے لگ گئی تھی اس کے۔ بابا خیرو تو زندہ بچ گیا شیدا پکڑا گیا۔"

فقیرے نے قمیض میں لگے ہوئے سونے کے بٹنوں کو ملتے ہوئے کہا: "پر میں نے تو سنا تھا کہ چاچا شیدے پر چوری کا مقدمہ بنا تھا۔"

مولا بخش نے ہنس کر کہا: "وہ تو گھر والوں نے بات بنائی تھی۔ اسی بابا خیرو کے ساتھ مل کر شہر چاندی سونا بیچنے جاتا تھا۔ گورنمنٹ پیچھے لگ گئی۔ پکڑا گیا اور کیا؟"

رشید کے پاؤں اپنی دکان کی طرف نہ اٹھے بلکہ وہ تیزی سے بابا خیرو کے تعاقب میں چلنے لگا۔ فقیرے نے دو تین آوازیں بھی دیں لیکن رشید سنی ان سنی کر کے چلتا گیا۔ باوجودیکہ خیرو لنگڑا تھا پھر بھی اس کی چال میں بلا کی تیزی تھی۔ آبادی سے بہت دور کھجوروں کا جھنڈ اور اینٹوں کا بھٹہ تھا۔ یہاں پہنچ کر رشید اور بابا خیرو میں صرف چند گز کا فاصلہ رہ گیا۔ رشید کی چال سست پڑ گئی کیونکہ اسے سمجھ نہ آ رہی تھی کہ آخر وہ بابا خیرو سے کہے گا کیا؟

بالآخر بابا خیرو نے تعاقب کرتے رشید پر ایک نظر ڈالی اور خود ہی بولا:

"حُبّ کا تعویز پورے دس روپے میں لکھ کر دوں گا لیکن شرط یہ ہے کہ شام سے پہلے پہلے کسی انار کے درخت پر ٹیک لگا دینا اور چالیس دن تک صبح و شام پانچ پتنگ ہماری خدمت میں حاضر کرنا ہوں گے۔ جوں جوں پتنگ ہوا میں اڑے گا محبوب پر تعویز کا اثر ہو گا۔"

رشید نے منمناتے ہوئے کہا: "جی تعویز تو نہیں لکھوانا مجھے۔"

"سمجھا۔ علاج کی غرض سے آیا ہو گا۔"

اب رشید بابا خیرو کے قریب آ گیا اور بہ منت کہنے لگا: "نہیں بابا۔ یہ بات نہیں ہے۔"

بابا خیرو نے رشید کو سر سے پیر تک گھورا پھر لمحہ بھر کچھ سوچ کر ہنس دیا۔ اس کے چہرے سے تمام بھیانک پن ختم ہو گیا اور رشید نے ہاتھ باندھ کر یک دم کہا:

"مجھے اپنے ساتھ لگا لے بابا خیرو۔ بخدا کبھی دم نہ ماروں گا۔"

"پتنگ کا دم چھلّہ دیکھا ہے کبھی۔"

"جی۔"

بابا خیرو نے سر ہلا کر کہا — "پتنگ پھٹتی ہے۔ کانپ ٹوٹتی ہے۔ ڈور کٹتی ہے لیکن دم چھلا ساتھ رہتا ہے۔ ہمارا کام بڑا مشکل ہے بابا لوٹ جا۔"

"میں انشاء اللہ دم چھلا بن کر ہی رہوں گا۔"

"دیکھ لے سوچ سمجھ لے۔ پانسہ پلٹتے دیر نہیں لگتی۔ کون جانے کل تو ہزاروں میں کھیلے اور میں بھیک مانگتا پھروں۔"

رشید نے بڑی منت بھری آواز میں کہا: "میں ساتھ چھوڑنے والا نہیں۔"

تو پھر شام کو کچھ نذر نیاز لے کر پہنچ جانا۔ شاگردی کوئی لڑکوں کا کھیل نہیں — اور دیکھ پتنگ اور گولے نہ بھولنا۔ ڈور کو مانجھا میں خود لگا لوں گا۔"

"بہت اچھا جی۔ پیسے چاہئیں تو آپ مجھ سے ابھی لے لیں۔"

"نہیں بھئی شام کو۔ ایسی جلدی کیا ہے۔ میرا ڈیرہ پتہ ہے نا؟"

رشید نے وثوق سے سر ہلاتے ہوئے کہا: "جی ہاں لاٹوں والے پھاٹک کے پاس ہی نا؟"

"بس وہیں ... وہیں ....."

www.iqbalkalmati.blogspot.com

نیم اندھیرا ہوا تو کنیاتی ہوئی پتنگ کو باباخیرو فضا میں سے اتارنے لگا۔ ہلکا سا سیاہ دھبہ اب ہولے ہولے زمین کی طرف بڑھ رہا تھا اور باباخیرو کہہ رہا تھا:

"اپنی عمر میں بہت کچھ سیکھا ہے رشید...... بہت کچھ سیکھا ہے۔ لوگوں سے قلعی کا پانی خشک نہیں ہوتا۔ شنگرف کی موم نہیں بنتی۔ ان ہاتھوں نے گندھک آملہ سار کا تیل بنایا ہے...... وہ کشتے مارے ہیں کہ مردہ چکھ لے تو جی اٹھتا...... اب تو ہمت ساتھ نہیں دیتی ورنہ تجھے بتاتا کہ سونا بنانا کیا چیز ہے"۔

جھپ کھاتا کنکوا کچھ ہی فاصلے پر ٹھپ سے گرا۔ رشید نے بھاگ کر دبوچ لیا۔ بابا خیرو گولے پر ڈور چڑھانے لگا۔ اندھیرا ہر طرف پھیل گیا تھا۔ دور سٹیشن کی بتیاں، ہیولا بنی فضا میں مدھم روشنی بکھیر رہی تھیں۔ سڑک کی دونوں جانب پھاٹک بند ہو چکا تھا۔ باباخیرو اور رشید کوٹھڑی کی طرف چل دیئے۔ دیئے کی روشنی میں باباخیرو کے چہرے پر ان گنت لکیروں کا جال سا نظر آنے لگا۔ اس نے پتنگ اور ڈوریں کھڑی جھلنگا چارپائی کے نیچے کھسکا دیں اور چٹائی پر بیٹھ کر کچھ پڑیاں اور پوٹلیاں کھولنے لگا:

"دیکھ یہ پتھر کنڈا ہے...... یہ جنگلی شلجم ہیں اور یہ ہے چوہے کنی..... آگ جلا لے..... اور دیکھ آگ بھی دو قسم کی ہوتی ہے۔ کوئلے کی آنچ کا کشتہ کچھ اور ہوتا ہے اور تھاپی کی تاثیر کچھ اور ہوتی ہے...... ان تھاپیوں کو ہولے ہولے جلانا۔ اگر آگ تیز ہوئی تو پتھر کنڈا چوہے کنی کی تاثیر کو چاٹ جائے گا"۔

رشید آگ جلانے لگا لیکن بار بار اس کی نظر کونے میں پڑی ہوئی دیگ پر جاتی تھی۔ پھر اس دیگ پر سے نظریں ہٹا کر وہ باباخیرو کو دیکھنے لگتا۔ ساری شام پتنگ بازی میں گنوانے والا باباخیرو اس وقت عینک چڑھائے ہوئے بڑے انہماک سے پوٹلیاں کھول کر چیزیں تول رہا تھا۔ اس کا چہرہ اس وقت بے حد پُرجلال نظر آ رہا تھا۔

رشید نے آگ جلائی۔ کوٹھڑی میں دھواں سا پھیل گیا۔ جب وہ دروازہ کھول کر پلٹنے

لگا تو دیگ کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس بے سروسامانی میں یہ چمکتی دیگ بڑی مضحکہ خیز لگ رہی تھی۔

"اس دیگ میں کیا تھا باباخیرو؟"

باباخیرو نے لمحہ بھر کو دیگ کی طرف دیکھ کر کہا: "اس دیگ میں؟..... اس میں چاندی تھی بیٹا چاندی..... قناعت کرتا تو عمر کو یہ دولت کافی تھی لیکن.... خیر آگ جل گئی؟"

رشید دیگ کو دیکھتا ہی رہ گیا۔

"آگ جل گئی رشید"۔

"جی ـــ!"

باباخیرو نے ترازو اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا: "ایک پلڑے میں سہاگہ ہے دوسرے میں گندھک۔ دونوں کو کھیل کرنا ہے۔ چل میں بتاؤں"۔

جس وقت رشید گھر چلا تو بارش شروع ہو چکی تھی۔ بجلی رہ رہ کر چمکتی تو اسے پانی میں آگے بڑھتے ہوئے اپنے بوٹ نظر آ جاتے۔ ساری راہ اس کے دل میں یہی سوچ تھی کہ کس طرح دوسرے دن ریشمی تہمد اور پگڑی خریدے گا کیونکہ باباخیرو کی فرمائش پوری کرنا ضروری تھا اور بزاز کے شیخ جی سے تعلقات اتنے گہرے تھے کہ بات نکل جانے کا اندیشہ تھا۔

اپنی ڈیوڑھی کا دروازہ اسے ذرا سا کھلا نظر آیا۔ قریب پہنچا تو اس نے ایک سائے کو دروازے میں کھڑے پایا۔ چھیماں نے ذرا سا چہرہ باہر نکال کر کہا:

"ذرا آہستہ آیئے گا چاچا چاچی جاگ رہے ہیں"۔

"پھر؟"

چھیماں نے ہولے سے کہا: "میں نے ان سے کہہ دیا ہے کہ آپ سو رہے ہیں"۔

کمرے میں پہنچ کر اس نے دروازہ بند کیا تو چھیماں نے پوچھا: "کچھ کام بنا؟"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"امید تو ہے۔"

چھیماں ہولے سے بولی: "لیکن اتنی دیر سے نہ آیا کریں۔ چاچا جی آج کئی بار پوچھ چکے ہیں۔"

"جب اس گھر میں سونے کی اینٹیں آئیں گی تو سب پوچھنا بند ہو جائے گا۔"

چھیماں نے لمحہ بھر اس کی طرف مشکوک نظروں سے دیکھ کر منہ پر انگلی رکھ لی اور کہنے لگی:

"آہستہ بولئے ذرا۔"

"کچھ کھانے کو ہو تو جلدی لا۔ آج تو سارا دن گھومتے ہی گزر گیا ہے۔"

لیکن چھیماں جگہ سے نہ ہلی اور پوچھنے لگی: "کام کیا شروع کیا ہے مجھے تو بتائیں۔"

"سب پتہ لگ جائے گا جلدی کا ہے کی ہے کچھ کھانے کو تو لا۔"

چھیماں چلی گئی تو وہ گیلے بوٹوں سمیت چارپائی پر دراز ہو گیا۔ اس کی نظروں کے سامنے چاندی سے بھری ہوئی دیگ گھومنے لگی۔

دوپہر کی دھوپ موکھے میں سے اتر کر عین وہاں پڑ رہی تھی جہاں چھیماں کا پھولوں والا رنگین بکس پڑا تھا۔ بابا خیرو کے پاس رشید کو گئے پورا ایک ہفتہ ہو چلا تھا۔ رشید کی جیب میں جو چوفی تھی وہ کھوٹی تھی اور جو اشیا بابا خیرو نے خرید کر لانے کو کہا تھا ان پر پورے تیس روپے لاگت اٹھتی تھی۔ چار دن سے تو وہ دکان پر بھی نہ گیا تھا۔ اسے یوں احساس ہو رہا تھا کہ اب کام بننے ہی والا ہے اور جوں جوں یہ احساس بڑھتا اس کی بے چینی بڑھتی جاتی۔ دھگدگی گئی، کانوں کی مرکیاں گئیں۔ . . . چاندی کی پازیبیں گئیں حتیٰ کہ وہ موتیوں والی تصویر بھی بک گئی جو چھیماں جہیز میں لائی تھی اور جو آتے ہی سامنے والی دیوار کی زینت بن گئی تھی چھیماں خاموشی سے اپنی چیزیں رشید کو پکڑاتی رہی لیکن جب رشید نے کنگن طلب کئے تو چھیماں نے

صاف انکار کر دیا۔ کنگن چھیماں کی ماں نے مرتے دم اس کی باہوں میں پہنائے تھے۔ یہ اس کی مرحوم ماں کی یاد سے بھی زیادہ مقدس تھے۔ دو ایک بار تو رشید نے دبی زبان میں ان کا مطالبہ کیا لیکن چھیماں جو بے حد ٹھنڈے مزاج کی عورت تھی ہر بار بھڑک اٹھی۔

آج صبح سے رشید کے دماغ میں بابا خیرو کا ڈیرا گھوم رہا تھا۔ وہ چارپائی پر چت لیٹا چھیماں کو دوپٹہ چھننے دیکھ رہا تھا۔ یک لخت اس نے محسوس کیا کہ چھیماں کی باہیں ننگی ہیں ان پر وہ کنگن نہیں جنہیں وہ رات کے وقت بھی نہ اتارتی تھی۔

"تمہارے کنگن کیا ہوئے چھیماں؟" رشید نے بالآخر پوچھا۔

چھیماں نے نظریں اٹھائیں اور منہ بنا کر کہا: "بند کر دیئے ہیں میں نے۔"

قید کی نظریں اس بکس پر ٹک گئیں جہاں دھوپ تختہ بنی چمک رہی تھی: "کیوں؟" وہ آہستہ سے بولا۔

"مجھے ڈر لگتا ہے کہ کہیں وہ بھی بابا خیرو کے ہتھے نہ چڑھ جائیں۔ نہ آپ کو نظر آئیں گے نہ آپ مانگیں گے"۔

رشید اٹھ کر بیٹھ گیا اور بڑے جوش سے بولا: "چھیماں۔ یہ کام بے استاد کے نہیں ہوتا۔ بابا خیرو استاد ہے۔ میں نے اسے خود چاندی بناتے دیکھا ہے۔"

چھیماں چڑ کر بولی: "جتنا سونا اس کے پیچھے تم نے گنوا یا ہے اس سے تو ہم چاندی کے توڑے خرید لیتے۔ توبہ! بڈھا ہے کس قدر شوقین! زمانے کی کوئی فرمائش ایسی نہیں جو رہ گئی ہو۔"

رشید نے بابا خیرو کی طرف داری میں کہا: "شوقینی کی کیا بات ہے۔ اکیلی جان ہے کسی طرح تو اپنا رانجھا راضی کرنا ہی پڑتا ہے۔ . . . سونا بنانا بھی تو بڑی بات ہے۔"

"مجھے تو چور لگتا ہے پورا۔ . . . سونا بنا سکتا تو یوں تم سے چیزیں نہ مانگا کرتا۔"

رشید نے جلدی سے کہا: "ارے بیوقوف ابھی اس کا کوئی سا گھر بھر دیتا ہوں۔ . . .

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کبھی کبھار کوئی ایک آدھ چیز لے جاتا ہوں۔ باباخود ہی بڑا سخی ہے..... بڑا وسیع کاروبار ہے۔ آئے دن شہر جاتا ہے بڈھا..... سونا بیچنے ہی جاتا ہے ورنہ اس کے کون سے لڑکے کالجوں میں پڑھتے ہیں۔"

"تمہیں تو ابھی سونے کی کیل تک بنا کر نہیں دی۔"

رشید چڑ کر بولا: "تمہارے بھائوں تو ہینگ لگے نہ پھٹکڑی اور سونے کی اینٹیں کہیں سے مل جائیں۔ گندھک آملہ سار کا تیل بنانا سیکھ لیا ہے۔ پاتال جنتر کے عمل کرنا جانتا ہوں۔ اب دو چار دن اور لگاؤں تو یقیناً سونا بن جائے گا۔ نسخہ میں جانتا ہوں فقط دو ایک باتیں وقت طلب ہیں۔ جونہی یہ گتھیاں حل ہوگئیں تیرے لئے سونے کی اینٹیں لا دوں گا۔"

"میں تو کہتی ہوں کوئی اور کام کرو۔ اب تو چاچا چاچی بھی شک کرنے لگے ہیں۔" چھیماں بالوں میں کنگھی کرتے ہوئے بولی۔

"اور کیا کام کروں۔ کہتی ہو تو شہر چلا جاتا ہوں لیکن وہاں بھی کتابت ہی کرنا پڑے گی کونسا وہاں پہنچ کر لوگ تحصیلدار لگا لیں گے۔"

"پھر بھی۔"

رشید نے بڑے جوش سے کہا: "چھیماں میرا جی کہتا ہے کہ بابا خیرو سونا بنانے کی ترکیب جانتا ہے۔ میں جانتا ہوں وہ اصلی بات بتاتا ہوا کنی کتراتا ہے لیکن تابہ کے؟ ارے جھلیئے چھ ماہ کی محنت کیا یونہی اکارت جائے گی تو مجھے بس مہینہ بھر کی اور مہلت دیدے۔ پھر دیکھ کیا ہوتا ہے۔"

چھیماں نے کندھے پہ برقعہ اٹھایا اور بولی: "میری طرف سے مہلت ہی مہلت ہے۔ لیکن اب ہمارے پلے کیا رہ گیا ہے جس پر بابا خیرو یہ سمجھے گا؟..... میں زینب کی طرف چلی ہوں وہاں آج گیارہویں کا ختم ہے شام کو آجاؤں گی۔"

جانے سے پہلے چھیماں نے ایک نظر اپنے پھولوں والے بکس پہ ڈالی اور پھر چور نظروں سے رشید کو دیکھتی ہوئی چل دی۔

جس وقت رشید ممدو کی دکان پہ پہنچا شام تو نہ ہوئی تھی لیکن دوپہر ڈھل چکی تھی۔ بدقسمتی سے ممدو کی دکان پر بڑا سا تالا پڑا تھا۔ رشید کا دل بجھ گیا اور اُسے واسکٹ کی اندرونی جیب بھاری لگنے لگی۔

اپنی دکان کے سامنے وہ کنی کترا کر نکل گیا۔ شیخ جی بازار کی جانب پیٹھ کئے کسی کتاب کو شکنجے میں کس رہے تھے۔ بازار سے نکلتے ہی اس کی رفتار تیز ہوگئی۔ اب اس کے جی میں یہ دھن سمائی تھی کہ جلد از جلد بابا خیرو کے ڈیرے پہ پہنچ جائے۔ راہ میں جہاں کھجوروں کا جھنڈ اور اینٹوں کا بھٹہ تھا اور جہاں پہلے پہل وہ بابا خیرو کا مرید ہوا تھا وہاں پہنچ کر اس نے اپنی اندرونی جیب ٹٹولی اور پھر ریلوے لائن کی طرف بھاگنے لگا۔

بابا خیرو کی جھونپڑی تک پہنچتے پہنچتے شام ہو چکی تھی۔ کیکر کے درخت اب سیاہ دھبے سے لگتے تھے اور لائن کا پھاٹک دھاریاں سی نظر آتا تھا۔ بابا خیرو کی جھونپڑی میں اندھیرا تھا۔ رشید نے نظر دوڑائی تو کچھ فاصلے پر بابا خیرو کو پتنگ اڑاتے دیکھا۔ وہ بھاگم بھاگ میدان میں پہنچا۔

"آ گیا..... شیخ بچے!"

"جی..... اتنے دن انتظام نہ ہو سکا اس لئے نہ آسکا۔"

"تیرے بعد..... میں نے تیل بنا لیا: تانبے پر ڈالا تو سونا بن گیا..... وہی رنگت وہی وزن....."

رشید کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ وہ آہستہ سے بولا: "اندر چلئے باباجی میں کچھ لایا ہوں....."

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"تُو چل میں آیا۔ اس وقت ٹھمکی نہ دی تو پتنگ آ گرے گی۔ بڑی مشکل سے آج چڑھایا ہے اسے..... ہوا بالکل بند ہے۔"

"بند کریں اس مشغلے کو۔ میں بڑا سامان لایا ہوں بابا خیرد۔"

پتنگ اور گولا سنبھال کر جب دونوں جھونپڑی کے اندر پہنچے اور بابا خیرد نے دیا سلگایا تو رشید نے کہا: "تو پھر بن گیا سونا بابا خیرد۔"

"ہاں بن تو گیا ہے لیکن ہے بھربھرا جیسے ریت ہوتی ہے لیکن خیر دیکھوں گا۔ اور پیٹھے۔ تُو کون سا سامان لایا ہے آج؟"

رشید نے بابا خیرو کی بات سنی تو اس کا دل بُجھ گیا۔ لمحہ بھر پہلے اس کا دل کِھل گیا تھا۔ اُسے کیسی امید بندھ گئی تھی کہ واپسی پہ وہ چھیاں کو یہ مژدہ سنا کر اپنا گناہ بخشوا لے گا۔ اب اُس نے بددلی سے اندرونی جیب ٹٹولی اور کنگن کی جوڑی ہتھیلی پہ رکھ کر بابا خیرد کی طرف بڑھا دی۔

بابا خیرد کچھ دیر کنگن دیکھتا رہا پھر ہولے ہولے اس کی دائیں آنکھ رشید کے چہرے پہ جم گئی۔ وہ آہستہ سے بولا:

"یہ کنگن کس کے ہیں رشید۔"

"جی۔ چھیاں کے ہیں۔" وہ بمشکل تمام بولا۔

خیرد کے جبڑے تن گئے۔ اس کی دائیں آنکھ بیر بہوٹی کی طرح سرخ ہو گئی۔ "اب تک تُو نے کیا کیا بیچ کھایا ہے رشید۔ سچ بول ورنہ ابھی مار ڈالوں گا۔"

رشید نے تعجب سے بابا خیرد کو دیکھا اور کہا: "بس یہ کنگن باقی ہیں سو لے آیا ہوں۔"

خیرد غصے سے تھر تھر کانپنے لگا اور گرج کر بولا: "یہ دیگ دیکھتا ہے؟ دیکھتا ہے یہ دیگ۔ اس میں میری روشناں کا زیور آیا تھا میں نے سب بیچ کھایا..... ایک ایک چیز گنوا دی اور روشناں بھی گنوا دی۔ لیکن یہ دیگ یہیں ہے۔ اور یہیں رہے گی۔ میں صبح و شام اسے دیکھ کر کہتا ہوں تُو روشناں کی آخری نشانی ہے تجھے بیچ کھاؤں تو سؤر کھاؤں، حرام کھاؤں

..... جا بھاگ جا۔ یہ کنگن لے جا ورنہ روشناں کی طرح وہ بھی چلی جائے گی۔ جا ابھی بھاگ جا..... جا کھڑا میرا منہ کیا تکتا ہے..... جا..... روشناں کا باپ سونا بنا لیتا تھا لیکن میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ جا بھاگ جا۔ ابھی وقت ہے۔ ورنہ سونا تو کیا بنے گا۔ مٹی کے ساتھ مٹی ہو جائے گا..... جا....."

رشید گھر پہنچا تو رات آ چکی تھی۔

ڈیوڑھی میں اندھیرا تھا اور اس کے ادھ کھلے پٹ میں کوئی کھڑا جھانک رہا تھا۔ رشید دھڑکتے دل سے اندر داخل ہوا تو شیخ جی نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر کہا:

"بیٹا۔ تم سے چھیاں لڑی تھی کیا؟"

رشید کی زبان نے کتنی ہی دیر ساتھ نہ دیا۔ پھر وہ آہستہ سے بولا:

"نہیں تو جی!"

"پھر پتہ نہیں کیا بات ہے۔ شام کو آئی تو بڑی دیر تک ٹرنک بستر جھاڑتی رہی پھر اپنا سامان باندھ کر چلتی بنی۔ کہنے لگی..... "چاچا جی کہا سُنا معاف کر دینا۔"

رشید کا ایک ایک پیر من من کا ہو گیا۔

"بھاگ کر سٹیشن تک تو دیکھ آؤ۔ شاید ابھی گاڑی نہ گئی ہو..... شاباش بیٹا شاباش....."

رشید سٹیشن پر نہ گیا بلکہ اسی پھاٹک پر جا پہنچا جہاں بچپن میں وہ اور فقیرا ریل دیکھنے جایا کرتے تھے۔ پھاٹک بند تھا۔ اس کا جی چاہا کہ کنگن اٹھا کر ریل کی پٹڑی پر رکھ دے۔ اور جب ریل کے پہیے انہیں پیس کر نکل جائیں تو آرام سے گھر چلا جائے۔ پھر دُور سے انجن سیٹی بجاتا ہوا دھواں اڑاتا ہوا نکلا۔ اس کے پیروں تلے زمین کانپنے لگی۔ ڈبوں میں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

لٹکتے ہوئے آدمیوں کے عکس اور روشنی کے تختے زمین پر بھاگتے چلے گئے۔ رشید دُور سے گاڑی دیکھتا رہا۔

دور جگنوؤں کی قطار سی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ صرف فضا میں گاڑی کے پہیوں کا شور رہ گیا۔ جیسے اب بھی وہ لا تقنطوا کا وِرد کرتی چلی جا رہی ہو۔

پھر کنگن ہاتھ میں گھلے ہوئے پیسے کی طرح سنبھالے وہ بابا خیرو کی جھونپڑی کی طرف پلٹ گیا۔

جھکورا

شہر کی طرف آتے ہوئے شیر پاؤ پل سے کچھ آگے جہاں گلبرگ کی جانب مڑنے والی سڑک ہے۔ اس موڑ سے قریباً دس پندرہ فٹ پہلے وہ مجھے ملا۔ میرا خیال ہے کہ چند لمحے پہلے سڑک پر کوئی آدمی نہیں تھا۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ وہ اسی طرح پہلے سے موجود ہاتھ ہلا کر کار روک رہا ہو اور میں اپنی خود نگری کی وجہ سے اسے دیکھنے سے معذور رہا ہوں۔

سردی تھی ـــــ بہت سردی تھی۔ خزاں دیدہ پتے گلبرگی درختوں سے اُتر کر سڑک پر ہر جانب ہولے ہولے پانی کی لہروں جیسے آگے بڑھ رہے تھے۔ کچھ فاصلے پہ پٹرول پمپ کی کھڑکیوں کے تمام شیشے دُھند آلود تھے ـــ موسم پر سال سے بچھڑنے کا غم طاری تھا۔

میرا خیال ہے اس وقت اس نے دھاری دار پینٹ اور اُونچے کالر کا سیاہ سویٹر پہن رکھا تھا۔ اس کے چہرے پر نہ تو ڈاڑھی اور نہ ہی مونچھیں تھیں۔ لیکن جس وقت میں نے ڈرائیور کی ساتھ والی سیٹ کا دروازہ کھولا اور اس نے چھوٹے ایرڑول بیگ کو گود میں رکھ کر دروازہ بند کیا۔ اس وقت وہ سفید قمیض شلوار اور سیاہ کوٹ

پہنے ہوئے تھا۔ اس کی گھنی ڈاڑھی میں مونچھیں ملی ہوئی تھیں۔ شاید اس سے پہلے میں سبز بتی میں بنا ہوا تیر کا نشان غور سے دیکھ رہا تھا۔ جب اچانک خالی سڑک پر اپنی بتی کا نشان مل جائے تو بڑی کوفت ہوتی ہے۔ کیونکہ خالی سڑک پر تو ویسے بھی اپنا حق ہوتا ہے۔ ہری بتی کی چترائی اس وقت اچھی نہیں لگتی۔

"میں آپ کی کار کبھی نہ روکتا —— لیکن مجھے گیارہ بجے والی فلائیٹ سے کراچی جانا ہے اور اس وقت کوئی سواری نہیں مل رہی اتفاق سے۔"

میں ابھی کچھ دیر پہلے اسلام آباد روانگی کے لئے اپنی والدہ کو ائیر پورٹ پر چھوڑ کر آرہا تھا۔ ائیرپورٹ کی طرف واپس لوٹنا مجھے ناگوار گزرا لیکن میں نے ایسی شائستگی سے جس کے تلے ناگواری چھپی تھی کار موڑ لی۔ راستہ سنسان تھا۔ اس کے بیگ کی شکل سے شبہ ہوتا تھا۔ جیسے وہ اس میں حشیش، یا ہیروئن لے کر جا رہا ہو۔ اس نے براؤن بیگ کو بڑی سختی سے اپنے ہاتھوں میں پکڑ رکھا تھا۔

"ایک بار اسی طرح میں لینن گراڈ میں بھی پھنس گیا تھا۔ لیکن اللہ نے آپ جیسا اہتمام وہاں بھی کر دیا۔ آپ کا کیا خیال ہے —— کیا خدا ایسے دنیاوی انتظامات میں دلچسپی لیتا ہے ——؟"

میں نے نئی مازدا کی اندرونی نیلی بتی میں ایک نظر اس پر ڈالی۔ وہ مجھے لات و منات کی شکل کا فرشتہ نظر آیا۔ اس کا چہرہ ساخت کے اعتبار سے یہودی تھا۔ رنگت اس کی قبائلی پٹھانوں کی طرح اڑی اڑی شنگرفی سفید تھی۔ میں اس کے ساتھ خدا اور اس کے انتظامات کو زیر بحث لانا نہیں چاہتا تھا۔

"کبھی آپ کو ایسا اتفاق ہوا ہے ——"

"جی نہیں ——"

"شروع زندگی سے میں ایسے ہی واقعات سے دوچار رہا ہوں۔ مجھے جیسے کوئی اندرونی طاقت آنے والے واقعات کے لئے بہت پہلے تیار کر دیتی ہے ——"

وہ چہرے سے بہت خاموش نظر آرہا تھا۔ یوں نہیں تھا کہ وہ کسی اجنبی کے ساتھ پہلی ایمرجینسی ملاقات میں ایسی باتیں کرنے پر رضامند ہو سکے۔

شیر پاؤ پل کچھ ایسا لمبا نہیں ہے لیکن اب مجھے محسوس ہونے لگا کہ اس سڑک پر لگی ہوئی چھوٹی چھوٹی بتیاں دونوں جانب بنی ہوئی دیوار لامتناہی تھی۔ یہ پل جس قدر پیچھے کی طرف طے ہوتا جاتا اسی قدر آگے کی طرف بڑھتا۔ شاید پلوں میں یہ خاصیت ہوتی ہے کہ دن کے وقت یہ جلدی طے ہو جاتے ہیں —— اور رات کو؟

"جب میں چھوٹا تھا۔ تو مجھے خواب میں پتہ چل جاتا تھا کہ کون بیمار ہونے والا ہے پھر —— جب بھائی یا ماں بیمار پڑ جاتی تو مجھے زیادہ حیرت یا دکھ نہ ہوتا —— آپ کے ساتھ کبھی ایسے ہوا ہے ——؟"

"جی نہیں ——"

ابھی تک ہم شیر پاؤ پل کو کراس نہیں کر سکے تھے۔

"ہاں کچھ لوگوں پر صدمہ یا حادثہ اس لئے بھی شدید ہوتا ہے کہ وہ اس لئے تیار نہیں ہوتے۔ پچھلے سال میرا موٹر سائیکل ایک ٹرک سے ٹکرا گیا۔ موٹر سائیکل پاش پاش ہو گیا۔ لیکن سوائے میرے ماتھے کے اور کوئی خراش نہیں آئی۔ بس یہ دیکھئے یہاں ایک انچ بھر نشان ہے ——"

میں نے اس کی طرف نگاہ ڈالی اس کے ماتھے پر ایک انچ لمبا زخم کا نشان تھا۔

"یہ بھی کوئی حادثے کی وجہ سے نہیں پڑا —— حادثے سے بہت پہلے —— میں جانتا تھا کہ —— ایک ٹرک جس کا نمبر ۲،۱۳ ہوگا اور جس کے پیچھے پپو یار تنگ نہ کر لکھا ہوگا اس سے میرا موٹر سائیکل ٹکرائے گا —— میں حادثے سے بہت پہلے اس کے لئے تیار تھا۔ جس وقت میں ٹرک کی زد میں آیا۔ میں نے چھلانگ لگا دی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سائیکل سے، افسوس جہاں میں کودا ہوں وہاں کوئی ہوتی روڑی پڑی تھی۔ ایک پتھر اُڑ کر میرے ماتھے کو زخمی کر گیا ــــــ"

"جی ــــــ"

چھاؤنی کا علاقہ سردی کی رات میں بڑی ترتیب اور خاموشی سے سویا ہوا تھا۔ اس کی دوکانوں کے دروازے بند، کوٹھیوں کے پھاٹک مقفل اور راستوں کی چوکیاں خالی تھیں۔ فٹ پاتھوں پر پتے دسمبر کی پہلی بارش میں بھیگ کر چمکنے لگے تھے۔

میری کار کا وائپر چلنے لگا اور بارش کے پہلے قطروں سے بانٹ بھیگ کر سٹیل کی طرح روشن ہو گیا۔

"سنتے تھے کہ اگر کسی کو حادثہ پیش آنا ہو تو گھر سے ہی موت اس کے ہمرکاب ہو جاتی ہے ــــــ"

اس وقت میرا ارادہ ہوا کہ اسے دھکا دے کر کار سے باہر نکال دوں۔

"لیکن یہ بھی سنا ہے کہ اگر راستے میں وہ موت کے ساتھ اچھا سلوک کرتے تو کئی بار موت اُسے ساتھ نہیں لے جاتی؟ آپ کا کیا خیال ہے؟ ــــــ کیا موت انسان کی مہربانیوں سے اپنے فیصلے بدل سکتی ہے؟"

بدقسمتی سے کار میں ہیٹر نہیں تھا اور مجھے اپنی ریڑھ کی ہڈی پر ٹھنڈے پانی کی پتلی سی دھار پڑتی محسوس ہو رہی تھی۔

"میری موت سے ملاقات نہیں ہے ــــــ"

"ہاں کچھ لوگ صرف ایک بار موت سے ملتے ہیں اور پھر واپس آ کر کسی کو کچھ بتا نہیں سکتے ــــــ لیکن میں موت سے کئی بار ملا ہوں ــــــ"

اب مجھے اس سے باضابطہ طور پر خوف آنے لگا تھا۔ اگر کار کے سکڈ کرنے کا ایسا خدشہ نہ ہوتا تو میں سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چلتا ــــــ

"وہ اپنی خوشبو سے پہچانی جاتی ہے ــــــ جہاں کہیں سے بھی گزرتی ہے اس کی خوشبو سے تھوڑی دیر کے لئے ہر درخت پتا جاندار ساکت ہو جاتا ہے۔ جیسے کلوروفارم کے اثر تلے آ گیا ہو ــــــ"

ائیرپورٹ اچانک بہت دور چلا گیا تھا ــــــ ریگستان میں کھویا ہوا نخلستان، اردگرد کی آبادی سو رہی تھی اور میں اس خوبصورت مرد کے ساتھ بالکل تنہا تھا۔

"موت کی خوشبو بہت ہلکی ہوتی ہے۔ ایک ثانیے کے ہزارویں حصے میں آتی ہے۔ لیکن یہ خوشبو کسی اور خوشبو سے نہیں ملتی۔ آپ کو سمجھاؤں کیسے بڑا مشکل کام ہے۔ اگر بھیگے ہوئے نارنگی کے باسی چھلکوں میں تھوڑا سا مشکِ نافہ اور تھوڑے سے لونگ ملا کر بھاپ تیار کی جائے جس کو (CONDENSE) کر کے ایتھر کی شکل دی جائے تو ــــــ"

"دیکھئے یہ کار میرے چچا کی ہے۔ میرے پاس ابھی صرف (LEARNERS) کا لائسنس ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ کے لئے بھی بہتر ہے اگر آپ ــــــ"

"آپ پڑھتے ہیں؟"

"جی میں انجینئرنگ کے فائینل میں ہوں ــــــ"

"لیکن اب تو یہ پروفیشن لڑکیوں میں مقبول نہیں رہا۔ پھر آپ نے یہ پیشہ کیوں چُنا ــــــ؟"

"لڑکیاں اب بھی انجینئروں سے محبت کرتی ہیں؟"

"جی میرا خیال ہے کہ یہ ڈاکٹروں کا عہد ہے ــــــ ڈاکٹر جیسی سیکورٹی کوئی مرد آفر نہیں کر سکتا۔ آپ کا کیا خیال ہے ــــــ؟"

وہ پہلے ایک بات سختی اور وثوق سے کرنے کے بعد یک دم ڈھیلا پڑ کر سوالیہ بات کر بیٹھتا تھا۔ کار بڑی تیزی سے آگے جا رہی تھی۔ لیکن راستے کے تمام درخت پیچھے کی طرف بھاگنے کے بجائے آگے کو سرپٹ دوڑ رہے تھے۔ یہ (PHENOMENON)

www.iqbalkalmati.blogspot.com

میں نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔

"ملٹری کے جوان بھی کافی آؤٹ آف ڈیٹ ہو گئے ہیں۔ شادی کی ELEGIBILITY کے اعتبار سے۔

میری ونڈ سکرین پر بارش کے باوجود صوبی بلی کی طرح چادر میں لپٹی لپٹائی بیٹھی ہوئی مسکرا رہی تھی۔ اچانک اسے ساتھ پا کر میری ہمت بڑھنے لگی اور میں نے کار کی رفتار آہستہ کر دی۔

"لیکن لڑکیوں کے معاملے میں ہمیشہ محتاط رہنا چاہیئے یہ بلاوجہ کسی وقت بھی اپنی رائے بدل سکتی ہیں۔"

"خیر بلاوجہ تو کوئی لڑکی اپنی رائے نہیں بدلتی ——"

"آپ کو عورتوں پر بہت اعتماد ہے؟"

"عورتوں پر نہیں مجھے اپنی کزن صوبی پر بہت اندھا بھروسہ ہے ——"

پتہ نہیں میں کیوں اس سے باتیں کرنے پر مجبور تھا۔ حالانکہ مجھے اس کے بیٹھنے کا طریقہ اور بہاولپوری جوتی اس وقت بہت بُری لگ رہی تھی۔

"عورتیں نہ بدلیں تو صدیوں نہیں بدلتیں۔ لیکن جب ان کا دل بدلتا ہے تو ایک پل بھی نہیں لگتا۔ نہ صرف وہ نظریئے رائے یا سوچ بدل لیتی ہیں۔ بلکہ ان کا سارا رویہ ان کے تمام MOLECULE بدل جاتے ہیں جسم کے۔"

"یہ بات مرد کے متعلق بھی کہی جا سکتی ہے؟" میں نے چڑ کر کہا۔

"بلکہ یہ بات چونکہ ہمیشہ مرد کے متعلق کہی گئی ہے۔ اس لئے یہ بات (SHOCKING) نہیں رہی، عورتوں کے متعلق تعجب ہوتا ہے۔ اس نے منہ میں سگریٹ لی۔ بائیں ہاتھ کا پیالہ بنا کر جلتی ماچس سے سگریٹ جلایا، اس وقت مجھے لگا —— اس کی ہتھیلی میں دل کی شکل جیسی روشنی ابھری اور پوری قوت کے

ساتھ پمپ کرنے لگی۔ مجھے لگا —— اس کا دل سینے کے بجائے ہاتھ کی ہتھیلی میں تھا اور سگریٹ کی روشنی کے باعث میں نے اسے برہنہ دیکھ لیا تھا۔

بکرے کے دل کے سوائے میں نے آج تک کسی جاندار دل کو نہیں دیکھا۔

میں اپنے ہمسفر سے خوفزدہ تھا۔ لیکن اپنے خوف کے اظہار کے لئے مجھے کوئی مناسب الفاظ نہیں مل رہے تھے۔ میں باتوں کا رُخ بڑی دنیاوی معمولی حقیقتوں کی طرف موڑا۔

"آپ کراچی میں کیا کام کرتے ہیں ——؟"

"مختلف وقت پر مختلف کام ——"

"کیا مطلب ——؟"

"پہلے میں ائر ٹریول ایجینسی میں ملازم تھا۔ پھر کچھ دن میں نے بوری بازار میں کاروبار بھی کیا۔ ایک ویکلی میں بھی رہا ہوں کچھ عرصہ —— دراصل کراچی میں ملازمت اہم نہیں ہوتی —— کراچی شہر اہم ہوتا ہے ——"

میں اب کچھ کچھ محفوظ ہو رہا تھا۔

"ہر بڑا شہر اہم ہو رہا ہے وہاں کے لوگ اہم نہیں ہوتے —— کراچی بڑا ہے —— اہم ہے وہاں کے لوگ اپنی اہمیت بنانے کی خاطر بہت کچھ کرتے رہتے ہیں۔ جہاں آگ لگی ہو وہاں صرف آگ نظر آتی ہے۔ جلنے والی چیزوں کا وجود نہیں رہتا —— بڑے شہر بھی ایسے ہی ہوتے ہیں ——"

"آج کل آپ کیا کرتے ہیں ——"

وہ بڑی دیر تک اپنے بیگ کو سخت ہاتھوں کی گرفت میں ٹٹولتا رہا۔

"آج کل ——؟"

"جی آج کل ——"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"اس نے میری بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ شاید اس کے بیگ میں سمگل کی ہوئی گھڑیاں ہیرے یا چرس تھی۔

"کچھ دیر میں ایک ایسے گروہ کے ساتھ بھی رہا ہوں۔ جو سیل بوٹز میں سمگلنگ کرتے ہیں۔ میرے ساتھ تین مکرانی اور ایک پٹھان لڑکا تھا۔ ہم بظاہر مچھلیاں پکڑنے کے لئے کئی کئی میل اندر جایا کرتے تھے۔ لیکن ہمارا کاروبار بہت مختلف تھا ـــ"

مجھے پھر اس کی قزاقی ڈاڑھی سے خوف آنے لگا۔

"کبھی آپ پکڑے نہیں گئے ـــ"

اس نے میری طرف ایک بحری نگاہ ڈالی اور ہولے سے بولا ـــ "اتفاق سے میں کبھی پکڑا نہیں گیا ـــ"

"آج کل کیا کرتے ہیں آپ کراچی میں ـــ"

مجھے لگا ـــ شیر پاؤ کا پل ایک جست میں ختم ہو گیا اور ہم لاہور ایئرپورٹ میں داخل ہو گئے۔ جس وقت وہ دروازہ کھول کر باہر نکلا کراچی فلائٹ کی اناؤنسمنٹ ہو رہی تھی۔ اس نے مجھے رسماً سلام کیا اور بغیر شکریہ ادا کئے۔ اندر کی طرف بھاگ گیا۔
میں نے کار موڑی اور سگریٹ سلگانے کے لئے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ میرا بٹوہ غائب تھا۔ بریک لگا کر میں نے بار بار تمام جیبیں دیکھیں سامنے سیٹ کے اِدھر اُدھر پچھلی سیٹ پر ہر جگہ تلاش کیا۔ لیکن بٹوہ غائب تھا اور اس میں میری فیس کے علاوہ پانچ سو روپیہ زائد تھا۔

سُرخ ڈاڑھی والے کی چابکدستی سے محجوب ہو کر میں نے گھر کا راستہ لیا، شیر پاؤ پل کے عین وسط میں جہاں سے سامنے کا نشیب واضح ہونے لگتا ہے۔ وہاں یکدم وہ دروازہ کھل گیا۔ جس طرف سے وہ جیب کترا اندر داخل ہوا تھا۔ میں چونکہ کار تیز چلا رہا تھا۔ اس لئے میں نے جلدی سے دروازہ بند کرنے کی کوشش

کی۔ اس کوشش میں کار ڈول گئی اور پچھلی طرف سے زن کرتی ایک سفید کار ایک ثانیہ بعد میری گاڑی کو کراس کر کے آگے نکل گئی۔ اگر کار کا دروازہ چند لمحے بند نہ ہو جاتا تو دونوں تیز رفتار کاروں کا حادثہ ہو جاتا۔

جس وقت میں اپنے چچا کے گھر داخل ہوا ساری سڑک خاموش تھی صرف گھروں کی بیرونی روشنیاں جل رہی تھیں۔ گھر میں کسی قسم کی چہل پہل نہ تھی۔ صرف ایک سفید کار پورچ میں کھڑی تھی۔ میں نے گھنٹی بجائی۔ میرے لئے صوبی نے دروازہ کھولا۔ وہ کالی چادر اوڑھے سر سے پاؤں تک پوشیدہ تھی۔

"اتنی دیر کیوں لگا دی ـــ"

میں نے اسے اجنبی ہمسفر کے متعلق بتانا چاہا لیکن آج صوبی کے رویّے میں کچھ ایسی بات تھی کہ میں اسے کچھ نہ کہہ سکا۔

"چابیاں لے لو ـــ"

میں نے چچا کی نئی مزدا کی چابیاں اسے دیدیں۔ اس چابیوں کے گچھے میں کوئٹہ کے پتھر کا گھڑا ہوا دل بھی لٹک رہا تھا۔

میں نے صوبی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے پاس لانے کی کوشش کی۔ آج اس کے جسم میں وہ البیلی کیفیت نہیں تھی۔ اس سے پہلے اگر کبھی اندھیرے سویرے ہم دونوں تنہا مل جاتے تو وہ ہوا کے رخ پر اڑنے والے کپڑے کی طرح میری طرف بڑھتی آتی۔

"کیا بات ہے؟"

"کچھ نہیں ـــ"

اس کا لہجہ خشک سبزیوں کی طرح بے رس تھا۔

"کچھ ہوا ہے ـــ"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"کچھ نہیں ——"

"پھر ایسے کیوں بول رہی ہو ——"

"اور کیسے بولوں ؟ ——"

"جیسے ہمیشہ بولتی رہی ہو۔ تقریباً چار سال سے ۔"

وہ چپ چاپ اندر کی طرف چلی گئی ۔ اس کی چال میں ---- خاص قسم کی بیزاری تھی ۔ جیسے اس کا معدہ خراب ہو یا بخار کی آمد آمد ہو۔ میں دیر تک سونے کی کوشش کرتا رہا ۔ لیکن واقعات کے الٹ پھیر کی سمجھ مجھے نہ آرہی تھی ۔ پھر صوبی کے بدلے ہوئے موڈ نے تو رہی سہی کسر پوری کر دی تھی ۔ بالآخر میں نے ڈریسنگ گاؤن پہنا اور صوبی کے کمرے پر جا کر دستک دی ۔ اندر سے اتنی رات گئے بھی آوازیں آرہی تھیں ——

صوبی نے دروازہ کھولا ۔ وہ ابھی تک کالی چادر میں سر سے پاؤں تک ڈھکی ہوئی تھی ۔

"جی صر ——"

"میں اندر آجاؤں ——"

"آجاؤ —— کیوں کیا بات ہے ۔"

صوبی کے پلنگ کے پاس چھوٹے سے صوفے پر ایک اجنبی بیٹھا تھا ۔ اس نے دھاری دار پتلون اور اونچے کالر کا سیاہ سویٹر پہن رکھا تھا ۔ وہ خطرناک حد تک کلین شیو تھا ——

میں کچھ کچھ OUT SIDER کی طرح ان دونوں کی ملاوٹ کا اندازہ لگانے لگا ——

"یہ منصور ہیں —— ابھی ابھی آئے ہیں کراچی سے ۔ تم سے کوئی دس

منٹ پہلے ۔"

"منصور —— ؟"

"جی پچھلے سال میں صوبی سے ملا تھا کراچی میں . . . . ."

پچھلے سال جب وہ کراچی گئی تھی ؟ لیکن آج تک اس نے کبھی مجھ سے ذکر نہ کیا تھا کہ وہ کسی منصور کو بھی جانتی ہے ۔

"میں ڈاکٹر ہوں کراچی میں —— ڈیفنس میں میرا کلینک ہے ۔"

میں نے صوبی کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا ۔ چچا کا گھرانہ اتنا ماڈرن تو تھا کہ اس میں کوئی منصور کسی وقت داخل ہو سکتا تھا لیکن اس قدر گھٹیا نہیں تھا کہ مجھ سے بات توڑے بغیر صوبی کسی منصور کو اپنے بیڈ روم میں آنے دیتی ۔

"ہم نے فیصلہ کیا ہے —— ہم شادی کر رہے ہیں ۔"

میرے اندر باہر لکنت جاری ہو گئی ۔

"دراصل یہ فیصلہ میں نے ابھی کیا ہے ۔ ابھی پانچ منٹ پہلے ۔"

صوبی نے غسلخانے کی طرف مڑتے ہوئے کہا :

"اگر منصور کراچی سے آج نہ آتے تو شاید میں یہ فیصلہ نہ کرتی ۔"

۔ صوبی غسلخانے کا دروازہ کھول کر اندر چلی گئی ۔ میں بند دروازے کی طرف دیکھتا رہ گیا ۔

"بیٹھئے —— بیٹھئے ناں ——"

میں کھڑا رہا ۔

"ابھی میرے ساتھ ایک عجیب واقعہ ہوا ۔"

میں نے ڈر کر اس کی طرف بھرپور نگاہ ڈالی ۔ منصور کے ماتھے پر اچھی سی چوٹ کا ایک انچ نشان تھا ۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"میرا خیال ہے کہ ___ لیکن میرا کچھ خیال نہیں ___ شاید میں بہت زیادہ خوش ہوں اس لئے باتوں کو صحیح CONTEXT' میں نہیں سمجھ سکتا۔"

صوبی غسلخانے کے اندر تھی۔ وہ فیصلہ بدل چکی تھی۔ چار سال کی مسلسل محبت کو پانچ منٹ میں الوداع کہہ کر شاید غسلخانے کے اندر وہ منہ پہ کریم مل رہی تھی۔ شاید اس کا رویہ بھی مکمل طور پر بدل چکا تھا۔

منصور نے مجھے سگریٹ پیش کی۔

"جی ابھی ابھی میں نے سگریٹ بجھایا ہے۔ شکریہ۔"

منصور نے سگریٹ منہ میں لیا۔ ماچس جلائی پھر بائیں ہاتھ کا پیالہ بنا کر ماچس کیلئے اوٹ بنائی۔ مجھے لگا۔۔۔۔ ایک سرخ دل اس کی ہتھیلی میں روشن ہو گیا اور قلب کی حرکت مجھے صاف صاف دکھائی دینے لگی۔ میں نے اس کے چہرے کو دیکھا۔ اس پر ایک انچ لمبا زخم کا نشان تھا۔

"میں صوبی کی زندگی میں داخل نہیں ہونا چاہتا تھا۔ میں ___ پتہ نہیں آپکو کیسے سمجھاؤں کہ ابھی دس منٹ پہلے جب میں لاہور میں داخل ہوا۔ میرا ارادہ صوبی سے ملنے کا بھی نہ تھا ___ پھر ائیرپورٹ سے ادھر شہر کو آنے کے لئے میں نے اپنے دوست کی کار مستعار لی۔ جہاں شیر پاؤ پل ہے وہاں۔۔۔ ایک آدمی نے مجھ سے لفٹ مانگی۔۔۔ اور۔۔۔ میں اور وہ باتیں کرنے لگے۔ آپ کا کیا خیال ہے شیر پاؤ پل کتنا لمبا ہے؟"

"کچھ زیادہ نہیں۔"

"کراچی سے آئیں تو پہلے پہل فاصلوں کا اندازہ نہیں ہوتا۔ میرا خیال تھا کہ یہ پل پانچ سات میل سے کم نہ ہو گا۔"

میں نے اس کی طرف غور سے دیکھا۔

"میں حیران ہوں کہ وہ اجنبی میرے اندر کے حالات سے کیسے واقف تھا صوبی کے ساتھ شادی کرنے کا فیصلہ اس ہی کی وجہ سے ہوا۔۔۔۔"

اس کے بعد وہ کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنی ہپ پاکٹ سے میرا پرس نکالا اور بولا:

"حیرانی کی بات ہے کہ اس کا پرس میری کار میں گر گیا ___ میں تو اس شہر میں قریباً اجنبی ہوں۔ لیکن اگر آپ اخبار وغیرہ میں اشتہار دے کر یہ پرس اُسے دلوا سکیں تو مہربانی ہو گی۔"

میں نے پرس اس سے لیا۔ اپنی جیب میں رکھا اور کمرے سے نکل آیا۔ مجھے ہلکا سا شبہ تھا کہ وہ مجھ پہ ہنس رہا ہے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

روس سے ــــ معذرت کے ساتھ

کسی ملک، شہر، کسی موسم کو جاننے کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ اس پر کسی واقعے یا انسان کی مہر لگ جائے ورنہ جگہوں کو دیکھ لینے سے کبھی وہاں کا کچھ یاد نہیں رہتا۔ شہر، ملک اور موسم ہسٹری یا جغرافیہ میں محبوس نہیں رہ سکتے۔ لمحوں میں زندہ رہ جاتے ہیں۔ جب میں نیا نیا روس گیا تو میرا خیال تھا کہ موسکاؤ کو جاننے کیلئے مجھے وہاں کی تاریخی عمارتیں، ان کا لٹریچر، ان کے اخبار، رہن سہن کا طریقہ اچھی طرح نوٹ کرنا چاہئے ـــــ یہ وہ وقت تھا جب میں موسکاؤ یونیورسٹی میں پی۔ ایچ۔ ڈی کے حصول کے لئے داخل ہوا تھا۔ اسی لئے میں نے نہ صرف تیزی سے زبان سیکھنی شروع کی بلکہ وہاں کی عمارتیں اور میوزیم بھی کھنگالنے شروع کر دیئے۔

میرا سارا دن گردن اٹھائے گزرتا۔ خوبصورت بالشویک تھیٹر جیسی عمارتیں دیکھ دیکھ کر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ روس میں بھی آرکیٹیکٹ کے مختلف اثرات کہیں نہ کہیں سے آتے رہے ہیں جیسے بہتے پانیوں میں خس و خاشاک اکٹھا ہوتا رہتا ہے۔ یولوپیا سے اٹھارویں صدی تک بائی زن ٹائین اثرات غالب تھے۔ کیف، موسکاؤ، لینن گراڈ ان ہی تین شہروں کو عرصے سے کلچرل برتری حاصل رہی ہے۔ کیونکہ عرصے سے روسی زندگی پر جنگلات حاوی رہے ہیں اس لئے ان کی عمارتوں پہ بھی عمارتی لکڑی کا

چوکھٹا سجا ہے ۔ یوں سمجھئے روسی آرکیٹیکٹ میں عمودی تسلسل ہے ۔ وہ دوسرے ممالک سے جو کچھ بھی مستعار لیتے ہیں کچھ اسے ایسے مشرف بہ روس کرتے ہیں کہ وہ چیز وہ سٹائل ساختۂ روس بن جاتا ہے ۔ کیف میں سینٹ صوفیہ کا گرجا جو اہم گرجا بات ہے بائی زن ٹائین اثرات کا حامل ہے ۔ کریملن کے دو اہم گرجے لاطینی سٹائل کی نشان دہی کرتے ہیں ۔ پیٹرز برگ کا تمام عمارتی سرمایہ جرمن ، فرانسیسی ، اطالوی اثرات سے پُرکشش بنا ہے ۔ نیو ماسکو سٹیٹ یونیورسٹی جس کا میں طالب علم رہا ہوں سکائی سکریپر کے انداز پر بنی ہے اور اس میں بتیس منزلیں ہیں ۔ کریملن کے خوبصورت موٹف انگریزوں کی احیا کی خوشبو میں بسے ہیں لیکن روسی لوگ باگ ان اثرات کو نہیں مانتے ۔ ان کا خیال ہے کہ روس کا سب کچھ ان کا اپنا خود ساختہ ہے ـــــ اور وہ آرٹ سے لے کر سائنس تک کسی کے مرہونِ منت نہیں رہے حالانکہ انکی سائنسی ترقی میں بھی دوسروں کا ہاتھ رہا ہے ۔

جس روز پہلی بار میں ایئرپورٹ سے اتر کر موسکاؤ کی طرف روانہ ہوا تو راستے کی ہمواری ، کبھی کبھار خوبصورت دیہاتی بنگلے جنہیں روسی داچو کہتے ہیں نظر آنے لگے ۔ میں نے اپنے ساتھی سے انگریزی میں کہا :

'یہ علاقہ اسلام آباد کی طرح خوبصورت ہے ۔ کیا آپ کبھی اسلام آباد گئے ہیں ؟"

میرے روسی ساتھی کا رنگ گلابی ہو گیا ۔

' اسلام آباد ؟ لیکن یہ تمام برچ کے درخت ہیں اور ماسکاؤ کی آب و ہوا اسلام آباد سے بہت مختلف ہے ۔ یہ تمہیں کیسے خیال آگیا کہ یہ جگہ اسلام آباد لگتی ہے "۔

ایسی ہی ایک غلطی ایک بار اماں نے بھی کی تھی ۔ میں تب تین سال کا تھا ہر ماں کی طرح میری اماں کا یہ خیال تھا کہ میں بہت خوبصورت ہوں ۔ اسی غلط فہمی کی بنا پر

ایک مرتبہ اس نے اپنی جیٹھانی سے کہہ دیا :

"دیکھو تو قیوم تمہارے بیٹے سے کتنا ملتا ہے ـــــ

میری تائی اماں کو ہاں کی یہ بات اس قدر بُری لگی تھی کہ اس دن کے بعد انہوں نے ہمارے گھر نہ آنے کی قسم کھالی ۔

میں نے بھی اس روز یہ فیصلہ کر لیا کہ روس کی کوئی بات پاکستان سے نہیں ملتی ۔ ہاں پاکستان کی تمام باتیں امریکہ اور روس سے ملتی جلتی ہیں ۔

ہر نئے سیاح کی طرح ماسکاؤ میں نیا نیا پہنچ کر میں بھی وہاں کی تاریخی عمارتوں کو ہی روس سمجھتا رہا ۔ کریملن یو پیشکو تھیٹر گرجے گھر ، گمنام سپاہی کی قبر پر جانا میرا معمول تھا ۔ اس کے سوا مجھے وہاں کی ہسٹری کا خبط ہو گیا تھا ۔ اپنے ہم وطنوں کو روس کے متعلق معلومات بہم پہنچانا ، خطوں میں روس اور پاکستان کا مقابلہ کرنا میرا محبوب مشغلہ تھا ۔ رفتہ رفتہ مجھے پتہ چلا کہ جس طرح شاہی مسجد لاہور میں ، جہانگیر کا مقبرہ پاکستان میں ، ایسے ہی ہم پتھریلی عمارتیں روس میں ہیں ۔ یہاں کے لوگ بھی ان عمارتوں کو اتنی ہی اہمیت دیتے تھے جتنی مچھلی پانی کو دیتی ہے ۔

عمارتوں کے چکر سے نکل کر میں نے میوزیم کھنگالنے شروع کر دیئے ۔ آرٹ کا جس قدر خزانہ موسکاؤ اور لینن گراڈ میں ہے اسے ہی دیکھنے کے لئے ایک عمر کافی نہیں ۔ پشکن کے عجائبات آرٹ تھرڈ ورلڈ کے مسافر کو ہمیشہ کے لئے تھکا دینے کو کافی ہیں ۔ روس کا آرٹ دراصل آرتھوڈاکس عیسائیت سے بہت شدید طور پر وابستہ ہے ۔ اس کا آرٹ ICON PAINTING سے نکلا ہے ۔ پہلے پہل وہاں کے آرٹسٹ حضرت مریمؑ ، حضرت عیسیٰؑ اور مذہبی روایات کو محفوظ اور قابلِ احترام بنانے کے لئے تصویریں اور بت بنایا کرتے تھے ۔ پھر جب منگول حملے شروع ہوئے اور ایشیائی لوگ یہاں رہنے بسنے لگے تو ان کے ساتھ ہی یونانی آرٹسٹ بھی آ پہنچا ۔ ملکہ

www.iqbalkalmati.blogspot.com

الزبتھ کے دورِ حکومت میں بہت سے اطالوی اور فرانسیسی آرٹسٹ یہاں کام کرتے تھے لیکن اٹھارویں اور بیسویں صدی میں یورپ کا اثر بے حد نمایاں رہا۔

رفتہ رفتہ مجھے پتہ چلا سوشلسٹ ڈائمینگز کے تحت ایک خاص قسم کا ادب اور بتوں کا رواج عام ہوا میکسم گورکی کے ساتھ جو حقیقت پسندی شروع ہوئی تھی وہ لینن کے عہد میں MONUMENTS کی شکل اختیار کر گئی۔ اس نے فرداً فرداً بھی اور گروپس کی شکل میں بھی یادگاریں تعمیر کروائیں۔

لیکن کچھ عرصہ بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ کسی ملک کا آرٹ، مصوری، بُت تراشی، یہ سنگِ میل ضرور ہیں لیکن یہ بھی تمام تر اس ملک کی نمائندگی نہیں کر سکتے۔ ہر آرٹ اپنے عہد میں محبوس ہوتا ہے اور جس طرح ایک عہد ختم ہونے کے بعد کڑی تو بن جاتا ہے لیکن زندہ نہیں رہتا۔ ایسے ہی کسی ملک کا آرٹ نشان دہی تو کرتا ہے پر ملک نہیں ہوتا ــــــ ہمارے دیس کی MINIATURE مصوری ہمیشہ زندہ رہنے والی تو ضرور تھی لیکن پاکستان نہیں تھی۔

جب تک میں سونیا سے نہیں ملا ــــــ تب تک مجھے معلوم نہ ہو سکا کہ ہر ملک اس کے لوگوں سے عبارت ہوتا ہے...... اگر وہاں کے لوگ من بھائیں تو دیس اچھا لگتا ہے۔ اس کی ہوائیں، موسم، جغرافیہ، آرٹ سب من بھاتا ہے ــــــ لوگوں سے مناسبت پیدا نہ ہو تو پھر واقفیت اخبار بن جاتی ہے ــــــ پچھلے دن کا اخبار کسی کام نہیں آتا۔

سونیا نے مجھے روس سے محبت کرنا سکھائی ــــــ ناکافی محبت۔ ناتسلی بخش محبت!

افسوس تو اس بات کا ہے کہ میں سونیا سے بھی محبت نہ کر سکا کیونکہ ہم دونوں کے درمیان ایک دیوار حائل تھی ــــــ تعلیم یافتہ لوگوں کے نظریات کی دیوار...

یہ دیوار ہر سماج سے مضبوط تھی ــــــ میں پورے تین سال روس میں رہا۔ میں کئی بار سونیا سے ملا ــــــ لیکن ان ہی نظریات کی وجہ سے ہر بار ہمیں نئے تعارف کی ضرورت محسوس ہوئی۔

اس روز ہم یونیورسٹی کے سامنے ٹین ایج ہر گھڑے تھے، سامنے نشیب میں موسکاؤ دریا سست روی کے ساتھ بہہ رہا تھا۔ مہران، گنگا، مس ازسپی یہ بڑے بڑے دریا ایسے ہی بہا کرتے ہیں جیسے انہیں اپنے کنارے بسنے والے شہروں کی کوئی ضرورت نہ ہو۔ اگست کے مہینے میں موسکاؤ ویران ہو جاتا ہے۔ نوجوان لوگ چھٹیاں منانے شہر سے باہر چلے جاتے ہیں۔ بیلے اور تھیٹر والے یورپ چلے جاتے ہیں، سکولوں کے بچے کیمپوں کو سدھار دیتے ہیں۔ سکول ٹیچر، متوسط طبقے کے افراد، دکاندار لوگ شہر سے باہر دیہاتی گھروں میں جنہیں داچا کہتے ہیں کر توڑ سردیوں کا اثر زائل کرنے کے لئے چلے جاتے ہیں۔

یونیورسٹی میں اس قدر چہل پہل نہ تھی۔ موسکاؤ کی شام تھی جس میں حیدر آباد کا دھندلکا کی شام کی اداسی، پنڈی کے رنگ، اور کراچی کی خوشبو شامل تھی ــــــ میرا دل اچانک رونے کو چاہتا تھا۔

سونیا کے جسم پر لیس کا ہلکا بلاؤز اور گہرا نیلا سکرٹ کمر پر کسا ہوا تھا۔ اس کا اجمالی اور تفصیلی تعارف بہت مرتبہ ہو چکا تھا لیکن روس جیسے بڑے ملک کی طرح جسے دیکھا تو جا سکتا ہے لیکن سمجھا نہیں جا سکتا۔ وہ بھی کئی تعارفوں کے باوجود جانی پہچانی لیکن اجنبی لڑکی تھی۔ اس کا جغرافیہ میں اچھی طرح سے جانتا تھا لیکن اس کے موسموں سے میں ناآشنا تھا۔

"ہم شاعر رائٹرز یونین میں بھی مل چکے ہیں۔" سونیا نے پتلی سی ناک سکوڑ کر پوچھا ــــــ

"ہاں ہم لیکھا ھرسنگ کے اس ریستوران میں ملے تھے جہاں ٹالسٹائی نے اپنی ہیروئن کا ہیولا بنایا تھا اور جہاں تم اپنی ایک سہیلی کے ساتھ سارا وقت پاسٹرناک اور سولزی نٹسن پر آگ برساتی رہی تھیں

"میرے سامنے ان کا نام نہ لو ____ انہوں نے گریٹ اشیا کا استحصال کیا ہے۔ فرد کی عزت بنانے کا یہ بڑا عجیب طریقہ ہے۔"

میں چپ رہنا چاہتا تھا لیکن پھر رہ نہ سکا۔

"ان کے ناول ساری دنیا میں مشہور ہیں اور حقیقت کے قریب ہیں۔"

"یہ دونوں مردہ پرست ہیں۔ ماضی کے پجاری ہیں۔ یہ تم مشرق کے لوگوں کو ماضی سے اتنا پیار کیوں ہوتا ہے۔ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ اس طرح حال تباہ ہو جاتا ہے ____ بہتر مستقبل کی کوئی گارنٹی باقی نہیں رہتی۔"

"کیا تمہیں اپنے بچپن سے، اپنے سکول سے، اپنے آبائی گھر سے پیار نہیں۔"

"ہے ____ پیار ہے لیکن بیماری کی حد تک ہم NOSTALGIA میں مبتلا نہیں ہوتے۔"

میں نے سڑک کو آہستہ آہستہ پار کیا اور سڑک کے کنارے بنی ہوئی ریلنگ تک جا پہنچا۔ وہ مجھ سے چند منٹ بعد یہاں پہنچی۔ موسکاؤ دریا میں سورج کے تمام رنگ دفن ہو رہے تھے۔ دور دور تک موسکاؤ کا شہر ایک سوئی ہوئی پینٹنگ کی طرح آویزاں تھا۔

"بھلا خوبصورت لمحات کے جادو سے آزاد ہونے کا کیا طریقہ ہے سونیا؟ ____ میں تو ماسکو یونیورسٹی کے سامنے گزارے ہوئے اس آدھ گھنٹے کو اپنے دیس لے جا کر ایسے صیقل کرتا رہوں گا کہ بالآخر یہ وقت آئینہ بن جائے گا۔ ہم لوگ گستورا مچھلی ہوتے ہیں سونیا۔ سیپی کے اندر ایک خوبصورت لمحے کے آرزومند ____ ایک قطرے پر زندگی گزارنے والے۔"

وہ ہنس دی۔

"تم مشرقی لوگوں کو اپنے جذبات پر بڑا اعتماد ہوتا ہے حالانکہ ایسا ہونا نہیں چاہیئے وقت سب کچھ بدل دیتا ہے۔"

وہ دیر تک ہنستی رہی۔ اس کی ہنسی میں کچھ ندامت، کچھ زہرخند اور تھوڑا سا تصنع شامل تھا۔

روسی لڑکی سولہ سے اکیس سال تک پدمنی، کامنی، شائستہ رو جمال جلال سب ہوتی ہے۔ اس وقفے میں اسے کوہ قاف کی پری سمجھنا آسان ہے۔ اس کے بعد چاٹی کی سفید دہی میں خمیر لگنے لگتا ہے۔ یہ چیز کی طرح پختہ ہو کر پھیلنے لگتی ہے۔ اس میں روڑی کوٹنے والے انجن کی طرح مضبوطی آجاتی ہے ____ وہ پھیلتی جاتی ہے ____ مضبوطی کے لئے ____ جگہ کے لئے۔ کپڑوں کے اندر، صوفوں کے اوپر۔ ادھر ادھر ہر جگہ۔

لیکن جوانی کے شروع میں یہ کسم کے پھولوں کی طرح زردی مائل سفید ہوتی ہے ____ زرد خوشبودار اور بے حد نازک ____ شاید اسی لئے اس عمر میں ہر روسی لڑکی گھر بسانے کی آرزومند ہوتی ہے کیونکہ اس کے بعد وقت تیزی سے ڈھلنے لگتا ہے ____ روسی لڑکی پر دوپہر کے بعد سہ پہر، شام، پہلی رات نہیں آتی بلکہ دوپہر کے بعد رات کا آخری پہرہ آجاتا ہے۔

میں نے غور سے سونیا کی طرف دیکھا ____ روس میں شاید مرد اور عورت کے حقوق برابر ہوں۔ ہو سکتا ہے وہاں ڈاکٹر انجنیئر استادوں کا جب شمار کیا جائے تو عورتیں مردوں سے زیادہ ہوں ____ لیکن مجھے نکیتا خروشیف کا قول کبھی نہیں بھولتا ____ اس نے کبھی کہا تھا:

"روس میں مردوں کے ذمہ انتظام ہے لیکن سارا کام قریباً عورتیں کرتی ہیں۔"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

صبح سویرے جب میں ایروفلوٹ سے اتر کر پہلی مرتبہ روس کی دھرتی پہ اترا تھا تو ہر طرف بیرل نما سفید موٹی روسی عورتیں بڑے بڑے جھاڑو، بالٹیوں میں گھلا ہُوا صابن، ٹاکیاں برش لئے پھر رہی تھیں۔ ان کی عمریں میری دادی کی عمر کے قریب تھیں ان کے جسم تھری ٹنر ٹرک کی طرح بھاری تھے ـــــ یہ وقت ہمارے دیس میں چارپائی توڑنے، عبادت کرنے، پوتے نواسے کھلانے اور بہو بیٹیوں پہ رعب جمانے میں گزرتا ہے۔ موٹی دادی دیگ کی دیگ سارے گھر کی لاڈلی ہوتی ہے لیکن یہاں سڑکوں پہ بھاری معمر عورتیں سروں پر سفید رومال باندھے ٹرک چلا رہی تھیں ـــ سڑکیں دھو رہی تھیں۔ سارا سارا دن میوزیم کے سامان کی نگرانی میں ایک کھڑی کرسی پہ بیٹھ کر اکڑ جاتی تھیں۔ میری ماں بھی صبح سے شام تک کام کرتی ہے لیکن صرف بچوں کے لئے ـــــ شوہر کے لئے، گھر کے لئے۔ وہ اپنا پیٹ پالنے کے لئے کچھ نہیں کرتی۔ روزی اس کی انا کا مسئلہ نہیں ہے۔

میں نے پھر سونیا کی طرف دیکھا۔ شاید آج سے تیس برس بعد جب میں واپس موسکاؤ آؤں تو سونیا تین من کی ہو چکی ہو۔ اس نے سر پہ قاقم کی ٹوپی پہن رکھی ہو اور وہ بیلچے کے ساتھ میں سڑک سے برف اٹھانے میں مصروف ہو۔ پتہ نہیں وقت آگے کی طرف بھاگ رہا تھا کہ پیچھے کی طرف ـــــ پتہ نہیں ہر لمحے کے سنگ لوح پر اپنی موت کی عبارت تھی کہ نئے لمحے کا استقبال۔

"یہ مت سمجھو سمر کہ صرف تم مشرقی ہو ـــــ مجھ میں بھی مشرقی لہو ہے۔ میری نانی کا خاندان ازبکستان سے آیا تھا۔ آدھا روس ایشیا میں ہے ـــــ"

"لیکن طاقت ور اور امیر وہی روس ہے جو سفید ہے اور یورپ سے ملتا ہے جس کا رہن سہن رسم و رواج سب مغربی ہیں ـــــ"

سونیا دل برداشتہ ہو گئی۔ وہ روس پہ کوئی بات برداشت نہیں کر سکتی تھی۔

"ہر ملک کا جنوب ہمیشہ گرم بھی ہوتا ہے اور غریب بھی۔ بھلا اس میں طعنے کی کیا بات ہے؟" سونیا نے زچ ہو کر کہا۔

"ہمارے کراچی میں آ کر دیکھو تو حیران رہ جاؤ ـــــ سارے پاکستان کی دولت وہاں جمع ہے ـــــ"

"تمہاری کیا بات ہے۔ تمہاری نظریاتی ریاست جو ہوئی ـــــ وہاں تو ہر بات الٹی ہو گی ہی۔"

سونیا مجھ پہ جیسے ایک گول کر گئی۔

ہم دونوں جب بھی ملتے تھے اس بات کے درپے رہتے تھے کہ ایک دوسرے کو زچ کریں۔ ہم ایک دوسرے کو نظریاتی شکست دینے کے اس قدر درپے رہتے تھے کہ ہمیں بھول جاتا تھا کہ ہم دونوں کو قدرت نے آپس میں محبت کرنے کیلئے بنایا ہے۔

مرد اور عورت کی محبت میں ازل سے رکاوٹیں آتی رہی ہیں۔ یہ رکاوٹیں دراصل وہ پتھر ہوتی ہیں جو پہاڑی نالوں کی رفتار بڑھا دیتی ہیں۔ کبھی ماں باپ کبھی سماج، کبھی مذہب کبھی رسم و رواج، قبیلے کی روک تھام ان کے راستے میں چیک پوسٹ بن جاتا ہے۔ لیکن جب فرد عورت ایک دوسرے کی محبت میں مبتلا ہوتے ہیں تو اصل میں ان کا مذہب سماج قبیلہ رسم و رواج ایک ہو جاتے ہیں جیسے سیٹ تھیوری کے مطابق ایک شامیانے تلے لگا ہوا سارا سامان ایک ہی بریکٹوں میں بند ہو جاتا ہے ـــــ لیکن بیسویں صدی میں ایک ایسی چیز ایجاد ہو چکی ہے جو مرد اور عورت کی باہمی کشش کے باوجود ایک نہیں ہوتی ـــــ یہ نظریات ہیں۔ مرد اور عورت ایک دوسرے میں مکمل طور پر ضم ہونے کے باوجود اپنے اپنے نظریات سے محبت کئے جاتے ہیں۔ اور ان نظریات کی وجہ سے ایک دوسرے کو مکمل طور پر قبول نہیں کرتے۔

جب بھی میں سونیا سے ملا وارفتگی سے ملا۔ لیکن پھر اچانک بریکیں لگ گئیں

اگر ہم دونوں کو اپنے اپنے ملک سے ذرا کم محبت ہوتی۔ اگر وہ روس کی کمیونسٹ پارٹی کے آدرش کی پجارن نہ ہوتی اور میں دنیا کے نقشے پر ابھرنے والی ایک نئی ریاست کا عاشق نہ ہوتا تو شاید ہم ایک دوسرے کو جھٹ جپھا ڈال لیتے اور اظہارِ محبت کو اس قدر گھولے میں نہ ڈالتے لیکن بدقسمتی سے جب بھی کسی سے محبت کرنی ہو باقی تمام محبتیں دل سے نکالنا پڑتی ہیں اور فی الحال ہم دونوں وطن پرست تھے۔

اس شام پتہ نہیں کیوں ہم موسکاؤ یونیورسٹی کے سامنے ایک بار پھر اجنبی بن گئے۔

"مجھے تمہارا نام بھول گیا ہے ——" سونیا نے مجھ سے قصاص لینے کے انداز میں کہا۔

"عثمان سمرو —— پاکستان میں ایک صوبہ سندھ ہے۔ اس میں مہران دریا بہتا ہے جیسے تمہارے دیس میں والگا نیوا ماسکاؤ میں بہتا ہے۔ یہیں حیدرآباد شہر آباد ہے اور اس میں ہمارا خاندان رہتا ہے۔ بہت پرانا کئی صدیوں تک —— ہمارے خاندان کے ہاتھ میں سندھ کا اقتدار رہا ہے ——"

"سمرو آسان ہے۔" سونیا نے آہستہ سے کہا۔

"پچھلی مرتبہ جب تم مجھے ملی تھیں تب تم نے کہا تھا کہ عثمان یاد رکھنا آسان ہے۔"

"پتہ نہیں فارن نام مجھے یاد نہیں رہتے۔"

"میرا خیال ہے انہیں یاد رکھنے کی کوئی ایسی خاص وجہ بھی نہیں ہے۔"

ہم دونوں غالباً دنیا کی خوبصورت ترین یونیورسٹی کے سامنے کھڑے تھے۔ وہ میرے اس قدر قریب تھی کہ میں اسے بُکل میں چھپا کر راون کی طرح کسی جزیرے کی طرف رواں ہو سکتا تھا۔ میں اعتراف کرنا چاہتا تھا کہ سورج کی ترچھی کرنیں اس کی براؤن آنکھوں میں آگ سی لگا رہی تھیں۔ میرا قد سونیا سے فٹ بھر اونچا تھا لیکن پتہ نہیں اس محبت کے

اعتراف میں مجھے اپنے ملک کی ذلت نظر آئی۔ مجھے لگا —— وہ دل میں کہے گی۔ دیکھا! یہ ہوتی ہیں سپر پاورز —— یہ ہوتے ہیں سفید فام لوگ —— تم تیسری دنیا کے لوگ ایڈ کے بغیر زندہ رہ ہی نہیں سکتے۔ چاہے یہ دان دکشنا معاشی ہو یا جذباتی، تم لوگ ہمارے بغیر لحظہ بھر کو کھڑے ہو ہی نہیں سکتے، تمہیں جتنی غف لگتی ہے ہمارے وجود سے لگتی ہے۔

موسکاؤ دریا کا رنگ اب مٹیالا ہو گیا تھا۔ یونیورسٹی کی عمارت کی بتیاں جلنے لگی تھیں اور اچانک سیں سیں کرتی ٹھنڈی ہوا دریا کی طرف سے اوپر کو آنے لگی تھی۔

"پچھلی چھٹیوں میں تم کہاں گئے تھے؟"

"یورپ ——"

"اور اس سے پچھلی چھٹیوں میں۔"

"حیدرآباد۔ میری ماں بیمار تھی ——"

"اور واپس کب چلے جاؤ گے؟"

"اس ماہ کے بعد ——"

"اور روس کب دیکھو گے؟"

"شاید ہم طالب علم کبھی بھی روس نہیں دیکھ سکتے —— ہمیں صرف پراوا پڑھنے کو ملتا ہے —— تمہاری سوویت زندگی پر IDEOLOGY چھائی ہوئی ہے۔ ہماری طرح تم لوگ GLORY TO LABOUR کمیونسٹ پارٹی زندہ باد کے نعرے لگانے کے بعد بھی نارمل زندگیاں بسر کرتے ہو لیکن ہم اس فلٹر کے پیچھے نہیں دیکھ سکتے۔ ہم ریڈیو، ٹیلی ویژن، سرکس میں بھی اگر روس کو دیکھنا چاہیں تو بھی ہم خبر سے زیادہ کچھ نہیں جان سکتے اور روس خبروں کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے ——"

"میں تمہیں روس دکھاؤں گی —— میں ٹورسٹ گائیڈ رہی ہوں کافی دیر۔"

"روس دیکھ کر کیا کریں گے سونیا۔ جیسا ایک دیس ویسا دوسرا دیس ـــــ اب تمہارے اتنے بڑے ملک میں تین سال رہنے کے بعد میں ایک نتیجے پہ پہنچ گیا ہوں"۔

"یعنی؟ ـــــ"

"ابھی انسان نے انسان کے ساتھ رہنا نہیں سیکھا ـــــ ابھی انسان کو وہ چابی نہیں ملی جو خوشی کے تالے میں اپنی مرضی سے فٹ ہوتی ہے ـــــ اور ابھی ـــــ انسان کا کسی ایسی طاقت کے بغیر گزارہ نہیں ہوتا جو اس کی تمام مشکلات کے وقت اس کے دل پہ پھایا رکھ سکے ـــــ دولت بانٹ لو، تمام ذرائع سانجھے کر لو، کچھ فرق نہیں پڑتا"۔

"نہیں سمرد۔ روس اور باقی ملک ایک سے نہیں ہیں ـــــ یہ ملک عام آدمی کا ملک ہے۔ نادار مفلس آدمی کا ملک ـــــ باقی ملک امیر آدمیوں کے ملک ہوتے ہیں ـــــ"

"پھر بتاؤ سونیا کیا یہاں عام آدمی خوش ہے ـــــ کیا کمیونزم انسانی دکھوں کا علاج ہے ـــــ واحد علاج؟"

اس نے نچلے ہونٹ کو دانتوں سے دبایا اور پھر آہستہ سے بولی:

"ہاں ـــــ"

"کیسے کیسے؟ ـــــ" میں نے گرج کر کہا ـــــ "ابھی پرسوں میں سینٹ نکولس کے گرجا گھر گیا تھا ـــــ شام کا وقت تھا۔ گرجے کے اندر ایک جنازہ پڑا تھا اور ایک بوڑھی عورت ہاتھ میں موم بتی لئے اپنے کفنائے ہوئے بیٹے کے لئے رو رہی تھی ـــــ وہ اسی طرح غم کے آگے نہتی تھی جیسے ہم تھرڈ ورلڈ کے آدمی ہوتے ہیں اس کے آنسوؤں میں وہی دکھ تھا جو کسی سرمایہ دار ملک کی عورت کے آنسوؤں میں ہوتا ہے۔ بتاؤ یہ خوشی ہے ـــــ یہ علاج ہے انسانی دکھوں کا؟ ـــــ"

سونیا نے اپنے غصے کو دباتے ہوئے کہا:

"تم سیاح لوگ روس محض یہ دیکھنے آتے ہو ـــــ کہ ہم لوگ کس حد تک ناکام ہوئے ہیں۔ تم لوگ مسجدوں میں، گرجوں میں ـــــ صرف یہ دیکھنے جاتے ہو کہ روس ابھی تک کتنا مجبور ہے اور مجبوری کے وقت کسے پکارتا ہے ـــــ تم لوگ یہ دیکھنے نہیں آتے کہ روس نے کس قدر فاصلہ طے کر لیا ہے انسانی حرماں نصیبی کا ـــــ بیوقوف آدمی ـــــ جنگلی شخص! ہم انسان کے ظلم، انسان کی درندگی کے خلاف لڑ رہے ہیں۔ خدا کے دیئے ہوئے غموں کے خلاف بغاوت نہیں کر رہے ـــــ ہماری کوشش ہے کہ انسان انسان کو دکھ نہ دے ـــــ سب برابر ٹھہریں"۔

"مساوات ہمارے مذہب کی بھی اساس ہے"۔

"ہاں ہے ـــــ لیکن اعتراف تک ـــــ ہم لوگ اسے پریکٹس کرتے ہیں۔ تم لوگ اسے نعرے کے طور پر استعمال کرتے ہو ـــــ بس اتنا فرق ہے"۔

میں پسپائی کے عمل میں تھا اور میری مردانگی اس پسپائی کو قبول نہ کر رہی تھی اسلئے میں نے جو بھی اعتراضات مجھے کمیونزم پر معلوم تھے ایک ہی سانس میں کر ڈالے۔

سونیا پہلے مجھے تعجب سے دیکھتی رہی پھر یکدم ہنس دی:

"تم ـــــ تم سمرد روگوزن ہو ـــــ روگوزن ـــــ"

اس وقت تک میں نے دوستوفسکی کی ایڈیٹ نہیں پڑھی تھی۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ روگوزن کیسا طوفانی کردار تھا جو اپنی شکست کو آسانی سے قبول نہیں کرتا ـــــ اس وقت وہ مجھے روگوزن پکار کر جانے کیا کچھ کہہ رہی تھی۔ میں قزاق، الیٹرا، پاگل ..... جانے کیا کچھ تھا۔

"تم تھرڈ ورلڈ کے آدمیوں کو تو ہم سے ہمدردی ہونی چاہیئے۔ تم لوگ الٹا ہم ہی سے لڑتے ہو ـــــ بابا ہم ان مصیبتوں سے نہیں لڑتے جو خدا ہم پہ نازل کرتا ہے ـــــ موت

www.iqbalkalmati.blogspot.com

حادثات ـــ بدصورتی ـــ پیدائشی جسمانی محرومی ـــ بلکہ کمیونزم ان لعنتوں سے چھٹکارا دلاتا ہے جو انسان انسان پہ ٹھونستا ہے مثلاً غریبی ـــ بے روزگاری ـــ مواقع کی کمیابی ـــ کمیونزم نے خوشی کا ٹھیکہ نہیں لے رکھا سدگوزن ـــ بلکہ انسان کو یہ احساس دلایا ہے کہ سب گوشت پوست کے بنے ہوئے ہیں جب کسی کو کھانے کو نہ ملے تو وہ بلبلاتا ہے۔ منہ پر تھوکو تو اسے ذلت کا سامنا کرنا پڑتا ہے"

"اخوت کا سبق چودہ سو سال پرانا ہے ـــ کچھ نیا نہیں ہے ـــ احمق لڑکی"

وہ اب بالکل چڑ گئی۔

"بتاؤ بتاؤ تمہارا چودہ سو سال پرانا سبق کہاں لاگو ہوا ہے ـــ کس ملک میں؟ ایران ـــ افغانستان ـــ سعودی عرب ـــ پاکستان ـــ ؟ ـــ بتاؤ ـــ"

اب ہم دونوں ایک دوسرے کو ایسے دیکھ رہے تھے جیسے دو ننگی تلواریں آپس میں آمنے سامنے ہوں۔ میں آپکو بتا چکا ہوں کہ اگر مجھے اپنے وطن اپنے مذہب سے کچھ کم محبت ہوتی یا سونیا تمامتر اپنے دیس اپنے ملک کی دیوانی نہ ہوتی تو ہمیں ایکدوسرے کا وجود نظر آجاتا۔ کبھی کبھی کوئی مشن کوئی آدرش کوئی تخلیقی آہنج انسان کو انسان کے قریب آنے سے معذور رکھتی ہے۔ مذہبی حدبندی، نسلی حدود، زبان کا اختلاف دیس کی سرحدیں کٹی ناگزیر یہ حالات محبت کے راستے کا اندھا شیشہ ہیں۔ یہ حالات، فرق، اونچ نیچ ہمیشہ سے مختلف روپ دھارتی رہی ہے لیکن پہلے انسان جس حد تک دوسروں کی محبت کا محتاج تھا اب نہیں رہا۔ اب وہ انسان کی جگہ اشیاء اور نظریوں کا زیادہ محتاج ہو گیا ہے۔ پہلے رکاوٹیں بیرونی ہوا کرتی تھیں۔ اب خندقیں، فصیلیں خود ساختہ ہوتے ہیں۔ اسی لئے زیادہ ناقابلِ فہم اور دقیق ہوتے ہیں اور آدمی کتے کی طرح اپنی ہی دم کے تعاقب میں چکر کاٹتا رہتا ہے اور کبھی سرے تک نہیں پہنچتا۔ میں اور سونیا بھی ایک دوسرے کی ہمدردی، محبت، دوستی کے حاجتی تھے لیکن ہم دونوں اپنے اپنے گرد لگی ہوئی سرکنڈوں کی باڑ ٹھیک کرتے رہے اور ایک لمحے کے لئے بھی ہمیں خیال نہ آیا کہ اس باڑ کے باوجود ہم اوپر سے ہاتھ تو ملا سکتے ہیں۔ یہ مصنوعی فاصلے اس طرح تو پاٹ سکتے ہیں۔

"میں چلتی ہوں سمرد ـــ"

"تھوڑی دیر اور ٹھہر جاؤ"

"نہیں سمرد۔ آج مجھے نتاشیا کو فلم دکھانے لے جانا ہے ـــ"

"کونسی فلم؟ ـــ"

"محبت کے غلام ـــ میخالکوف نے اسے بنایا ہے ـــ"

"روس میں ایسے نام کی فلم پر تعجب ہوتا ہے ـــ مجھے تو لگتا ہے کہ تمہارے دیس میں یہ دیوانگی نہیں ہوتی ـــ"

"کیوں۔ ہم انسان نہیں۔ ہماری جبلتیں نہیں ـــ ہم محبتیں نہیں کر سکتے"

اس نے غصے سے کہا۔

"ہیں ہاہا ہیں جبلتیں ـــ تم سب سُپرمین ہو۔ دنیا بھی چلا لیتے ہو اور خوش بھی رہ لیتے ہو۔ اس کی کہانی کیا ہے محبت کے غلام کی ـــ"

"ایک چھوٹا سا معصوم گروپ کوشش کرتا ہے کہ وہ انقلاب میں نہ پھنس جائے"

"بس بس۔ میں تو سمجھا تھا کہ کوئی واقعی محبت کی کہانی ہوگی ـــ"

"ہمارے لٹریچر کو تم مات نہیں کر سکتے سمرد ـــ تم کو ایسا ہی محبت کی کہانیوں کا شوق ہے تو اینا کرینینا پڑھو ـــ وار اینڈ پیس پڑھو ـــ"

ہم دونوں شہر کی جانب جانے والی سڑک پر چلنے لگے۔ پتہ نہیں کیوں میں نے آہستہ سے کہا:

"میرے وطن چلو سونیا ـــ وہاں عورتیں سڑکیں نہیں دھوتیں ـــ حیدر آباد

www.iqbalkalmati.blogspot.com

میں ہماری کوٹھی میں ان گنت ملازم ہیں۔ ایک خانساماں۔ دو نوکرانیاں ـــــ مالی ـــــ جمعدار ـــــ تمہیں آرام ہی آرام ملے گا۔"

وہ رک گئی اور چہرہ پھرا کر بولی:

"میں سبزی نہیں ہوں جو میری نلائی کے لئے، پانی دینے کے لئے دوسرے مقرر ہوں۔ تم ساؤتھ ایسٹ ایشیا کے لوگوں کو آرام سے اتنی محبت کیوں ہے ـــــ کیا تمہیں یہ انسان کی ذلت نہیں لگتی کہ ایک آدمی کے آرام کے لئے دوسرے آدمی اس کے خدمت گزار بن جائیں۔ میں تو ایسے آرام میں ایک گھنٹہ بھی خوش نہیں رہ سکتی۔"

میں نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر کہا ـــــ "اگر تمہیں سڑکیں دھونی پڑیں ہوٹلوں کے فرش چمکانے پڑیں۔ ٹرک چلانے پڑیں تو ـــــ تو سونیا؟ ـــــ"

"تو کیا۔ میں روس کی سڑکیں صاف کروں گی۔ اپنے روس کی ـــــ یہ کچھ کم اعزاز نہیں میرے لئے۔"

"تم جیسی شکل و صورت کی لڑکی تو مہارانی بن کر رہ سکتی ہے اپنے سندھ میں" ـــــ پھر میں نے مذاق کے ساتھ کہا ـــــ "میرے ساتھ چلو۔ جب تک میں کام کروں گا تمہیں کچھ نہیں کرنا پڑے گا۔ تمہاری جگہ کھانا بھی میں پکا لیا کروں گا۔"

وہ بہت سنجیدہ ہو گئی تھی:

"کیوں؟ کیا میں لولی لنگڑی ہوں۔ اپاہج ہوں ـــــ میں کسی کی دی ہوئی روٹی کیوں کھاؤں؟ ـــــ میں عورت ہوں ہاتھ پاؤں والی ـــــ"

"تمہاری مرضی ـــــ آفر اچھی تھی ـــــ"

"شکریہ۔ ٹرمز اچھی نہیں تھیں ـــــ"

ہم دونوں ہنس دیئے۔ محبت کرنے کا وقت آیا اور چلا گیا۔ وہ بس پہ سوار ہو گئی اور میں یونیورسٹی کی طرف لوٹ گیا۔

سونیا سے میری کئی ملاقاتیں ہو چکی تھیں۔ کئی بار باہمی دوستوں نے ہمارا تعارف کروایا تھا لیکن سب سے پہلی بار وہ مجھے پینوراما میں ملی تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے مجھے روس آئے زیادہ عرصہ نہ ہوا تھا۔ میں کسی دوست کی شدید آرزو رکھتا تھا۔ زبان کی اڑچنیں گونگے پن کا احساس دلاتی تھیں۔ اس وقت میں ریڈ سکوئر، لینن کی قبر، پشکن میوزیم، ٹیلی وژن ٹاور، بولشویک تھیٹر اور دوسری تاریخی عمارتیں دیکھنے میں مشغول تھا۔ روس کا فوٹو سٹیٹ ذہن میں تیار کرنا میرے لئے بڑا مشکل کام تھا۔ روسی مزاج، رسم و رواج، بدحواسیاں، تضادات، رہن سہن کی اڑچنیں، آپس کی مشکلات کا مجھے علم نہ تھا۔ ابھی تو میں ایک گریٹ ملک، گریٹ قوم، ایک گریٹ آدرش کے سامنے کھڑا تھا۔ جیسے کوئی بونا ٹیلی وژن کے ٹاور کو دیکھ رہا ہو۔

اس روز میں اپنی پاکٹ بک میں لکھی ہوئی روسی اور ماسکو کے نقشے کے سہارے پینوراما پہنچا جو ٹرائمف گیٹ کے قریب ہے اور اس تاریخی واقعے کی خوشی میں تعمیر کیا گیا ہے کہ روس نے نپولین کو پسپا کر کے بھاگنے پر مجبور کر دیا تھا۔

شاید یہ میرا وہم ہو یا اندازے کی کمی ہو لیکن روسی خاص کر سفید روسی اپنے لئے نپولین کی شکست کو اپنی تاریخ کا ایک بہت بڑا سنگِ میل سمجھتے ہیں۔ وہ نپولین کی شکست کو اپنی قومی ٹوپی میں سرخ پر کی طرح سجائے رکھتے ہیں لیکن پتہ نہیں وہ کون سا عمل ہے ـــــ وہ کونسا طریقِ کار ہے جس کے زیرِ اثر ہمیشہ سے فاتح مفتوح کو پیروں میں روندنے کے بعد اسی مفتوح کا اسیر ہو جاتا ہے ـــــ اکبرِ اعظم کے محل میں جودھا بائی ـــــ محمود غزنوی کے دربار میں ہندی کاریگر ـــــ سکندر کے ہمراہ ہندوستان کے ستارہ شناس طبیب ـــــ مسلمانوں میں ذات پات کی تمیز اسی عمل سے وجود میں آئی۔

مجھے محسوس ہوا ـــــ روسی فرانس سے بیک وقت نفرت اور محبت کے رشتے میں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مبتلا ہیں۔ ان کی آرٹ گیلریوں میں عموماً وہی تصویریں قابلِ ذکر ہیں جو فرانس سے آئی ہیں یا اُس کے سکولز آف تھاٹ کے مطابق بنی ہیں۔ ان کے ہاں آرٹ، جمال، فیشن، لباس کا اندر ہی اندر کہیں وہ پیمانہ چھپا ہے جو فرانس کا ہے جیسے حضرت یوسفؑ نے اپنا پیمانہ بھائیوں کے غلے میں چھپا دیا تھا۔ ایسے ہی نپولین برفوں میں دھنستا شکست خوردہ اور تہی داماں جاتے ہوئے اپنے فرانس کی میٹر روڈ یہیں کہیں برف میں چھپا گیا تھا۔ اب کلچر کی دنیا میں جو کچھ بھی روسی کرتے ہیں بظاہر روسی انا کے اعتبار سے اس میں خودرائی ہوتی ہے لیکن یوں لگتا ہے جیسے اندر ہی اندر وہ نپولین کے میٹر سے ناپتے ہیں اور اسی کے پیمانے سے تولتے ہیں ___ کسی کو شکست دینے کی اتنی قیمت تو ہمیشہ ادا کرنی ہی پڑتی ہے ___ بالآخر فاتح کو مفتوح کا رنگ ہی اختیار کرنا ہوتا ہے۔

ان دنوں سونیا پینوراما میں گائیڈ تھی۔ جس وقت میں اوپر پہنچا وہ ہاتھ میں ایک لمبی چھڑی لئے روسی لب ولہجے میں ساری تصویروں کے متعلق انگریزی میں معلومات امریکی سیاحوں کو سنا رہی تھی۔ پینوراما دراصل ایک تصویر ہے جو گول بڑی دیوار پر چسپاں ہے۔ اس پر کچھ ایسی چابکدستی سے روشنی کی گئی ہے کہ سرکاراما کی طرح اس میں تین سمتی پن موجود ہو گیا ہے۔ ہر چیز اپنے پرسپیکٹو میں جیتی جاگتی اور اصلی محسوس ہوتی ہے۔ تمام سیاح اس تصویر کو اتنی توجہ اور تحیر سے دیکھتے ہیں جیسے روبکاری کیلئے آئے ہوں۔

سونیا نیلے سکرٹ اور سفید بلاؤز میں ملبوس سر پہ سفید رومال باندھے ذرا سی گنگنی آواز میں کہہ رہی تھی:

"یہ تصویر جو اس وقت آپ دیکھ رہے ہیں ۱۸۱۲ء میں نپولین کی شکست کا منظر پیش کرتی ہے۔ تصویر بورنو چیف گاؤں کی ہے۔ اس مقدس سرزمین سے جب نپولین کو بھگایا گیا تو اس کی حالت ایسی تھی کہ وہ گھوڑے پر بھی نہ چڑھ سکتا تھا اور اپنی ٹوپی

چہرے پر یوں کھینچ کر مسکاؤ سے روانہ ہوا تھا کہ اس کی آنکھوں کے آنسو کوئی نہ دیکھ سکے"

میں بار بار تصویر اور سونیا کو دیکھتا رہا ___ پتہ نہیں کیوں میری آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔

تصویر میں واقعی غیر معمولی جان تھی۔ جہاں الاؤ روشن تھا وہاں سے سینک آتا محسوس ہوتا تھا۔ گھوڑے کے پسینے سے حدت کا احساس ہوتا تھا۔ گھروں سے جو دھواں اٹھ رہا تھا اس کے ختم ہو جانے کا امکان تھا۔ تصویر زندگی کی طرح ایک لمحے کی گرفت میں آئی ہوئی تھی۔ میں نے اپنے ساتھ کھڑی ہوئی ایک بڑھیا سے سوال کیا:

"یہ تصویر کس نے بنائی ہے؟"

میرا خیال تھا وہ روسی عورت ہے لیکن اس امریکی عورت نے آنکھ مار کر جواب دیا:

"ایک فرانسیسی نے اور کس نے؟ ___ بھلا ایسی پینٹنگ کوئی روسی بنا سکتا ہے؟ ___"

مجھے جواب دیتے ہی وہ پیٹھ موڑ کر چلی گئی۔

تصویر سے میں نے سونیا کی طرف نگاہ کی۔

لحظہ بھر کے لئے مجھے شبہ ہوا کہ چھڑی کے ساتھ تصویر دکھانے والی بھی کہیں دھوکا ہی نہ ہو ___ کہیں وہ بھی تصویر ہی کا حصہ نہ ہو اور روسی سائنسدانوں کا کرشمہ نہ ہو۔ وہ بھی تصویر کی طرح بے عیب تھی۔ وہ بھی تصویر کی طرح ایک چھپے ہوئے حزن کا سراغ دیتی تھی۔ پتہ نہیں کیوں مجھے لگا ___ سونیا اور تصویر دونوں فرانس کی امپورٹ کی ہوئی ہیں۔ وہ بہت نازک، خوبصورت اور خوشبودار نظر آتی تھی ___ بغیر فل سٹاپ کا ماڈلے وہ رٹا ہوا لکھان دہرائے جا رہی تھی۔ سامنے قطار میں کھڑے سیاح تمام اس کی طرف تصویر کی جانب ٹکٹکی باندھے یوں کھڑے تھے جیسے داروغہ گھاٹ کے روبرو کھڑے ہوں۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پھر مجھے لگا۔۔۔۔ وہ بھی میری طرح گائیڈ کے فرائض ہی ادا نہیں کر رہی بلکہ اندر ہی اندر اور پڑتے لگا رہی ہے۔ وہ سوچ رہی ہے ابھی میٹھا چیز بھی خریدنا ہے ـــ واڈکا کی بوتل کیلئے پتہ نہیں پیسے بچ بھی سکیں گے کہ نہیں ـــ شاید میں کچھ حصہ چل کر جاؤں تو کچھ پیسے بچ جائیں۔ یہ ردبل اتنی جلدی کیوں ختم ہو جاتے ہیں؟ وہ بھی میری طرح اندر ہی اندر اپنی اکونومکس درست کر رہی تھی۔

یہ سونیا سے میری پہلی ملاقات تھی

وہ پینوراما میں پرانی گائیڈ تھی اور میں یونیورسٹی میں نیا طالب علم ـــ لیکن اس دن کی ملاقات کچھ مسلسل نہ ہو سکی۔ ہم کچھ دیر کے لئے ملے ـــ بس شاپ تک پہنچے ٹریم میں بیٹھے اور اپنی اپنی منزل کو روانہ ہو گئے۔ میرے لئے پینوراما کی تصویر کے سامنے کھڑی ہوئی سونیا اس تصویر کا حصہ بن گئی۔

ملاقاتوں کا بھی عجیب گراف ہے۔ کچھ لوگوں سے روز روز ملاقات ہوتی ہے اور ان کا کچھ اثر طبیعت پر مرتب نہیں ہوتا ـــ کچھ لوگ اتفاقاً ملتے ہیں۔ بجلی کی سی تیزی سے روانہ ہو جاتے ہیں۔ چند نظریں، کچھ جملے، ایک آدھ لمس کے کاربن پیپر مل جاتے ہیں جن پر آپ لکھ لکھ کر کئی عبارتیں، کئی تصویریں کئی شکلیں بناتے رہتے ہیں۔ مجھے روس سے متعارف کرانے والی ـــ روس کے قریب لانے والی سونیا تھی۔ اس سے پہلے میں حیدر آباد لوٹ جانے کی سوچ رہا تھا۔ سونیا کو دیکھنے کے بعد مجھے روس اپنی ہی خالہ کا گھر نظر آنے لگا۔

دراصل ہر شخص اپنے ملک کا فسٹ سیکرٹری ہوتا ہے۔ اس کے وجود کے ساتھ ایک ساری ایجنسی کام کر رہی ہوتی ہے۔ دوسرے ممالک کے لوگ جس تناسب سے اس سے متاثر ہوتے ہیں اسی لحاظ سے وہ اس کے ملک سے رعایت برتنے اور اسے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ امریکہ وہی ہے جو امریکیوں نے اسے دکھایا ـــ

انگلستان وہی کچھ ہے جو انگریزوں نے اسے ظاہر کیا ـــ میری بھی شدید آرزو تھی کہ سونیا میری وجہ سے پاکستان کو دنیا کا سب سے خوبصورت ملک سمجھنے لگے

کچھ دنوں بعد وہ مجھے مائی کوسکی چوک کے قریب کارڈ خریدتے ہوئے مل گئی میرے ہاتھ میں گمنام سپاہی کی قبر کا کارڈ تھا جسے میں اپنے صوبیدار چاچا کے لئے منتخب کر رہا تھا ـــ ہم دونوں نے اپنے اپنے کارڈ خریدے۔ سونیا نے میرا حساب لگا کر مجھے روبلز بتائے اور ہم دونوں قریبی کھوکھے سے آئسکریم کھانے چلے گئے۔ آئسکریم کھانے کے بعد اس نے اپنے ساتھ کوپک ادا کئے اور میں نے اپنی آئسکریم کی قیمت ادا کی ـــ ہم دونوں سڑک کنارے بنچ پر بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ پھر میں نے اس سے اس کا پتہ پوچھا۔ وہ مسکرا دی۔ آسمان پہ بادل چھائے ہوئے تھے لیکن اچانک سورج نکل آیا۔

"کیا کرو گے میرا پتہ پوچھ کر ـــ"

"کبھی کسی روز تمہارے گھر آؤں گا۔"

"ایسے ہی ٹھیک ہے ہمرد ـــ یہاں وہاں کسی وقت بغیر تعین کے"۔

"کیوں؟"

"تم یہاں اجنبی ہو ـــ تم یہاں کے رسم و رواج نہیں جانتے ـــ بس ایسے ہی ٹھیک ہے ـــ اتنا ہی کافی ہے"۔

وہ مسکراتی ہوئی روانہ ہو گئی ـــ ایسی لڑکی کا کوئی کیا کرتا جس کا ٹھکانہ ہی معلوم نہ ہو۔

یونیورسٹی میں مجھے بہت لڑکیاں ملیں۔ بہت سے روسی لڑکے دوست بن گئے یہ لوگ سادہ دل اور محنتی تھے۔ انہیں اپنے ملک سے بڑا شدید پیار تھا۔ جیسے کسی نومسلم کو اپنے مذہب سے ہوتا ہے ـــ لیکن روسی کی محبت اپنے ملک اور آدرش

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سے اس لئے بھی کچھ زیادہ نظر آتی ہے کہ وہ ہر وقت امریکیوں کے ساتھ مقابلہ کرتے نظر آتے ہیں۔ وہ ہر کام اس لئے بھی اچھا کرتے ہیں کہ انہیں روسی ہونے پر فخر ہے اور انہیں ہر کام میں اس لئے بھی سر دھڑ کی بازی لگانا ہوتی ہے کہ انہیں امریکیوں پر ثابت کرنا ہے کہ وہ امریکیوں سے بہتر جانتے ہیں۔ اس دوہری کشاکش میں وہ ہر لحظہ پروپیگنڈہ کرتے نظر آتے ہیں۔ وہ ہر غیر ملکی کے سامنے اپنا اور امریکہ کا معاملہ رکھ کر یہ چاہتے ہیں کہ ووٹ ان کے حق میں دیا جائے ـــــ وہاں کے سادہ لوح شہریوں سے مل کر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ امریکہ اور روس نے سپر پاور بن کر اپنے عام شہریوں پر بہت بڑا ظلم کر رکھا ہے۔ اب ملائیشیا، کمبوڈیا، روڈیشیا، پاکستان ـــــ چھوٹے چھوٹے جزیروں میں، انجانی ائیرپورٹوں پر روسی اور امریکن یہ معلوم کرتے پھرتے ہیں کہ یہ پاکستانی ـــــ یہ سوئی یہ جاپانی ـــــ یہ فرانسیسی کس کو زیادہ ترجیح دیتے ہیں۔ امریکہ کو کہ روس کو ـــــ گویا حب جاہ کی آرزو میں یہ بڑے ملک چھوٹی چھوٹی ریاستوں، چھوٹے چھوٹے ملکوں کے سامنے کاسہ بردار ہیں۔ اتنے بڑے اتنے سپر سپر ہونے کے باوجود ان کو رائے چھوٹے ملکوں سے لینا پڑتی ہے کیونکہ آپس میں تو وہ طے نہیں کر پاتے کہ ان دونوں میں سے کون بڑا ہے؟ نہ ہی وہ یکبارگی اپنے حریف کو ختم کر کے کسی فیصلے پر پہنچ سکتے ہیں۔

یونیورسٹی میں، بازاروں میں، سرکس گھر اور بیلے تھیٹروں میں جیسے بس کاسٹنگ ووٹ تھا ـــــ تمام تر معمولی اور چھوٹے پن کے باوجود وہاں کے شہری یہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ میں روس سے کس حد تک اور کتنا کچھ متعارف ہو چکا ہوں ـــــ کیا یہ تعارف مثبت ہے کہ منفی؟

لیکن کسی شخص، شہر یا ملک کا اصلی تعارف ہمیشہ اچانک ہوتا ہے۔

مجھے روس میں رہتے ہوئے پورا سال ہو چکا تھا لیکن ابھی میں اصلی روس سے

متعارف نہ ہوا تھا۔ انسانوں کی طرح ملکوں کی بھی ایک روح، سائیکی ہوتی ہے۔ اسکا تعارف مشکل سے اور ہمیشہ اچانک ہوتا ہے۔ میں چند دن کے لئے لینن گراڈ کی سیر کے لئے گیا تھا۔

لینن گراڈ بادلوں کا شہر ہے۔ سمندر کنارے کا شہر ہے۔ دریا نیوا کا شہر ہے۔ اس میں گھر، باغ، سڑکیں، محل، ریستوران، سمندر کا ساحل، کشتیاں، لاؤنج، کاریں، جہاز، میوزیم، اتنا سارا کچھ ساتھ ساتھ ہے اور الگ الگ نظر آتا ہے۔ دریا نیوا کنارے وہ محل ہے جس میں راسپوٹین کو گولیوں سے داغا گیا تھا۔ پیٹر دی گریٹ کا خوبصورت موسم سرما کا محل ہے اور لینن گراڈ سے نکل کر ایک بہت بڑا موسم گرما کا محل ہے جس کے ان گنت کمرے اب بھی بند ہیں اور جس کے سامنے خوب صورت قد آدم گھوڑے، فرشتے، شہزادے بتوں کی شکل میں ایستادہ ہیں۔ ان بتوں پر جیسے سونے کا پانی چڑھا ہے اور فوارے ان سے پھوٹتے ہیں۔ یہ پیٹر دی گریٹ کا شہر ہے جسے اب لینن گراڈ کہتے ہیں۔ یہ بہت خوبصورت ہے اور چونکہ بہت شمال میں واقع ہے اس لئے یہاں رات کو گیارہ بجے ابھی دن ہوتا ہے۔ یہاں بھی رات کو اپنے کمرے کے دبیز پردے بند کر کے رات کر لیتے ہیں اور اپنی رات بنا کر سو جاتے ہیں حالانکہ باہر دن چڑھا ہوتا ہے۔

لینن گراڈ پر عموماً بادل گھرے ہوتے ہیں جیسے کوئی خوبصورت لڑکی کسی ایسے مرد کے متعلق سوچتی رہتی ہو جو اس کا ہونے سے پہلے ہی مر گیا ـــــ غالباً سارے روس میں یہ اکلوتا شہر ایک نیک دل ترقی پسند بادشاہ کا بسایا ہوا لگتا ہے ـــــ پیٹر دی گریٹ رات کو لباس تبدیل کر کے ہارون الرشید کی طرح روند کو نکلتا ہو ـــــ اسے خبر ہو وہاں گلی میں ایک بڑھیا رہتی ہے۔ سمندر کنارے وہ ملاح جال بنتا ہے جس کے پاس سمندر میں جانے کے لئے کشتی نہیں ـــــ سارا شہر ماڈرن ہے ساحل کنارے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کبنی پہنے زرد کمروں والی روسی لڑکیاں گھومتی ہیں۔ موٹر سائیکل پر جینز میں ملبوس بھوری مونچھوں والے نوجوان لگے پھرتے ہیں جن کے پاس کھڑے ہوں تو آپ کو واڈکا اور پنیر کی خوشبو آتی ہے ——— سارا شہر کمیونسٹ ہے۔ عموماً سیاحوں کو وہ جیل خانہ دکھایا جاتا ہے جہاں لینن کے ساتھیوں کو گرفتار کرکے نظر بند کیا جاتا تھا ——— لیکن اس شہر میں پیٹر دی گریٹ کی روح گھومتی ہے۔ اب بھی یہ اس کا شہر ہے جس خوبصورت گرجا گھر میں اس کی خوبصورت قبر ہے وہاں قبر پر ہمیشہ پھول ہوتے ہیں۔ میں نے کئی لوگوں سے پوچھا کہ:

'اب جبکہ ملک میں شاہ پرستی نہیں ہے اس کی قبر پر کون پھول رکھتا ہے؟'

ایک بوڑھی عورت نے کہا: ——— 'پتہ نہیں بیٹے ——— کسی کو پھول رکھتے کبھی دیکھا نہیں۔ پر پھول یہاں ہوتے ہیں بلکہ ہمیشہ یہاں ہوتے ہیں ——— سردیوں میں بھی ——— یہ بادشاہ کہاں تھا مزدور تھا۔ کئی سال تو سمندری جہازوں کے کارخانوں میں مزدور بن کر سکتا رہا'۔

ہم برصغیر ہندو پاکستان کے مغلیہ بادشاہوں سے بے پناہ محبت کرتے ہیں ہم نے ان کے انتظام حکومت کی کبھی جانچ پڑتال نہیں کی بلکہ ان کی تاریخی عمارتوں کو دیکھ کر ان کی عظمت کے ساتھ ایک رومان وابستہ کر دیا ہے ——— ان کی شاہی عمارتوں نے ہی ہمیں ہمیشہ کے لئے ان کا گرویدہ کر دیا ہے۔

یہ شہر بھی محلوں کا شہر ہے ———

پیٹر کے محلوں کا شہر ———

ایک چھوٹے سے محل میں جہاں پیٹر دی گریٹ نے خود ایک مشین ایجاد کرنے کی کوشش کی تھی اور جس کا باورچی خانہ بالکل سادہ اور غریبانہ تھا میں باہر نکلا۔ باہر درخت ہی درخت تھے۔ بادلوں اور سمندری ہواؤں کی نمی سے بوجھل درخت ———

جیسا سبزہ اور درخت لینن گراڈ میں نظر آیا پھر کبھی نہ دیکھا کیونکہ یہاں کی روئیدگی میں ہونٹوں کی سی ملائمت تھی۔ باغ خاموش تھا۔ اتفاق سے نہ مقامی لوگ نظر آتے تھے نہ سیاح ——— صرف فاصلے سے کچھ دبی دبی آوازیں آ رہی تھیں ——— باتوں کی ہنسی کی آوازیں۔

پرندوں کی سیٹیاں نہیں تھیں لیکن لگتا تھا درخت بے آباد نہیں ہیں۔ بارش نہیں ہو رہی تھی لیکن پتوں سے بوندوں کے پھسلنے کا شبہ ہوتا تھا۔ زیادہ درختوں کی لکڑی سیاہ تھی اور ڈالیاں کونپلوں کی طرح سبز ——— ادھر ادھر پرانے بت پڑے تھے ——— روشیں ٹھنڈی تھیں ———

پھر اچانک میری نگاہ ایک بت پر پڑی۔ یہ ایک قدِ آدم عورت کا مرمریں بت تھا۔ بھرے بھرے جسم کی ملائم شکل سی فرشتہ رو عورت ——— اس کے کندھے پر مرمر کا ایک چھوٹا سا کبوتر بیٹھا تھا اور کبوتر کی چونچ میں عورت کے پتھریلے پستان کا سرا تھا۔

میرا جی چاہا کہ اس کبوتر کو اڑا دوں۔ جس گستاخی کا وہ مرتکب تھا اس کا میں متحمل نہ ہو سکتا تھا ——— لیکن جس آرٹسٹ نے عورت اور کبوتر کو یوں ساحری رنگ میں دکھایا تھا وہ دستوفسکی کے کرداروں سے ٹالسٹائی کی بے چینی، چیخوف کی برداشت، مزدوروں کی جفاکشی، شمالی روس کی برفباری سے واقف تھا۔ وہ اس کرب سے بھی آشنا تھا جو انسانی پستان کے حیوانی چونچ میں آجانے سے ہوتا ہے، اور اس آرٹ کی ساحری کو بھی جانتا تھا جو اس کرب سے پیدا ہوتی ہے۔

کاسنی پھولوں میں چبوترے پر سجایا یہ بت بیک وقت مضحکہ خیز بھی تھا اور خیال آرا بھی۔ اس میں لذت کوشی بھی تھی اور بیزاری بھی۔

اس میں غایت درجے کا وجد و انبساط تھا اور سارے لینن گراڈ کا دکھ بھی۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مجھے اچانک لگا ـــــ اس سادھنی اور کبوتر کی وجہ سے میں روس سے متعارف ہوا ـــــ روس جو سدا اپنے مسلک کے کبوتر کو اپنے کندھے پہ بٹھائے رکھتا ہے۔ یہ کبوتر مسلسل اس کے پستانوں سے اس کا لہو پیتا ہے اور کبھی سیر نہیں ہوتا۔ اس درد کی سادھنا میں ان دونوں کی بقا ہے کا کبوتر لہو پیتا رہے گا ـــــ اور مرمریں پستان کبھی خالی نہ ہوگا۔ وہ درد کی لذت کو سہتا رہے گا اور کبوتر کو پالتا رہے گا ـــــ اس باغ میں گھومنے پھرنے والے شہریوں کو مقامیوں کو علم نہ ہوگا کہ سیاہ درختوں تلے سبز پتوں میں چھپی ہوئی ہری گھاس پر روس کی روح بیٹھی ہے ـــــ مجھے لگتا ہے کبھی کبھی آدھی رات کو خندق کی طرف سے دبے قدم پیٹر دی گریٹ قاقم اور سمور کا بڑا کوٹ پہنے جس پہ کاڑھ کے تکلے لگے ہوں گے ادھر آتا ہوگا ـــــ اس بت کے خالی کندھے پہ ہاتھ رکھ کر سوچتا ہوگا ـــــ کیا میں یہ کبوتر اڑا دوں کہ رہنے دوں ؟ ـــــ کیا ہر بادشاہ کی روح مرنے کے بعد اپنے ملک کو واقعی وارثین کی ملکیت سمجھنے لگتی ہے ؟ ـــــ کیا مغلیہ بادشاہ اب بھی راتوں کو شاہی قلعے کے طواف نہیں لگاتے ؟ کیا وہ واقعی اپنی سلطنت کو بھول جاتے ہیں ؟ ـــــ

ایسے ہی جب پہلی بار میں سونیا کو پیبوزراما میں ملا تھا تو بڑی دیر تک سوچتا رہا تھا کہ میں اس روسی لڑکی کو یاد رکھوں کہ بھلا دوں ـــــ جب اسے بھلانے لگتا تو وہ یاد آئے جاتی اور جب یاد کرتا تو اس کا کچھ بھی واضح طور پہ یاد نہ آتا۔ اسی طرح کئی مہینے گزر گئے اور پھر اچانک ایک شام وہ مجھے ٹیلی وژن ٹاور کی لفٹ میں مل گئی۔ وہ ہمیشہ کی طرح شفاف آنکھوں سے نہ جانے کدھر دیکھ رہی تھی ؟ جب میں لفٹ میں داخل ہوا تو اس نے مجھے نہیں دیکھا۔ اس کے اور میرے علاوہ ایک بوڑھا روسی دیوار سے کندھا لگائے ناک سے چوہے نکال رہا تھا۔ ایک منٹ میں ہم ۵۰۴ میٹر اوپر چلے

گئے اور لفٹ رک گئی۔ میں نے لفٹ سے باہر نکلنے کے لئے سونیا کو اشارہ کیا تو اس نے حیرانی سے مجھے دیکھا "سی پاسی با" کہا اور آگے بڑھ گئی۔

ٹیلی وژن ٹاور روسی فخر میں شامل ہیں۔ وہ ہر سیاح کو اس کے متعلق بتلاتے ہیں اور اس کی پیمائش پہ حیران کراتے ہیں۔ ٹیلیوژن ٹاور کے اوپر ایک چھوٹا سا گول روشن ریستوران ہے جس کے سارے طرف شیشہ ہی شیشہ لگا ہے۔ ان کھڑکیوں سے سارا ماسکو نظر آتا ہے۔ دور تک آسمان دکھائی دیتا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے ہم کسی منجمد طیارے میں ایک ہی مقام پر ایک ہی جگہ ٹک گئے ہیں۔ ہم دونوں ایک کھڑکی کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئے۔ باہر غالباً تیز دھوپ اور گرمی تھی لیکن اندر بہت خوشگوار تھا۔ اگست میں ماسکو پہ بہار کا احساس ہوتا ہے۔

"بڑے دنوں بعد دکھائی دی ہو ـــــ"

"ہاں ـــــ میں یہاں نہیں تھی ـــــ کیف گئی ہوئی تھی"

"میں کئی مرتبہ پیبوزراما بھی گیا ـــــ کتنے عرصے کیف رہیں ؟"

اس نے میری اس بے تکلفی کا جواب نہ دینا چاہا۔

"کیوں ماسکو پسند آیا ؟"

"بہت ـــــ یہاں کے لوگ سادہ ہیں۔ زندگی عام فہم ہے ـــــ شام کو جب سڑکوں پہ نیون کے اشتہار نظر نہیں آتے تو بڑی راحت کا احساس ہوتا ہے۔ سارا شہر ستھرا ستھرا لگتا ہے ـــــ"

وہ خوش ہو گئی جیسے میں نے اس کے محبوب کی تعریف کی ہو۔

"تمہارے شہروں میں اشتہار ہوتے ہیں ؟ ـــــ خاص کر نیون کے ؟ ـــــ" اس نے سوال کیا۔

"تم کراچی آؤ تو پتہ چلے آدھی کراچی اشتہاروں سے روشن رہتی ہے ـــــ"

IDEOLOGY

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اس نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا پھر چُپ ہو گئی۔

"کیا بات ہے سونیا ___ ؟"

"کچھ نہیں۔ تم برا مان جاؤ گے ___"

"نہیں ___ اب میں پہلے سے زیادہ روس آشنا ہو گیا ہوں۔"

"تمہارا غریب ملک ہے ___ اور ___ تم لوگ اشتہاروں پہ اتنا پیسہ ضائع کرتے ہو ___ اگر یہ اشتہار نہ چھپیں تو اشیاء اتنی مہنگی نہ ہوں جتنی ہو رہی ہیں ___ بھلا ایک غریب ملک کی CONSUMPTION اس آسائش کی کہاں متحمل ہو سکتی ہے ؟ ___"

اس کی بات درست تھی۔ وعدہ بھی میں نے یہی کیا تھا کہ میں برا نہیں مانوں گا۔ لیکن دشمن کی آمد پہ جانوروں کے جسم کے بال کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ایسے ہی میں بھی اسے کوچنے کے لئے تیار ہو گیا۔ ہم پاکستانیوں کا بھی عجیب مزاج ہے۔ ہم اپنے گھر بیٹھ کر اپنے ہم وطنوں پر، اپنے ملک پہ، لیڈر شپ، نظام پر چاہے جو کچھ بھی کہیں، پاکستان سے باہر نکلتے ہی ہمارا تعصب بڑھنے لگتا ہے۔ ہم پاکستان پہ سچی جھوٹی کوئی تہمت برداشت نہیں کر سکتے۔ اسی جذبے اور جوش نے سفید دنیا میں ہمارے خلاف ایک محاذ سا بنا رکھا ہے۔ لندن میں اس نفرت نے پاکی بیشی کی شکل اختیار کر لی ہے کینیڈا میں ویسے ہی "پاکی پاکی" کہہ کر ذلت کا احساس دلاتے ہیں۔ اور تو اور سعودی عرب میں بھی پاکستانیوں سے کچھ ایسی تواضع کا برتاؤ نہیں ___ باقی فیکٹر اپنی جگہ درست ہوں گے لیکن یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ بیرونِ پاکستان جو کچھ نفرت پاکستانیوں کو پیش آتی ہے اس کی ایک وجہ وہ محبت بھی ہے جس کے اظہار سے ہم لوگ باز نہیں آتے ___ پاکستان کو ذرا کسی نے کچھ کہا اور ہم نے میان سے تلوار نکالی ___

"تم ماسکو پہ بہت فخر کرتی ہو" میں نے لگاوٹ سے کہا۔

"کیوں نہیں ___ روس دنیا کا سب سے بڑا ملک ہے ___ ماسکو دنیا کا خوبصورت ترین شہر ہے۔ ہم دنیا کی عظیم ترین قوم ہیں اور ماسکو روس کا دل ہے دل ___ روسیوں کی جان ہے جان ___"

مجھے یوں لگا کہ میں نے اسے دیوار سے لگا کر دونوں بازو اس کے کندھے کے دائیں بائیں رکھ کر اسے شکنجے میں پھنسا لیا ___ میں نے آہستہ آہستہ کہا:

"یوں لگتا ہے سونیا کہ تم کمیونزم کی اصلی سپرٹ نہیں سمجھتیں ___ کمیونزم نے معاشی اونچ نیچ اس لئے مٹائی کہ ایک آدمی دوسرے آدمی کو دولت کی وجہ سے شرمندہ نہ کر سکے۔ اپنے آپکو دوسرے آدمی سے بہتر نہ سمجھ سکے۔ اگر فخر کرنے کے لئے متکبر ہونے کے لئے کچھ اور بھی وجوہات ایجاد ہوتی رہتی ہیں تو پھر دولت پر اعتراض کیوں؟ یہ اچھی خاصی معقول وجہ ہے انسانی فخر کے لئے ___ پہلے لوگ اپنی ملکیت پر فخر کرتے تھے اب قومی ملکیت پر متکبر ہیں ___ تکبر چاہے ذات کا ہو چاہے قومی سطح کا تکبر ہی رہے گا ___"

"کمال ہے۔ کہاں ذاتی ملکیت۔ کہاں قومی ملکیت ؟ ___ فخر کرنے کیلئے ہر روسی کے پاس ایک سا روس ہے۔ کسی کے پاس بڑا یا چھوٹا سرمایہ نہیں ہے"۔

"ہو سکتا ہے کسی چھوٹے ملک کے باشندے کے پاس اتنا بڑا فخر نہ ہو ___ اور اسے احساسِ کمتری کا شکار ہونا پڑے پھر ___ کیا بنی نوع انسان پہ یہ زیادتی نہیں ___ یہ قومی فخر ___ یہ قومی ملکیت ___ پہلے ایک روسی دوسرے روسی سے بہتر تھا ___ اب ایک روسی دوسری قوموں سے دوسرے لوگوں سے بہتر ہے۔ بات تو وہیں رہی ___"

وہ چپ ہو گئی ___ چھوٹا سا گنگناتا پرندہ برف میں دب گیا ___

بڑی دیر تک ہم دونوں اپنا اپنا سینڈوچ کھاتے رہے اور ایک دوسرے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سے نظریں چراتے رہے۔ دوستی کے لمحات، محبت کے لمحات میں نظریاتی زہر گھولتے رہے۔ پھر کہیں سے ایک بادل کا ٹکڑا سورج کے سامنے آگیا۔ سارے ماسکو پر یکدم سورج کی روشنی بند ہو گئی۔ ٹاور کی روشنی کم ہو گئی۔

میں نے اس سے کہنا چاہا :

" سونیا آئی ایم سوری ــــ میں تو دوستوفسکی کا عاشق ہوں ــــ میں اسے سارے کلاسیکی ادب کا گرو مانتا ہوں۔ بھلا میں روس کے خلاف زبان کھول سکتا ہوں ......"

لیکن میرے منہ سے کچھ نہ نکلا۔

" سنا ہے تمہارا ملک نظریاتی ہے ــــ اس کی کوئی جغرافیائی وجہ نہیں ہے نہ ہی یہ کسی جنگ کے بعد بنا ہے ــــ "

میں معافی مانگنے کے موڈ میں تھا۔ لیکن اب مجھے پتہ چلا وہ بھی چائے کی پیالی میں طوفان اٹھانے کا ارادہ رکھتی ہے۔

" نہ صرف نظریاتی بلکہ مطالباتی ــــ "

" اس کے پانچ صوبے ہیں اور ہر صوبے کی زبان مختلف ہے .... ہے ناں ؟ "

" لیکن ہم سب کا مذہب ایک ہے ــــ "

" عجیب سی بات ہے۔ تم پاکستانیوں کی شکلیں، زبان ــــ کلچر سب ہندوستانیوں جیسا ہے۔ میں ہندوستانیوں سے ملتی رہتی ہوں ــــ پھر تم لوگوں نے ان سے علیحدہ ہو کر اپنا علیحدہ ملک کیوں بنایا ــــ ہمارے ملک میں بہتر زبانیں بولی جاتی ہیں۔ پھر بھی ہم اکٹھے ہیں۔"

" ہمارے ہاں بھی پانچ زبانیں بولی جاتی ہیں اور ہم اکٹھے ہیں۔"

" لیکن علیحدہ ملک بنانے کی ضرورت کیا تھی۔ آخر تمہارا اور ان کا اتنا کچھ سانجھا ہے۔"

میں واقعی اسے تکلیف نہیں دینا چاہتا تھا لیکن میں خاموش بھی کیسے رہتا میری پہلی محبت پاکستان تھی۔

" تمہارا کلچر، رہن سہن، شکلیں، رسم و رواج، مذہب، عقیدہ سب کچھ فرانس سے ملتا ہے۔ پھر تم ان کے ساتھ ایک ملک کیوں نہیں بنا لیتے ــــ ؟"

وہ نرم پڑتے ہوئے بولی ــــ " چلو ملک بنا لیا ــــ اب اتنے چھوٹے وقفے میں دو جنگوں کی کیا ضرورت تھی ــــ خواہ مخواہ ــــ اتنی نفرت کی وجہ کیا ہے ؟ ــــ اب بھول بھی جاؤ ــــ اتنا چھوٹا سا ملک ہے اور اتنے بڑے ملک کے ساتھ دشمنی پال رہا ہے ــــ "

" وہی وجہ سونیا جو تم لوگوں کے دلوں میں فرانس کے خلاف نفرت بن کر بیٹھی ہے ــــ روس اتنا بڑا ملک ہے۔ جب وہ فرانس جیسے چھوٹے ملک سے نفرت کیے جا رہا ہے تو ہم کس گنتی میں ہیں۔ ہمارے لئے تو وہ جنگیں بھولنا اور بھی ناممکن ہے۔ نپولین کی جنگ ۱۸۱۲ء میں ختم ہو گئی سونیا۔ پھر اب تم ٹرائمف گیٹ ڈھا کیوں نہیں دیتے۔ پینوراما کی نمائش بند کیوں نہیں کر دیتے؟"

" ہم اپنے بچوں کو ہسٹری پڑھانا چاہتے ہیں کہ وہ دوست دشمن میں پہچان کر سکیں۔"

" کیا میں دست بستہ پوچھ سکتا ہوں کہ ہسٹری سے سبق سیکھنا روس کا خصوصی حق ہے کیا ؟ اگر آپ لوگ اپنی عبرتوں کو آئندہ نسلوں کے لئے تازہ رکھنا چاہتے ہیں تو کیا یہ خصوصی حق صرف روس کا ہے ...... کہ کیا ہسٹری سے سبق سیکھنے کا بھی کوئی خاص ویزا ملتا ہے۔ کوئی سیکورٹی جمع کرانی پڑتی ہے گارنٹی سے پہلے ؟"

اب سونیا کے ماتھے پر تیوری پڑ گئی۔ دوستی کا لمحہ آیا لیکن دلوں کو بند پا کر واپس

چلا گیا۔

وہ اٹھی۔ آہستہ سے اس نے تسوے دانیا کہا اور چلی گئی۔ مجھے لگا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ مجھے پھر کبھی ملنا نہیں چاہتی۔

اس ملاقات کے بعد میں نے اسے تلاش بھی نہ کیا۔ ٹی وی ٹاور پر ہماری ملاقات کا سرکٹ اچانک فیوز ہو گیا تھا۔ میں اپنی بدزبانی کی تلافی کرنا چاہتا تھا۔ معافی مانگنے کے موڈ میں تھا۔ میں نے ایک کمزور سی لڑکی کو وطن پرستی کی بہت زیادہ سزا دی تھی لیکن مجھے اس کے گھر کا پتہ معلوم نہ تھا۔ ہیوٹرا میں پہنچ کر پتہ چلا کہ سونیا نوکری چھوڑ کر جا چکی ہے۔

اس روز گورکی سٹریٹ کے بیلے گھر میں ISMERALDA نامی بیلے کی نمائش تھی۔ سڑک سے بالکل احساس نہ ہوتا تھا کہ اندر اس قدر بڑا ہال ہو گا۔ چھوٹے سے پھاٹک سے داخل ہو کر میں اندر چلا گیا۔ دو ہزار سیٹوں کا ہال کھچا کھچ بھرا تھا لیکن سارے ہال میں اندھیرا اور خاموشی اس درجہ تھی کہ محسوس بھی نہ ہوتا تھا کہ یہاں کوئی موجود ہے۔ میں چپ چاپ مسحور بیلے کو دیکھنے لگا۔ انٹرول کے وقت جب میں تازگی حاصل کرنے کیلئے بغلی ریستوران میں گیا تو سونیا مجھے ایک کاؤنٹر کے سامنے کھڑی نظر آئی۔ اس تک پہنچنے کی کوشش محال تھی کیونکہ لوگ درمیان میں دیوار کی طرح کھڑے آلو بخارے کا رس انار کا پانی، بیئر اور بیف کھانے میں مشغول تھا۔ معافیاں مانگتے اور ایکسکیوزمی کہتے جب میں اس کاؤنٹر تک پہنچا تو وہ جا چکی تھی اور لوگ دھڑا دھڑ ہال میں لوٹ رہے تھے۔ اس امید میں کہ وہ ہال سے نکلے گی تو میں اس سے مل لوں گا۔ بیلے ختم ہونے سے پہلے بڑے پھاٹک پر آکر رک گیا —— لیکن پتہ نہیں وہ کہاں سے رخصت ہو گئی یا کیسے پاس سے گزر گئی کہ میں اسے دیکھ نہ سکا۔ کاش اس روز وہ مجھے مل جاتی تو میں اسے بتاتا کہ روسی بیلے نے مجھے کس درجہ متاثر کیا ہے۔ ایک ہی ٹانگ پر لٹو کی طرح گھومنے والے ڈانسر

تتلیوں کی طرح آنے جانے، بھونروں کی مانند لرزاں، ان لوگوں نے تو انسانی تہذیب کا ہر حسن اپنے اندر جذب کر لیا تھا۔ اس سے پہلے روسی سرکس اور کوسک گھڑ سواروں نے مجھے ورطۂ حیرت میں ڈال رکھا تھا۔ میں سونیا کو بتانا چاہتا تھا کہ مجھے روس کی تخلیقی قوت نے بے حد متاثر کیا ہے۔ اگر روسی لوگ اسی ترنگ سے کندھے سے کندھا جوڑ اپنی سرحدوں پر ناچنے لگیں تو کوئی ٹینک ان کا کالم توڑ نہیں سکتا۔ اگر وہ اپنے گھڑ سواروں کو ہمالہ کی چوٹیاں سر کرنے کے لئے بھیج دیں تو سموں سے چنگاریاں اڑاتے یہ گھوڑے خیال سے بھی پہلے وہاں پہنچ جائیں گے۔ لیکن سونیا تو پتہ نہیں کس دروازے سے رخصت ہو گئی؟ اسے کیا بتاتا کہ روس کا ملکی جینئس ناچ میں ہے —— زندگی کا رقص —— موت کا رقص —— میں سونیا کے پاس بیٹھ کر لمبے چوڑے اعتراف کرنا چاہتا تھا لیکن میرے سامنے گورکی سٹریٹ تھی —— رات کا وقت تھا اور بیلے تھیٹر سے نکلنے والوں کا شور تھا۔ میں سوچتا ہوا چلنے لگا۔

ایک تو ہر ملک کا فرداً فرداً جینئس ہوتا ہے اور ایک اس ملک کا مجموعی خصوصی جینئس ہوتا ہے۔ اسی مجموعی جینئس سے اس ملک کے آرٹ کا پتہ چلتا ہے کیونکہ آرٹ سوئی کا ناکہ ہے جس سے قوم کا باریک آئی کیو بڑے تواتر سے گزرتا رہتا ہے۔ انگلستان کا جینئس اس کے ڈرامے کی شکل میں سامنے آیا۔ ہم شیکسپیئر کو انگلستان کی سائیکی کا مجموعی سرمایہ کہتے ہیں۔ اسی طرح امریکہ کا جینئس سیاسی ہے۔ چھوٹی چھوٹی سیاسی بصیرتیں مل کر ابراہم لنکن جیسی دولت میں اکٹھی ہوئی ہیں۔ جاپان کا قومی جینئس اس کی الیکٹرونکس میں بند ہے۔ وہ سڑکوں پر آتے جاتے کمر تک جھک کر خوش آمدید خدا حافظ کہتے، روزمرہ کی پابندی میں چھوٹے سے الیکٹرون لگتے ہیں۔ انہوں نے الیکٹرونکس کو چھٹی حس کی طرح ایک ناقابلِ فہم حقیقت بنا دیا ہے —— جرمنی سرمنڈل ہے —— اس کے دیس کی ہوائیں سازوں کو جنم دیتی ہیں۔ اس کا مجموعی شعور موسیقی میں ڈوبا ہے۔ بیتھوون باخ، موزاٹ، شوبرٹ،

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سب ایسے بادلوں تلے پروان چڑھے ہیں جن سے موسیقی مترشح ہوتی ہے۔

ہر ملک میں، ہر قوم میں وقتاً فوقتاً مہان پُرش پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ یہ جینئس لوگ اپنے ملک کی سمتیں، کلچر، آدرش، رسم و رواج، سوچ کو بدلنے کے لئے آتے ہیں۔ لیکن یہ مہان پُرش فرد کی حیثیت میں بڑے ہوتے ہیں۔ ان کا تعلق قومی جینئس، مجموعی ملکی جینئس سے نہیں ہوتا ۔۔۔۔ سوئس لوگ فرداً فرداً اور مجموعی طور پر گھڑی بنانے کا خصوصی ملکہ رکھتے ہیں۔ قومی جینئس سے میری مراد وہ خاص لگاؤ ہے جو کسی قوم میں اس وقت بھی ملتا ہے جب اس میں مہان پُرش پیدا نہیں ہو رہے ہوتے۔ وہ اپنی خصوصی مجموعی سائیکی کے زیرِ اثر اپنی فیلڈ میں معرکے مارے چلے جاتے ہیں۔ ان کا دھارا اس میدان میں کبھی ختم نہیں ہوتا۔

روس میں بیلے، امریکہ میں پالیٹکس ___ سعودیہ میں مہمان نوازی، فرانس میں نئی سوچ ___ علیٰ ہذا القیاس ہر ملک اپنی قومی سطح کے جینئس سے دوسرے ملک کے سامنے اپنا شرف قائم رکھتا ہے ___ برصغیر کا قومی جینئس سفید آدمی سے مرعوب ہونا ہے اس میں ہندوستانی پاکستانی دونوں ایک سے خوف زدہ ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ پاکستانی مرعوب ہو کر سفید فام آدمی کی نقل اتارتا ہے اور اس کے ہم پلّہ ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ ہندوستانی بظاہر اپنے لباس، زبان، کلچر پہ ڈٹا رہے گا لیکن خوفزدہ وہ بھی ہو گا۔ اندر سے اس کا بھی لہو سوکھتا ہے ___ وہ بھی تمامتر سادھی اہنسا اور تیاگ کے باوجود مغرب کے کارناموں پہ انگشت بدنداں رہتا ہے۔

ہوتے ہوتے میں تسوے دانیا، سی پاسی با، نیئت کا استعمال خوب موقع پر کرنے لگا تھا۔ غالباً نیئت ایک ایسا لفظ ہے جو روس میں سب سے زیادہ اٹل اور بامعنی ہے۔ ہماری دکانوں پر اگر سامان موجود نہ ہو تو بھی "باجی جی" ___ "آپا جی" کے لئے دکاندار ساتھ والی دکانوں سے سامان منگوا کر دکھا دیتا ہے۔ خرید وا دیتا ہے۔ لیکن روسی دکاندار

ہوٹل کا بیرا، ٹیکسی ڈرائیور کی زبان سے جب ایک بار نیئت کا لفظ نکل جائے تو پھر اس پر پسیجنے کا شبہ کرنا زیادتی ہے۔ جو چیز نہیں ہے نہیں ہے۔ ویسے بھی ابھی روس CONSUMENS GOODS کی طرف متوجہ نہیں ہوا۔ وہ قومی سطح پر ایسے بڑے بڑے حیرت انگیز پروجیکٹ بنا رہے ہیں کہ ضرورت کے سامان کی طرف ابھی ان کی ویسی توجہ نہیں جیسی امریکہ اور جاپان کی ہوتی ہے۔ وہاں سڑکیں، ڈیم، ہوائی جہاز، ہسپتال، ہیوی انڈسٹری، بجلی گھروں پہ حکومت کا سارا زور لگتا ہے لیکن عام گاہک کے لئے خوبصورت سینٹ، گھڑیاں، پن، لپ سٹک، ریشمی جرابیں، خوبصورت پرس، نکٹائیاں، ایسی چیزیں اگر بنتی ہیں تو بی گریڈ ہوتی ہیں۔ ہر حکومت کی طرح روسی حکومت کا بھی خیال ہے کہ ہمارے عوام اپنے ملک سے محبت کرتے ہیں۔ وہ ملکی ضرورت کے سامنے ذاتی ضرورت کو کوئی اہمیت نہ دیں گے۔ ہر حکومت یہاں دھوکا کھاتی ہے اسے شاید معلوم نہیں ہوتا کہ عام شہری اپنی غرض و غایت سے بندھا ہوتا ہے ___ یہی معمولی لوگ جب ان کی ضرورتیں پوری نہ ہوں، چاہے یہ ضرورتیں آسائش کا غیر ضروری سامان ہی کیوں نہ ہو، تو پوری ملکی ODIOLOGY کو SABOLAGE کر دیتے ہیں۔ پاکستان میں مال سمگل ہونے لگتا ہے۔ فارن سامان کے خفیہ بازار اڈے کھلنے لگتے ہیں اور روس میں امریکی سگریٹ، لپ سٹک، ریشمی جرابیں، فنشنگ کرنے والے سینٹ دیکھ کر ایک نوجوان روسی لڑکی کو کمیونزم کے تمام اونچے آدرش بھول جاتے ہیں اور وہ سیدھی سادی لڑکی رہ جاتی ہے۔ اسے خوبصورت لگنے اور محبوب کی نگاہوں میں جچنے کے سوا کچھ اور نہیں سوجھتا۔ جس طرح قومی سطح پر اس ملک اور قوم کا بہت ڈراوا ہوتا ہے جس کے پاس مہلک ہتھیار ہوتے ہیں، ایسے ہی فرد کی سطح پر اس آدمی کا بہت دبدبہ ہوتا ہے جس کے پاس دوسرے آدمی کو مرعوب کرنے کا سامان ہوتا ہے۔

میرے ساتھیوں میں یونیورسٹی کے دو روسی لڑکے داریا اور میخل بھی تھے۔ ہمیں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

داریانے اپنی منگنی کی خوشی میں "روس" ہوٹل میں مدعو کر رکھا تھا۔ ہم تینوں بہت خوش تھے کیونکہ ہم میں سے داریا سب سے زیادہ جنسِ مخالف سے بے پروا تھا۔ وہ اٹھتے بیٹھتے شادی کو مضحکہ خیز شے ثابت کرتا پھر اچانک وہ نتاشیا کے ساتھ کبھی کبھی دیکھا جانے لگا اور پھر اس سے بھی اچانک پتہ چلا کہ وہ نتاشیا سے شادی کرنے والا ہے۔

جس وقت ہم "روس" میں بیٹھے انار کا رس پی رہے تھے اسوقت ایروفلوٹ کی بس سامنے رکی۔ روس ہوٹل کی بیرونی دیوار قریب قریب شیشے کی ہے۔ جہاں ہم بیٹھے تھے وہاں سے سڑک کا منظر صاف نظر آرہا تھا۔ بڑے بڑے تھل تھل جسموں والی امریکی عورتیں جینز، اور بغیر آستینوں کے بلاؤز پہنے، سروں پہ پیلے اور ٹھمکنے والے سرخ رومال باندھے بس سے اتر رہی تھیں۔ ان کے بازو، چہرے دھوپ میں کندنی ہو رہے تھے۔ چہرے پہ گہری براؤن پتی پڑی تھی۔ امریکی مرد جسموں پہ کافی سامان لادے نون غنے کی بھرمار سے انگریزی بول رہے تھے۔ ان سب کا لباس سادہ تھا جیسا کہ امیر آدمیوں کا عموماً ہوا کرتا ہے لیکن انہیں اچھی طرح احساس تھا کہ وہ ایک بڑے سُپر پاور ملک کے باشندے ہیں ـــــ

ہوٹل میں داخل ہوتے ہی امریکی میزوں کے گرد بے تکلفی سے بیٹھ گئے اور ان کی آمد و رفت ٹائیلٹس کی طرف ہونے لگی۔ ان کی میزوں پہ ایک بڑی خوبصورت روسی لڑکی ویٹرس مقرر تھی۔ وہ روسی پھیکی چائے، تلے ہوئے انڈے ٹوسٹ کا آڈر لے کر چلی گئی لیکن امریکی عورتوں میں نہ جانے کیا بات تھی کہ روسی ویٹرس پلٹ پلٹ کر انہیں دیکھتی جاتی تھی۔

جب روسی ویٹرس بڑا ٹرے لیکر واپس آئی تو امریکی عورتیں اپنے آپکو تازہ دم کرنے کے مرحلوں میں تھیں۔ وینٹی بکس کھلے تھے۔ لمبی لمبی چمکدار لپ سٹکیں چوڑے دہانوں پہ پھیری جارہی تھیں۔ کلون کی بوتلوں سے چتی دار بازوؤں پر سپرے ہو رہا تھا۔ فلیٹ بوٹ

اتار کر لمبی ریشمی جرابیں پہنی جارہی تھیں۔ آنکھوں پہ ماسکارا لگ رہا تھا۔ امریکی عورتیں سیاحوں کی سی بے تکلفی کے ساتھ بالوں کو برش کر رہی تھیں اور ان کے ساتھ آنے والے ان کی تصویریں کھینچ رہے تھے۔ انہیں پروا نہ تھی کہ یہ ان کا پرائیویٹ کمرہ نہیں۔ وہ امیروں کی آزادی کے ساتھ میک اپ کرنے میں مشغول تھیں۔

ویٹرس بہت خوبصورت تھی۔ وہ کسی ایکٹرس کی مانند تھی لیکن اتنا سامانِ آرائش دیکھ کر جیسے وہ بوکھلا گئی اور دودھ کا جگ اس کے ہاتھ سے پھسل گیا۔ پھر وہ ایکسکیوزمی کہہ کر پیچھے کی طرف کپڑا لینے بھاگی

پتہ نہیں کیوں لگتا تھا جیسے وہ اچانک احساسِ کمتری میں مبتلا ہو گئی ہے۔

اگر ساری امریکی عورتیں مل کر ایک عورت بنائی جاتی تو اس روسی ویٹرس جتنی خوبصورت نہ ہوتی ـــ لیکن ایک معمولی لپ سٹک ایک واہیات سینٹ سپرے ـــ لمبی ریشمی جرابیں اس لڑکی کو شکست دے گئیں۔ ہوسکتا ہے دنیا کے تمام ملک مل کر بھی روس کی بڑی صنعتوں کو اس کی ہتھیار کاری کو، فلک بوس پروجیکٹوں کو نہ ہرا سکیں۔ لیکن یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ایک ڈن ہل کا سگریٹ ـــــ ساری آئیڈیالوجی میں آگ لگا دے کیونکہ ہر فرد سب سے پہلے اپنے آپ سے محبت کرتا ہے اور پھر کسی اور سے ـــــ حالانکہ ملک سے بھی نہیں۔ مذہب سے بھی نہیں۔

یونیورسٹی میں منجل سے میں بہت بے تکلف تھا۔ وہ مجھ سے اپنے تمام گھریلو حالات، اپنے سابقہ معاشقے، اپنے سفرنامے بیان کر چکا تھا۔ منجل سے بات کرتے ہوئے مجھے ہمیشہ لگتا جیسے وہ بھی سندھی ہے اور سکھر کا رہنے والا ہے۔ روس ہوٹل میں باتیں کرتے ہوئے اس نے اچانک مجھ سے پوچھا:

"سمرو! کیا تمہیں کبھی کسی سے محبت ہوئی ہے؟"

"ہاں ـــــ!"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"کس سے ____؟"

"ایک لڑکی سے اور کس سے ____"

"تمہارے ملک کی ہے ____؟" داریا نے سوال کیا۔

"نہیں میرے ملک کی نہیں ہے۔"

"پھر کہاں کی ہے ____؟"

"بس ہے کہیں کی ____"

پتہ نہیں کیوں میں داریا کو بتانا نہیں چاہتا تھا کہ میں اس کی ہموطن سونیا سے محبت کرتا ہوں۔

"کہاں رہتی ہے؟"

"بس یہیں کہیں ____"

"یار مت پوچھو۔ یہ بتانا نہیں چاہتا" ____ میخل نے کہا۔

میں ان دونوں کو کیا بتاتا کہ مجھے واقعی سونیا کا گھر معلوم نہیں۔ وہ اسکاؤ کی کس سڑک پر کس گلی میں رہتی ہے۔ اس کے گھر کے کتنے افراد ہیں۔ یہ تمام باتیں میں نہیں جانتا تھا۔ میں تو صرف چاند کے طلوع ہونے کا انتظار کیا کرتا ہوں اور جانتا ہوں کہ وہ اور میں نظریاتی بُعد کی وجہ سے کبھی ایک ساتھ نہیں رہ سکتے ____ چاند اور میں!

اس روز میں اکیلا نمائش گاہ گیا۔ یہ نمائش گاہ اس لئے خوبصورت نہیں تھی کہ اسکی بڑی بڑی عمارتوں میں روس کی مصنوعات ہر وقت عام نمائش کے لئے رکھی رہتی ہیں بلکہ ساری نمائش گاہ ایک پارک تھی۔ اونچے اونچے سلوراک کے درخت، برچ کے درخت ____ قدآدم چیڑھ اور بلوط کے درخت۔ اس نمائش گاہ میں چھوٹی سی ٹرین نما بس سواری چلتی تھی اور سیاح جیسے اس میں سوار ہو کر بس ان ونڈر لینڈ پہنچ جاتے تھے۔ نمائش گاہ بہت بڑے رقبے پہ پھیلی تھی اس میں بڑی قد آور عمارتیں تھیں جن میں روس میں بننے

والی، اگنے والی، ساخت کی جانے والی مصنوعات ہر وقت نمائش کے لئے رہتی ہیں۔ جب کوئی سیاح اس نمائش گاہ میں داخل ہوتا ہے اسے اونچے گیٹ کے اوپر ایک دہقانی جوڑے کا بت نظر آتا ہے۔ بتوں پہ سونے کا پانی پھرا نظر آتا ہے اور ان کے ہاتھوں میں گندم کا گٹھا سورج کی روشنی میں جگر جگر چمکتا ہے۔

جس وقت میں نمائش گاہ کے اندر گیا اور ایر دفلوٹ کے فل سائز ماڈل کے پاس سے گزرا سونیا میرے دل و دماغ میں کہیں نہیں تھی لیکن جس وقت میں گاڑی میں سوار ہو گیا تو یکدم کہیں سے سونیا کی خوشبو آئی۔ وہ میرے پاس سیٹ پر بیٹھی مسکرا رہی تھی اب ساری نمائش غائب ہو گئی۔ میرے اردگرد صرف جنگل پھیل گیا اور مجھ میں کسی مور کی روح آ بسی جو بارش کے بعد یکدم جنگل والوں کے لئے ناچنے پہ مجبور ہو جاتا ہے ____ سونیا پاس تھی۔ روس اپنا تھا۔ ہر ایک شخص اسی داخلیت کا شکار ہو کر ایسی GENERALTTES میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ پھر کبھی اسے معالعے کا حوصلہ نہیں پڑتا۔

انسان اپنے تجربے کے ہاتھوں اس قدر مجبور ہے۔ اپنے ماحول کا یہاں تک پابند ہے کہ اس کا سارا تجزیہ اس کی فلاسفی شاذ ہی ان دونوں چیزوں سے نکل سکتی ہے۔ میں سونیا کو دیکھ کر یہاں تک خوش تھا کہ میں نے دل میں عہد کیا کہ اب میں روس کے خلاف ایک لفظ نہیں بولوں گا اور پاکستان تو بھاڑ میں جائے مجھے اس سے کیا لینا ہے، یہاں کون دیکھ رہا ہے کہ میں پاکستان کے بارے میں کیا کہتا ہوں۔ کم از کم سونیا تو زمیں بوس ہو جائے گی۔ سورج اس کے بالوں میں سونے کے باڈر بُن رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں کیپسین سی کی نیلاہٹ تھی۔ اس کے کندھے کسی نو بیاہتا کی طرح جھکے ہوئے تھے اور اس کی جلد پر شرم کی ہلکی سی لالی تھی ____ اس وقت میرا کمیونزم سے کوئی جھگڑا نہ تھا۔ میرے چڑھنے سے پہلے ہی سونیا نے میری ٹکٹ کے پیسے ادا کر دیئے۔ میں نے اسے ڈیڑھ روبل دینا چاہا تو وہ ہنس کر بولی:

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"یہ مت سمجھ لینا کہ تم ہی ایک مہمان نواز ملک سے آئے ہو۔ اپنے پاس رکھو آرام سے ــــ اپنے روبل"۔

ہمارے اردگرد نمائشی عمارتیں بھاگی جا رہی تھیں۔ جنگل پہلے سے زیادہ گھنا ہو گیا تھا اور سونیا بلاوجہ ہلکے ہلکے ہنس رہی تھی۔

"میں یہ نمائش کئی بار دیکھ چکی ہوں۔ تمہیں جہاں بھی اترنا ہو بتا دینا ہم اتر جائیں گے لیکن میں اندر نہیں جاؤں گی"۔

"جب تم کسی عمارت کے اندر جانا نہیں چاہتیں تو پھر آئی کیوں ہو؟ ــــ"

"مجھے یہ باغ اچھا لگتا ہے۔ درخت اچھے لگتے ہیں۔ یہ رائیڈ اچھی لگتی ہے"۔

وہ پھر ہوتے ہوتے ہنسنے لگی۔

"کیوں ہنس رہی ہو سونیا ــــ؟"

"آج میں ہنستی رہنا چاہتی ہوں کیونکہ آج میری سالگرہ ہے ــــ آج میں تم سے جھگڑا کرنا نہیں چاہتی"۔

"لیکن کیوں؟ ــــ آخر جھگڑا کیوں ہو گا؟"

"بس ہو گا ناں ــــ اگر میں اندر صنعت گاہوں میں تمہارے ساتھ گئی تو تم بھڑک اٹھو گے ــــ میں جانتی ہوں تم برداشت نہیں کر سکتے"۔

"کیا برداشت نہیں کر سکتا میں؟ ــــ"

"بس یہی ــــ روس کی صنعتی، معاشرتی، زرعی، خلائی ترقی ــــ تم جلتے ہو روس سے اسی لئے چھید نکالتے ہو ــــ"

جیسے یکدم سورج بادلوں میں چھپ گیا۔ اس روز میں بہت اداس تھا۔ روس میں طالبعلم کی زندگی کوہلو کی زندگی ہے۔ اسے محنت کی چکی میں پسنا پڑتا ہے۔ دو سال کی مسلسل محنت نے مجھے پرانی جراب کی طرح بودا کر دیا تھا۔ میں چپ ہو گیا۔ تین مرتبہ ہم نے

روسی مصنوعات کی مختلف بلڈنگوں کے ٹکٹ خریدے اور بغیر اندر داخل ہوئے پھر گاڑی میں آ بیٹھے۔ اونچے اونچے درختوں میں سفر بہتر تھا ــــ پاس پاس گھٹنے، پاس پاس کندھے، بات کرتے وقت سانسوں کی ملی جلی خوشبو۔ اس سفر میں بہت آنند تھا ــــ اور باہر سردی تھی۔

جب تیسری بار ہم نے جنگل کا پورا چکر کاٹ لیا اور اس جگہ پہنچے جہاں ایروفلوٹ کا پورا جہاز بطور ماڈل کے کھڑا تھا تو سونیا اتر گئی:

"اترآؤ سمرو ــــ یہاں پر اس سپتنک کی نمائش ہے جو خلائی سفر کو گیا تھا۔ جب اپنے دیس جاؤ گے تو لوگوں کو بتانا کہ تم نے اپنی آنکھوں سے سپتنک دیکھا تھا ــــ"

اس کے اترتے ہی گاڑی میں گرمی نہ رہی۔ میں بھی بادلِ نخواستہ اترا اور اس عمارت پر نگاہ کی جس میں خلائی سفر کے متعلق تمام انفرمیشن، مشینری، ہوابازوں کے سوٹ، راکٹ سب کچھ عوام کے لئے لگا تھا۔ یہ ایک ہوائی جہازوں کے ہینگر جیسی جگہ تھی جس میں جابجا گھڑیاں، کمپیوٹر مشینیں لگی تھیں جیسی امریکی فلموں میں مشینوں سے چکاچوند کا سماں ہوتا ہے۔ یہ جگہ بھی عام آدمی کو چھوٹا کرنے کے لئے کافی تھی۔ سونیا عمارت کے اندر میرے ساتھ نہ آئی بلکہ باہر کھڑی ہو کر آئس کریم کھانے لگی۔ شاید وہ ساتھ آتی تو میں زیادہ دلچسپی سے انسان کے اس معرکے کو دیکھتا۔ لوگ باگ ٹکٹ خرید کر راکٹ کے اوپر تک جا رہے تھے لیکن میں اَن مانے جی سے تمام مشینری کا چکر لگا کر واپس لوٹ آیا۔ یہ سارا تناؤ و سامان خلا کی طرح ٹھنڈا اور بے جان تھا۔

جب میں باہر پہنچا تو سونیا کی آنکھوں میں فتحمندی تھی۔

"دیکھا دیکھا ــــ اب تو قائل ہو جاؤ ــــ اب تو قائل ہو جاؤ کہ روس دنیا کا سب سے بڑا ملک ہے ــــ"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"کیسے مان جاؤں ـــــ جب اپالو گیارہ میں سب سے پہلے تین امریکن چاند پر پہنچے۔ نیل آرمسٹرانگ، مائیکل کولنز، ایل ڈرن۔ اصلی بات تو انسان کا چاند پر پہنچنا تھا ـــــ" پتہ نہیں مجھے کسی امریکن سے کیا ملتا تھا پر سونیا کو جلانے کے لئے میں نے کہا۔

مجھے انسان کے چاند پر پہنچنے سے کوئی غرض نہ تھی لیکن مجھے معلوم تھا کہ وہ یہ جملہ سن کر بھڑک اٹھے گی۔ وہ یہ تو برداشت کر سکتی تھی کہ روس اور امریکہ سالٹ کی کانفرنسوں میں آپس میں بندر بانٹ پر ایکدوسرے سے لڑیں لیکن وہ یہ قتلِ عمد نہیں دیکھ سکتی تھی کہ ایک چھوٹے ملک کا آدمی روس کے مقابلے میں امریکہ کو ترجیح دے۔ وہ کسی زندانی کی طرح بھڑک اٹھی:

"تمہارا امریکہ ـــــ تمہارا امریکہ ـــــ انسانوں کو کچھ نہیں سمجھتا۔ وہ انسانوں کے ساتھ کھیل سکتا ہے۔ انہیں چاند پر بھیج سکتا ہے۔ ان پر تجربہ کر سکتا ہے ـــــ ہم انسانوں سے محبت کرتے ہیں۔ جب تک فضائی سفر ہر قسم کے خطرے سے پاک نہیں ہو جاتا ہم خلائی سفر پر انسان کو کیسے بھیج دیتے۔ پتہ نہیں جہاں کہیں سے جمہوریت ہوتی ہے وہاں انسان کیوں اتنا بے وقعت ہو جاتا ہے۔"

یکدم مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ میں پھر سرحد عبور کر کے اس کی حدود میں ہتھیار بند پہنچ گیا تھا۔

آخر جب کبھی کوئی اپنی تخلیق پیش کرتا ہے تو اس کا مقصد تنقیص حاصل کرنا تو نہیں ہوتا۔ سونیا نے مجھے اس لئے تو اندر نہیں بھیجا تھا کہ میں چھوٹتے ہی روسی ٹیکنالوجی کی ٹانگ گھسیٹنے لگوں۔ لیکن دوستی کا لمحہ نکل چکا تھا۔ اب خار پشتوں کی طرح ہم دونوں کے تیر نما پر کھڑے تھے اور ہم ایکدوسرے پر حملہ کرنے کو تیار کھڑے تھے۔

میں چونکہ تھرڈ ورلڈ کا آدمی تھا اور میں نے جمہوریت کو بہ ‌‌‌جے سمجھے اپنے مذہب

سے بھی زیادہ اہمیت دے رکھی تھی اس لئے مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ جمہوریت سرد ملکوں کا شگوفہ ہے وہیں کھلتا ہے اور وہیں خوشبو دیتا ہے۔ میرا خیال تھا کہ جمہوریت انسانی سوچ کا کرشمہ نہیں بلکہ کوئی آسمانی صحیفہ ہے جو سیاسی حل نہیں الہامی حل ہے اس لئے سونیا کے حملے کو برداشت کرنا میرے بس کی بات نہ تھی۔ تھرڈ ورلڈ کے تمام کالے، براؤن، پیلے، گندمی، سفید لوگوں کو پاؤڈر ملک کے ساتھ ساتھ جمہوریت بھی راس آگئی ہے۔

میں نے جل کر کہا:

"سونیا۔ جمہوریت اور کمیونزم میں کوئی فرق نہیں ـــــ یہ تم چھوڑ ہی دو۔ رہنے ہی دو۔ ورنہ انسان کی قدر یہاں ہے نہ وہاں ـــــ"

"تمہاری جمہوریت میں ایسے ہوگا ـــــ وہاں انسان صرف ووٹ ہے۔ ایک ووٹ ـــــ اجتماعی طور پر ایک طاقت اور فرداً فرداً کچھ نہیں ـــــ بے مایہ ـــــ بے حیثیت ـــــ"

میں اب مر رہنے کی حد تک ناراض ہو چکا تھا ـــــ پھر بھی میں نے منت کر کے کہا ـــــ "سونیا رانی! انسان دنیا کے کسی خطے میں ابھی اہم نہیں ہوا۔ نہ پہلے ہی کبھی اہم تھا اور نہ اب ہے ـــــ پہلے فرد بادشاہ ہوتے تھے اب حکومتیں بادشاہ ہیں۔ پہلے تاج شاہی پہننے والے کو کوئی پوچھ نہیں سکتا تھا اب اکثریتی پارٹی کی حکومت کو کوئی پوچھنے والا نہیں کہ یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے کیوں ہو رہا ہے.... پہلے بادشاہ متلون مزاج تھے اب حکومتیں، قانون، آئین تلون کا شکار ہیں۔ ان کا مزاج شاہانہ ہے ـــــ پرانے زمانے میں جب بادشاہ جنگوں سے لوٹتے تھے تو واپسی پر ان کے ساتھ بہت سا مالِ غنیمت ہوتا تھا۔ سکندر ـــــ محمود غزنوی ـــــ نادر شاہ ..... کے ساتھ عورتیں، غلام، کاریگر..... خزانے تو ہوتے ہی تھے لیکن وہ

www.iqbalkalmati.blogspot.com

آرٹ کے خوبصورت نمونے بھی ساتھ لے جاتے تھے ـــــ تخت طاؤس ایسے ہی ایران پہنچا تھا۔ بادشاہوں کو وقت پر اپنا نام ثبت کرنے کی فکر رہتی تھی۔ وہ خوبصورت عمارتیں چھوڑ کر مرتے تھے تاکہ آئندہ نسلیں انہیں یاد رکھیں۔ تمہارے پشکن کا میوزیم اس لئے آباد ہے کہ کچھ روسی بادشاہوں نے ظلم و تشدد سے آرٹ اور کلچر کے یہ نمونے اکٹھے کئے ہیں ـــــ اب بھی حکومتوں کا یہی شاہانہ مزاج ہے ـــــ وہ بھی اپنے دورِ حکومت کا نام ابد کی لسٹ میں لکھوانا چاہتی ہیں، آئندہ نسلوں کے ذہنوں پر ـــــ اور یہ چکا چوند وہ سائنسی شعبدے اکٹھے کر کے پیدا کر رہی ہیں تمام دولت بادشاہ بھی فوجوں پر لگاتے تھے ـــــ اب بھی حکومتیں ملک کی کمائی ہتھیاروں کی فیکٹریوں پر ضائع کر رہی ہیں ـــــ نہ بادشاہوں کو انسان کی پرواہ تھی نہ حکومتوں کو۔ بادشاہ دولت سے عیش کرتے تھے۔ بڑی حکومتیں ہتھیاروں کی فیکٹریاں بناتی ہیں ـــ خلائی سفروں کے انتظام کرتی ہیں ـــــ عام آدمی کی کسی کو پروا نہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ بادشاہ اپنی انا کی خاطر عام آدمی کے حقوق تلف کرتا تھا۔ حکومتیں عام آدمی کو احمق بنا کر یہ احساس دلا کر کہ وہ اس کے حقوق کا تحفظ کر رہی ہیں، اپنی شان بناتی ہیں۔ ہاں اتنی بات ضرور ہے جو کچھ بادشاہوں نے تعمیر کیا، جمع کیا خوبصورت تھا۔ جو کچھ آجکل کی حکومتیں ذخیرہ کر رہی ہیں نہ خوبصورت ہے نہ دیرپا ـــــ"

"یہ تم حکومتیں حکومتیں کیوں کہہ رہے ہو تمہارا مطلب ہے روس نے عام آدمی کے لئے کچھ نہیں کیا ـــ"

"کیا ہے کیا ہے۔ بہت کچھ کیا ہے"۔

مجھے یاد آ گیا کہ میں اس کی سالگرہ کے روز اس سے جھگڑ رہا تھا ـــــ "لیکن"۔

"لیکن کیا بولو ـــــ بولو۔ اب کیوں چپ ہو۔ بولو ـــــ"

"تم ناراض ہو جاؤ گی ـــــ اور آج میں تمہیں ناراض نہیں کرنا چاہتا"۔

"نہیں بولو ـــــ میں ناراض نہیں ہوں گی ـــــ" اس نے کمل ناراضگی سے کہا۔

"تمہاری حکومت نے عام انسان کے لئے بہت کچھ کیا ہے۔ بہت زیادہ لیکن وہ اس سے بھی زیادہ کر سکتی تھی۔ اگر اس کے اتنے بڑے بڑے پلان نہ ہوتے تاج محل قسم کے۔ سونیا ذرا سوچو تو جو اپنی شان کے لئے چاند کو تسخیر کرنے کی سوچ رہے ہوں۔ انسان کو بیک جنبش صفحہ ہستی سے نیست کرنے کے لئے بم بنا رہے ہوں۔ وہ زمین پر چلنے والے انسان کے متعلق کیا سوچ سکتے ہیں۔ بڑے پلان والا چھوٹی باتیں کیسے سوچ سکتا ہے ـــ؟"

"تم دقیانوسی تو ہو ہی سمرو ـــــ آج مجھے پتہ چلا تمہاری انفرمیشن بھی درست نہیں ـــــ"

"میں تو تمہارے ملک میں آ کر، یورپ میں ہر جگہ گھوم پھر کر، امریکہ کے متعلق پڑھ کر اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ طاقتور ملکوں کی حکومتیں امیر ہوتی ہیں اور عوام غریب ہوتے ہیں اور چھوٹے ملک جو ایڈ پر چلتے ہیں قرض پر زندہ رہتے ہیں، انکی حکومتیں غریب ہوتی ہیں۔ وہاں افراد کافی امیر ہوتے ہیں۔ آسائش اور آرام کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ میرے دیس میں چل کر دیکھو۔ ایک غریب گھر میں بھی تمہیں کافی افراط نظر آئے گی"۔

"تم دراصل یہ چاہتے ہو کہ افراد میں اونچ نیچ امیری غریبی ہو ـــــ"

"میں تو ایسے نہیں چاہتا ـــــ پر ایسے ہوتا ہے ـــ ہو رہا ہے ہر جگہ ـــــ"

"پھر تمہارا پلان بھی تو کچھ ہو گا ـــ آخر تم دوسروں پر اس قدر تنقید کرتے ہو تو تم نے بھی ضرور کچھ سوچا ہو گا کہ بہتر راستہ کون سا ہے ـــــ" سونیا نے چڑ کر کہا۔

"ضرورت اس بات کی ہے کہ تمام ملک قریباً برابر برابر ہوں۔ جہاں زبان بدلے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ملک بدل جائے۔ جہاں نیچرل سرحد آئے نئی سلطنت قائم ہو جائے۔ چھوٹے چھوٹے ملک ہوں۔ چھوٹی چھوٹی بستیاں، ایسی حکومتیں کہیں نہ ہوں جہاں سورج ملک کے کسی نہ کسی حصے میں طلوع رہتا ہو ـــــ دادا ابا کے رول سے جب تک بڑے ملک دست بردار نہیں ہو جاتے دنیا میں امن قائم نہیں ہو سکتا ـــــ"

"تمہارا مطلب ہے یخ وڈ یخ وڈ روس چھوٹے چھوٹے حصوں میں بٹ جائے یخ وڈ ـــــ"

"تمہارے کمیونزم کا دارومدار اس مفروضے پر ہے کہ جب دولت کچھ لوگوں کے پاس اکٹھی ہو جاتی ہے تو وہ باقی لوگوں پر عرصہ حیات تنگ کر دیتے ہیں۔ میرا مفروضہ یہ ہے سونیا کہ جب دولت، مواقع، طاقت، کچھ ملکوں کی جاگیر بن جاتی ہے تو تمام چھوٹے چھوٹے ملکوں کی زندگی اجیرن ہو جاتی ہے ـــــ پھر جس طرح غریب آدمی پستا ہے ایسے ہی غریب ملک کا استحصال ہوتا ہے۔ وہ اپنے فیصلے خود نہیں کر سکتا چھوٹے ملک میں اپنی زبان بے وقعت ہو جاتی ہے۔ ان کا کلچر، مذہب، سب بیکار ہو جاتا ہے۔ تمہارے کمیونزم نے چھوٹے غریب آدمی کو آزادی دلائی ہے۔ اسے احساسِ کمتری سے چھڑانے کی کوشش کی ہے ـــــ لیکن ابھی ایسا مسیحا کوئی نہیں آیا جو چھوٹے ملکوں کو من حیث القوم احساسِ کمتری کے گڑھے نکالے ـــــ چھوٹے ملک کو بھی جینے کا حق ہے سونیا ـــــ ساری تھرڈ ورلڈ اس کرب میں مبتلا ہے، تڑپ رہی ہے اور بڑے ملک......"

"بس چپ کرو سمرد۔ آج میں نے اپنے آپ سے وعدہ کیا تھا کہ اگر سمرد مجھے مل بھی گیا تو میں اس کی کسی بات کا جواب نہیں دوں گی ـــــ تم پاکستانی اگر اس قدر امریکی پٹھو نہ ہوتے تو تمہیں نظر آ جاتا کہ روس کیا ہے اور اس نے عام آدمی کے لئے کیا کیا ہے ـــــ تسوے دانیا ـــــ"

وہ گیٹ کی طرف چلنے لگی۔

"سونیا۔ آج تمہاری سالگرہ ہے۔ آج میں تمہیں اس طرح جانے نہیں دوں گا۔"

"میرا بھی خیال تھا کہ میں تمہیں اپنے گھر لے جاؤں گی ـــــ لیکن ـــــ"

"میں تمہارے لئے کیک خرید دوں گا ـــــ"

"نہیں اب نہیں ـــــ تسوے دانیا ـــــ"

"میں وعدہ کرتا ہوں ـــــ"

"میں بھی وعدہ کرتی ہوں لیکن میں جانتی ہوں کہ میں اپنے وعدے کی پابند نہیں رہ سکتی ـــــ کیونکہ میں روس سے محبت کرتی ہوں ـــــ"

"پھر کب ملو گی؟ ـــــ"

"یہیں کہیں ـــــ کسی روز اچانک ـــــ ریڈ سکوائر میں بولشویک چوک میں کارل مارکس کے بت کے سامنے ـــــ شاید لینن کی قبر کے پاس ـــــ کسی دن ـــــ شاید تب تک میں نارمل ہو جاؤں ـــــ"

"ہو سکتا ہے تب تک ہم ایک دوسرے سے بات کرنا سیکھ جائیں ـــــ"

میں نے دیکھا اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ایسے آنسو جن کا میری پشیمانی سے گہرا تعلق تھا!

دراصل میں تین سال روس میں محض پڑھنے کی غرض سے نہیں رہا بلکہ اس وجہ سے بھی ٹکا رہا کہ کسی طرح سونیا سے میرا سمجھوتہ ہو جائے۔ کسی طرح میں روس کو سونیا کی نظر سے دیکھنے اور سمجھنے لگوں۔ ہم دونوں کے درمیان جو ڈراپ سین ہو جاتا ہے وہ پردہ اٹھا رہے ـــــ میں نہیں جانتا تھا کہ سونیا کہاں رہتی ہے۔ میں یہ بھی اچھی طرح سے معلوم نہ کر سکا تھا کہ دراصل روس کیا ہے؟ ـــــ میں نے ہمیشہ سونیا کو تلاش کیا ہمیشہ روس کو سمجھنے کی کوشش سچی نیت سے کی۔ خاص کر جتنی بار بھی میں لینن گراڈ گیا میں نے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اس شہر میں چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے سونیا کو ضرور ڈھونڈ نکالنا چاہتا۔ دریاؤں، ہواؤں اور آدھی رات کے سورج کا یہ شہر عجیب طور پر مجھ پر اثر انداز ہوتا تھا۔ ہر بار یہاں پہنچتے ہی مجھے زکام ہو جاتا اور ساتھ ہی ساتھ میں مرضِ عشق میں مبتلا نظر آتا۔ ہر بار جب میں لاؤنچ میں سوار ہو کر پیٹر دی گریٹ کا محل دیکھنے جاتا اور لاؤنچ گلف آف فن لینڈ کے سمندری پانیوں میں چل نکلتی تو نارنجی شیشوں پہ سے سورج کی روشنی اندر مسافروں کے چہروں پہ منعکس ہوتی۔ ہر روسی لیونارڈ وِڈ ونچی کی تصویر بن جاتا۔ میں کسی اور زمانے میں کسی اور عہد میں کھسک جاتا جہاں میں دوستووفسکی کا احمق تھا، اس کا POSSESSED تھا۔ میں شہزادہ بھی تھا اور دیوانہ بھی۔ مجھ میں کسی پرانے پادری کی روح بھی تھی اور کسی رندِ مست کی آنکھیں بھی میرے جسم پہ لگی تھیں۔ لیکن لینن گراڈ میں سونیا مجھے کبھی نہ ملی ــــ شاید اس شہر میں کبھی وہ مجھے مل جاتی تو میں اس کا مرید ہو جاتا۔

ماسکو میں تعلیم حاصل کرنا ایک مسلسل عمل ہے۔ یہاں پڑھائی کلاسوں تک محدود نہیں بلکہ اپنے مضمون میں وسعت اور گہرائی پیدا کرنے کے لئے ہر وقت پڑھنا پڑتا ہے اتنی کڑی محنت کے بعد جو باقی وقت بچتا ہے وہ داریا اور میخل کی صحبت میں کٹتا۔ میخل طبعاً، عادتاً، فطرتاً شاعر تھا۔ پتہ نہیں وہ کس لئے فزکس میں پی ایچ ڈی کرنا چاہتا تھا جبکہ اس کے ہونٹ پنکھڑیوں کی طرح شاعرانہ اور سبز آنکھوں میں واڈکا بھری ہوتی تھی۔ داریا بہت مختلف تھا۔ اس کے نظریات میں میری طرح بڑی قطعیت تھی۔ اس نے میرے ساتھ اپنے ملک اور کمیونزم کو کبھی زیرِ بحث لانے کی کوشش نہیں کی لیکن وہ ہر مسئلہ کا علاج یا تو واڈکا یا لینن کی زندگی میں تلاش کر لیتا تھا۔ داریا کہا کرتا تھا کہ ان دونوں نے مجھے آج تک کبھی مایوس نہیں کیا۔

ہم تینوں کبھی کبھی اکٹھے کریملن جایا کرتے تھے۔ میخل ہمیں لینن کی قبر کے پاس اپنی نظمیں سنایا کرتا داریا باپ کے سے فخر سے یہ نظمیں سنا کرتا تھا۔ اس کی حضرت مسیح

جیسی صورت پر ایسے وقتوں میں بڑی حیا ہوتی۔

اس روز جب روس میں میرے قیام کو صرف دو مہینے رہ گئے تھے ہم تینوں سرخ چوک گئے۔ یہاں ہر وقت، ہر موسم میں زائرین آتے رہتے ہیں۔ کیمروں کی کلک کلک سنائی دیتی ہے۔ پکچر پوسٹ کارڈ جیسی یہ خوبصورت جگہ کبھی لوگوں سے خالی نہیں ہوتی۔ داریا جس کی عادت تھی کہ ہر بات پر مسکرا کر چپ ہو جاتا اور لمبی سوچ بچار کے بعد منہ کھولتا اس روز خوب بول رہا تھا۔

"میرا جی چاہتا ہے کہ ایک دن تمہیں واڈکا میں ڈبو دوں ــــ" داریا نے کہا۔

"کیوں؟ ــــ"

"جب تمہارے ہر مسام سے واڈکا نکلے گی تو تم خود بخود سچ بولنے لگو گے"۔

"کیا اب میں جھوٹ بولتا ہوں ــــ یعنی"

"نہیں تم جھوٹ نہیں بولتے لیکن جو سچ تم بولتے ہو وہ ہمارے لئے قابلِ قبول نہیں"۔ داریا نے مندی مندی آنکھوں سے کہا۔

"دیکھو لینن کی قبر کا سنگِ مرمر کس قدر ٹھنڈا ہے ــــ جس روز پہلی بار رقیب تمہاری محبوبہ کا بوسہ لیتا ہے اس روز کے بعد تمہاری محبوبہ کے ہونٹ کتنے سرد ہو جاتے ہیں تمہارے لئے ــــ"

میخل قبر کے جنگلے کے سامنے آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ وہ ہم دونوں کی گفتگو میں بالکل شامل نہیں تھا۔

داریا فزکس میں پی۔ ایچ۔ ڈی کر رہا تھا لیکن مجھے اس کی شکل دیکھ کر ہمیشہ لگا جیسے دراصل وہ پیرا سائیکولوجی کا طالب علم ہے۔ وہ کہیں اندر ہی اندر ٹیلی پیتھی، سائیکو کائنیسس کلیروائنس، ہپ ناسس پر کام کر رہا ہے۔ اس کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کا خوردبینی تجسس تھا حالانکہ اس کے ہونٹ شاذ ہی کھلتے تھے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"سچ بتانا سمرو۔ تمہیں ہمارا روس کیسا لگا؟ ــــ تمہارا ہر جواب میرے لئے قابلِ قبول ہوگا فقط دل رکھنے کے لئے جھوٹ نہ بولنا۔"

"ابھی میں وطن سے بہت دور ہوں ــــ تین سال کی جدائی نے وہاں کا رنگ نکھار دیا ہے۔ جب بھی میں روس کی تعریف کرتا ہوں مجھے لگتا ہے جیسے میں اپنے وطن کی حق تلفی کر رہا ہوں جیسے محبوبہ کے زانو پر سر رکھ کر اچانک بیوی یاد آنے لگتی ہے اور محبوبہ کی تمام خوبیاں ختم ہو جاتی ہیں ــــ بالکل ایسے ہی ــــ مجھے چند سال واپس جا کر اپنے وطن میں رہ لینے دو داریا ــــ پھر میں تمہیں روس کے بارے میں لکھوں گا۔"

"جھوٹ ــــ جھوٹ سراسر جھوٹ ــــ تمہیں روس پسند نہیں آیا۔"

"آیا ہے ــــ آیا ہے ــــ میں اگر چاہوں بھی تو باقی ماندہ ساری زندگی اسکے اثرات سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتا۔"

داریا نے اپنی دوربار آنکھوں سے مجھے دیکھا اور ہولے ہولے بولا ــــ "تمہیں معلوم نہیں سمرو ــــ روس دنیا کا مستقبل ہے۔ کوئی شخص بھی اپنے مستقبل سے نفرت نہیں کرتا لیکن کبھی کبھی ــــ سمرو تم جیسے احمق مستقبل سے خوف زدہ ہو کر حال کو تباہ کر دیتے ہیں۔"

میخل نے آہستہ آہستہ گنگنانا شروع کر دیا۔ اپنی جادو بھری ساحری آواز میں اس نے اپنی نظم سنائی :

"میرے دل کی گھاس پر ایک زرد ٹکڑا ہے
میں نے اسے آنسوؤں سے بہت سینچا
لیکن یہ گھاس کبھی ہری نہ ہوئی
یہ وہی جگہ ہے جہاں تم ایک شام کہنی ٹیک کر لیٹی تھیں
دل کا سارا لان سرسبز ہے

لیکن یہ زرد ٹکڑا سرسبز نہیں ہوتا
آنسو اس پر گرتے رہتے ہیں پھر بھی یہ زرد رہتا ہے
ہر رُت میں . . . ."

سونیا ــــ سونیا ــــ یہ لڑکیاں بھی کیا بلا ہیں۔ ایک پل ــــ کسی شام دل کے لان پہ زرد رنگ کا ٹکڑا چھوڑ جاتی ہیں جو کبھی تر و تازہ نہیں ہوتا ــــ

لینن کی قبر کے پچھواڑے سے قلعے کی سمت پہرے پر مقرر دو سپاہی بڑے تواتر سے ایک دوسرے کی جانب بڑھ رہے تھے۔ رنگین پگڑیوں جیسے گنبدوں والا آئی وان دی TERRIBLE گرجا گھر بغداد سے کاپی کر کے یہاں نصب کیا لگتا ہے

"جب تم پاکستان چلے جاؤ گے تو پھر ہم کس سے پوچھیں گے۔ بتاؤ ناں تمہیں روسی کیسے لگے؟ روس کو چھوڑو ــــ"

میں ان کو کیسے بتاتا میرے لئے تمام روسی سونیا کے باعث پیارے تھے۔ دیگ کا ایک ہی چاول کافی ہوتا ہے۔

"روسی بہت پیارے ہیں سب کے سب ــــ"

"یہ سب جھوٹ ہے سمرو ــــ سچ سچ بتاؤ تجزیہ کر کے ــــ ان کی ایک خصوصی بات ــــ" داریا نے جنونی نظروں سے مجھے دیکھ کر کہا۔

"روسی فرد پرست ہیں۔ ان کا سب کچھ لینن ہے حالانکہ ان کا سب کچھ کارل مارکس ہونا چاہئے تھا ــــ"

"پہلی بات یہ ہے سمرو کہ کارل مارکس تھیوری تھا۔ لینن نے اس کو عملی جامہ پہنایا۔ عمل بہر کیف قول سے بڑا ہوتا ہے۔ دوسری بات یہ الزام ہے اتہام ہے کہ روسی فرد پرست ہوتے ہیں ــــ یہ غلط چارج ہے۔ ہم لینن کی بہت عزت کرتے ہیں لیکن ہم لینن پرست نہیں ــــ"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"ہم بھی فرد پرست ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ ہم مانتے ہیں کہ فرد کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا۔ کوئی IDEOLOGY فرد کی مثال کے بغیر نہیں چل سکتی۔ تم لوگ مانتے نہیں ——"

"باتیں مت کرو سمرو داریا —— دیکھو اس طرف سپاہیوں کا پہرہ بدلنے والا ہے۔ پتہ نہیں اس منظر سے مجھے کیوں لگتا ہے جیسے یکدم موسم بدلنے والے ہوں۔" میخل نے فاصلے پر دیکھتے ہوئے کہا۔

"آدرش موجود ہو تو اس پر ہر وقت عمل کیا جا سکتا ہے ——"

"ہم مشرق والے —— شاہ عبداللطیف بھٹائی کے ماننے والے اس بات کو جان گئے ہیں داریا کہ جب آدرش کو اپنے وجود سے مثال بنانے والا ختم ہو جاتا ہے تو آدرش فقط قول میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ ہمارے پاس بھی خدا کا بھیجا ہوا قرآنی آدرش موجود ہے لیکن ہر دور میں، ہر عہد میں، ہر ملک میں قطب ولی ابدال آتے رہتے ہیں۔ وہی آدرش کو عملی جامہ پہنا کر سمجھاتے رہتے ہیں —— جب کمیونزم کے لینن آنے بند ہو جائیں گے تو کمیونزم بھی کتابوں کی زینت رہ جائے گا۔ پھر لوگ مانا تو اسے بھی کریں گے لیکن اس پر عمل نہیں کریں گے ——"

"روس کا ہر فرد لینن ہے۔ ہم سب اپنے مسلک پر رہبر کے بغیر بھی چلنے کی قوت رکھتے ہیں۔"

مجھے لڑکیوں کا وہ سکول یاد آ گیا جس میں لینن نے پناہ لی تھی اور جس کے باہر اب بھی لینن کا بت نصب ہے۔ میں نے داریا سے کہنا چاہا اگر تم فرد پرست نہیں ہو —— تو لینن کی یادوں میں ہل کیوں نہیں چلا دیتے؟ اس کے گھر کو میوزیم کیوں بنا رکھا ہے اس گھر میں جانے والے سیاح کو وہ پاسپورٹ کیوں دکھاتے ہو جس پر لینن یورپ گیا تھا اور جس میں وہ معمولی مزدور کے لباس میں نظر آتا ہے۔ وہ کیاری جو لینن کے بت کے

ارد گرد پھیلی ہے اور جس میں اہتمام سے سرخ جرینیم کے پھول اُگتے ہیں۔ اس میں پھولوں کی اتنی نگرانی کیوں؟

یہی تمام نشانیاں تو اس بات کی دلیل ہیں کہ کسی نہ کسی طرح فرد زندہ رہے۔ مثال زندہ ہو گی تو آدرش کے بے جان وجود میں گرم لہو دوڑتا رہے گا۔ کبوتر کے لئے مرمریں جسم کا لہو ضروری ہے ورنہ آدرش صرف ایسے لفظوں میں ڈھل جائے گا جن کو سمجھنا بہت مشکل ہو گا۔

"چلو گم میں چلیں —— یہ سرخ چوک اتنا بڑا ہے کہ اس میں ہمیشہ ہوائیں چلتی ہیں اور مجھے ہواؤں سے ڈر لگتا ہے۔" میخل یکدم اٹھ کھڑا ہوا۔

سرخ چوک کے تینوں طرف بڑی اونچی عمارتیں ہیں۔ ایک طرف قلعہ ہے دوسری جانب رنگ برنگی پگڑیوں والا گرجا ہے اور تیسری جانب گم محل ہے جس میں آج کل بادشاہ شہزادے نہیں رہتے بلکہ ایک بڑا شاپنگ سنٹر آباد ہے

"سمرو —— پیلی مٹی کو ضرور اس جگہ کو یاد کرنا —— اتنے زائرین —— اتنے عقیدتمند یا تو مکہ معظمہ میں آتے ہیں یا یہاں —— یہ دونوں جگہ عام آدمیوں کے قدموں سے آباد ہیں —— تمہارا مکہ —— اور ہمارا مکہ!"

ہم تینوں خاموشی سے گم کی طرف چلنے لگے۔ کچھ ناتجربہ کار سیاحوں نے ہمارے سمیت اس پتھریلے چوک کی تصویریں لیں اور مسکرا کر ہمیں اپنی خوش دلی کا احساس دلایا ——

"سمرو۔ مجھے سندھ کے خاص سے تھوڑی سی مٹی بھیجنا ——" میخل نے کہا۔

"کیوں۔ مٹی کا کیا کرو گے؟"

"چاند کی مٹی کیوں لائے تھے زمین پر —— دیکھنا پڑتا ہے کہ روس کی مٹی اور پاکستان کی مٹی کے کیمیائی اجزا کیا ہیں۔"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"اچھا تو کیمیکل فرق نکال کر کیا کرو گے ــــ ؟" میں نے سوال کیا۔

"پھر سمجھ جاؤں گا کہ سندھ میں کیوں سمرو پیدا ہوتے ہیں اور موسکاؤ میں کیوں منگل پیدا ہوتے ہیں۔"

گم کے بازار میں بہت بھیڑ تھی۔ موٹی روسی عورتیں بھاری بھاری سفری تھیلے چیز اور سستا کپڑا خرید رہی تھیں۔ ہم تباکو کی تلاش میں دوسری منزل پہ گئے اور وہاں سے ہم نے نچلی منزل کی طرف دیکھا۔ ایک سیلاب تھا جو دکانوں میں آ جا رہا تھا۔ ضرورت کی چیزیں ــــ ہر ملک میں ہر جگہ عام آدمی نے ساری معیشت کو ــــ CONSUMERS GOODS کے تابع کر رکھا تھا ــــ حکومتیں خائف کر رکھی تھیں . . . . !

"تم نے سمرقند نہیں دیکھا ؟ ــــ" منگل نے پوچھا۔

"نہیں !"

"دوشنبے، سمرقند، تاشقند، بخارا ــــ یہ روس کی الف لیلوی میراث ہیں۔ ان شہروں میں اب بھی شہزادیاں پھرتی ہیں۔ یہاں اب بھی لمبا رنگوں کے گاؤن پہنے، لمبی چوٹیاں لٹکائے ترچھی آنکھوں والی لڑکیاں انگور، خوبانی اور آلو بیچتی ہیں۔ سمرو اپنے دیس لوٹنے سے پہلے وہاں ضرور جانا۔ سفید روس کا اور مزاج ہے اور موسم ہے۔ جنوب کی آب و ہوا اور ہے جیسے اب بھی ریگستانی چوک سے اونٹوں پہ قافلے اٹھتے ہیں ــــ جب تمہیں ماسکاؤ لینن گراڈ بالکل بھول جائیں گے پھر بھی تمہیں سمرقند یاد رہے گا ــــ جیسے بچپن کا دیکھا ہوا خواب ــــ" منگل شاعر تھا اور خوابوں سے محبت کرتا تھا۔

"میں تب چھوٹا تھا جب تمہارا خانم پاکستان آئی تھی۔ میں نے اسے بھی نہیں دیکھا۔"

"تم ضرور جاؤ ــــ وہ حصہ تمہارے قریب ہے ــــ تمہیں اسے سمجھنے میں آسانی

ہو گی اور اسی رعایت سے روس کو سمجھنے میں آسانی ہو گی۔"

پتہ نہیں یہ منگل کا اصرار تھا کہ میری اندرونی آرزو لیکن کچھ دیر کے بعد میں جنوبی روس کے لئے روانہ ہو گیا۔

میں بڑی امید کے ساتھ تاشقند کے لئے روانہ ہوا تھا۔ میں نے بچپن سے تاجکستان ازبکستان کو دیکھنے کی آرزو دل میں ایسے پال رکھی تھی جیسے کنگارو مادہ اپنے اسپرد برابر بچے کو اپنی تھیلی میں پالتی ہے لیکن ائیرپورٹ پر زرد ہواؤں میں ریت تھی۔ گرمی، غریبی اور ان دونوں سے پیدا ہونے والا احساس کمتری ہر آنکھ سے ٹپک رہا تھا۔ یہ لوگ زردی مائل سفید منگول تھے۔ ان کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کا حجاب تھا جو میں سمجھ نہیں سکا۔ کبھی یہ لوگ سفید روس پہ حملہ آور ہوا کرتے تھے ــــ دھاڑے مارتے تھے ــــ سمرقند ــــ تاشقند ــــ بخارا ــــ

بہ خالِ ہندوش بخشم سمرقند و بخارا

جب بادشاہ عنایات کرتے تھے تو پھر خزانوں کا منہ کھول دیتے تھے۔ اسوقت جب ہندو محبوبہ کے تل پہ تاشقند و بخارا قربان کئے ہوں گے یہ ستم ایجاد شہر خانقاہ کی شکل کے نہ ہوں گے بلکہ یہاں کی چہل پہل دولت و ثروت سے دھرتی کا کلیجہ ہل جاتا ہو گا۔ اب سمرقند اور تاشقند نور جہاں کے مقبرے کی شکل کے آثار الصنادید تھے۔

الغ بیگ کی OBERVATORY تھی جس میں زمین کھود کھود کر نیچے تک زاویہ اور ڈگریوں کا حساب لگا کر ستاروں کو دیکھنے کا انتظام تھا۔ بی بی جان کی مسجد ریگستانی چوک ــــ تینوں مسجدیں جن کے سامنے سے کبھی ہندوستان ترکی ایران کے لئے قافلے جاتے ہوں گے ــــ یہاں تیمور لنگ کا مقبرہ تھا ــــ

سب کچھ ماضی تھا ــــ حال میں صرف کھنڈر تھے۔ یہاں وہ خوبصورت میوزیم نہیں تھے جو لینن گراڈ اور موسکاؤ کی زینت تھے ــــ وہ آرٹ کے نمونے بھی ماضی کے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

آئینہ دار تھے لیکن وہ زندہ تھے جی رہے تھے۔ وہ میوزیم ماضی کا حصہ نہیں لگتے تھے یہاں علی شیر نوائے میوزیم سے لے کر تمام تاریخی عمارتوں تک ایک اداسی محیط تھی۔ ایک کسمپرسی ایک دکھ ـــــ پتہ نہیں سمرقند اور تاشقند میں مجھے کیوں سڑکوں پہ مسلمانوں کا زوال نظر آیا! جیسے وہ اٹھنا چاہتے تھے لیکن انہیں معلوم نہ تھا کہ کیسے اٹھا جاتا ہے، جیسے وہ اپنے آپ کو پہچاننے کی کوشش کر رہے تھے اور اس کوشش میں اور الجھتے جا رہے تھے۔ خاکِ مذلت سے اٹھنے کے لئے انہیں کسی ایسے دست گیر کی ضرورت تھی جو ان کی طرح افتادہ تر نہ ہو۔

روس کے جنوب میں پہنچ کر مجھے مایوسی ہوئی ـــــ یہاں ماضی کی شان و شوکت نہیں تھی اس کا نوحہ موجود تھا۔ ہر جگہ ہر چہرے پہ ـــــ میں نے گھبرا کر یہاں کے تاریخی مقامات دیکھنے بند کر دیئے۔ کتب خانوں میں جانے لگا۔ ان کی مسجدوں کو دیکھنے لگا۔ میں ان کے قلمی اثاثے میں اپنی وراثت کے آثار تلاش کرنا چاہتا تھا۔ یہیں انسٹی ٹیوشن آف اورینٹل سٹڈیز میں مجھے خانم شمع رو ملی۔

خانم شمع رو نے لہریئے رنگوں کا گھٹنوں سے نیچے تک ڈھیلا سکرٹ نما ٹیڑنی توب پہن رکھا تھا۔ اس کے لمبے بال لمبی چوٹی میں لٹک رہے تھے اور سر پہ سبز رومال بندھا تھا۔ خانم شمع رو سفید گاچینی کے رنگ کی گڑیا تھی۔ اس کے رخسار کی ہڈیاں اونچی اور آنکھیں ابروؤں کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ میں ایک الماری کھولے انہماک سے فصوص الحکم کا نسخہ دیکھ رہا تھا کہ وہ میرے پاس آئی۔ اس کے پیروں میں ایسے جوتے تھے جن کا کوئی شور نہیں ہوتا۔ مسلمان عورت کے جوتے!

"فرمایئے کیا میں آپ کی کچھ مدد کر سکتی ہوں؟" اس نے رواں کتابی فارسی میں کہا۔

ازبکستان کے لوگ اب بھی شاعر طبع ہیں۔ یہ ایرانی لب و لہجہ میں فارسی نہیں بولتے بلکہ ایسی فارسی استعمال کرتے ہیں جو ہمارے ہاں نصابوں میں ملتی ہے۔ عام باشندوں

کو بھی کئی کئی فارسی شعر زبانی یاد ہوتے ہیں جنہیں وہ برموقع استعمال کرتے رہتے ہیں۔

"میں کسی ایسی کتاب کی تلاش میں ہوں جو کسی روسی سیاح نے لکھی ہو اور جس میں برصغیر کے واقعات بیان کئے ہوں۔"

وہ کچھ دیر اپنے موٹے رجسٹر کو دیکھتی رہی۔ پھر ایک نازک سی سیڑھی پہ چڑھ کر اس نے سکرٹ کے کھیسے سے عینک نکال، لگائی اور ایک کتاب کو جھاڑتی ہوئی نیچے اتر آئی۔

"یہ دیکھئے عبدالرزاق سمرقندی کی کتاب ـــــ سفر ہندوستان و شرح غرائب ـــــ"

میں شمع رو کے سامنے شرمندگی محسوس کر رہا تھا کیونکہ وہ سمجھتی تھی کہ میں مسلمان ہونے کے ناطے سے فارسی خوب سمجھتا ہوں۔ میں اسے سمجھانا چاہتا تھا کہ اب برصغیر کے مسلمان فارسی کی جگہ انگریزی میں گفتگو کرتے ہیں۔ لیکن اس روسی لڑکی کے سامنے جو اب بھی فارسی بولتی تھی یہ کہنے کا حوصلہ نہ ہوا

شمع رو سے کتابوں کی باتیں کرنے کے بعد میں کتب خانے سے نکل آیا۔ شمع رو نے مجھے دوسرے دن ہوٹل ستارا میں دوپہر کے کھانے پہ مدعو کیا۔ میں وقت سے کچھ پہلے ہوٹل کی کھلی ٹیرس میں پہنچ گیا۔ ہوائیں سستی اور تواتر کے ساتھ چل رہی تھیں۔ ہوٹل کی میزوں پر کپڑے اڑ رہے تھے۔ یہاں کے تاریخی مقامات کو یہ ہوائیں ہولے ہولے چاٹ رہی تھیں۔ سب کچھ کھنڈر میں بدل رہا تھا ـــــ یہاں کی نئی عمارتیں تمام کنکریٹ کے ڈھانچے تھے جن کا اسلامی عمارت گری سے کوئی تعلق نہ تھا۔ یہاں کے میوزیم شمالی میوزیموں کے مقابلے میں فقیرانہ تھے۔ اپنے ماضی کی یاد میں گم گشتہ و حیران!

یہاں کے بچے حیدرآباد کے بچوں کی طرح غریب اور متجسس تھے۔ غریب آدمی ہمیشہ ان چیزوں کو غور اور تجسس سے دیکھتا ہے جن سے ایک آدمی دوسرے آدمی سے ممتاز ٹھہرتا ہے۔ کار ـــ کپڑے ـــ جوتے ـــ وڈیو ـــ سگریٹ ـــ ڈبی بکس

www.iqbalkalmati.blogspot.com

یہاں بھی گرم ملک کے باشندوں کی طرح لوگ متجسس تھے اور دیکھتے تھے ــــــ غور سے اس طرح شمالی روس میں کوئی بچہ نہیں دیکھتا۔

خانم شمع رو کچھ دیر سے آئی لیکن اس کے آتے ہی لذیذ تکے، نفیس نان اور سمرقندی پلاؤ آ گیا۔ کھانا دیکھ کر روح کے تمام دکھ دور ہو گئے۔ میں نے رغبت کے ساتھ ندیدے بچوں کی طرح کھانا شروع کر دیا۔

ٹیرس سے نیچے دف بجاتی لڑکیوں کے گھیرے میں ایک مسلمان لڑکی عیسائی دلہنوں کے لباس میں ہوٹل کی جانب آ رہی تھی۔ شادی کے مہمانوں میں کچھ مرد ناچ رہے تھے اور نفیری کی آواز میں مشرقی سُر تھے۔

"آپکی شادی ہو چکی ہے عثمان سمرد؟ ــــ"

"جی نہیں ــــ لیکن لڑکی ماں پسند کر چکی ہے۔ جب میں واپس لوٹوں گا تو شادی ہو گی۔"

خانم شمع رو نے فارسی میں شعر پڑھا جو میں سمجھ نہ سکا۔

"اور آپ کی؟"

"میں ابھی سوچ رہی ہوں عثمان سمرد کہ کس سے شادی کروں؟"

"اتنی لمبی سوچ کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"میں اپنی بوڑھی نانی کے ساتھ رہتی ہوں۔ وہ پرانے خیال کی عورت ہے۔ اس کا خیال ہے مجھے کسی ازبک مسلمان سے شادی کرنی چاہئے اور میں کسی سفید روسی سے شادی کرنا چاہتی ہوں جو ماسکاؤ میں رہتا ہو۔ جینز پہنتا ہو اور جس کی ڈاڑھی مکئی کے بالوں جیسی سنہری ہو ــــ"

"نانی ٹھیک کہتی ہے ــــ"

"وہ ابھی پچھلے سال حج کر کے آئی ہے میرے لئے بھی آبِ زمزم لائی تھی میں نے

تو وہ پانی نہیں پیا۔ لیکن نانی اسے سنبھال کر رکھتی ہے۔ وہ چاہتی ہے میں بھی حج کروں اور کسی ازبک سے شادی کروں۔"

"تمہارا آئیڈیل کون ہے شمع رو ــــ ازبک کہ سفید روسی؟ ــــ"

شمع رو بہت خوبصورت تھی۔ اس کا رنگ بال آنکھیں تمام تباہ کن تھے پھر بھی وہ جیسے ریتلی مٹی پر پانی کی آس میں بیٹھی تھی۔

"دیکھو ناں۔ سفید روسی ہم سے خوبصورت ہوتے ہیں۔ پھر ان کی زبان روسی ہے ہماری قومی زبان۔ ہم لوگ تو فارسی بولتے ہیں۔ پھر وہ شمال میں رہتا ہو گا۔ شادی کے بعد میں موسکاؤ جا بسوں گی یا شاید لینن گراڈ چلی جاؤں ــــ سچ بتانا سفید روسی ہم سے زیادہ مہذب ہیں ناں ــــ تمہیں وہاں کے روسی زیادہ اچھے لگتے ہوں گے؟ ــــ"

"شمالی روسی ــــ اور جنوبی روسی ــــ"

"کیسے ہو سکتا ہے ــــ کیسے ممکن ہے بھلا سفید روسی کے مقابلے میں کوئی کیسے ہمیں پسند کر سکتا ہے خواہ مخواہ ــــ"

"ہو سکتا ہے ہو سکتا ہے ــــ کیونکہ ہم لوگ ــــ متعصب ہوتے ہیں ہمیشہ اپنوں کو غیروں پر ترجیح دیتے ہیں۔"

"تمہارا رشتہ اسلام سے کٹ گیا ہو گا لیکن تم کعبے کے بتوں کی طرح وہیں کے ہو جہاں کے ہم ہیں ــــ" میں نے کہا۔

وہ چپ چاپ نیچے دیکھنے لگی جہاں براتیوں کے گھیرے میں دلہن پھولوں کا گلدستہ لئے مسکرا رہی تھی۔ ازبک مسلمان کی ازبک دلہن۔

میں خانم شمع رو کو ایک واقعہ سنانا چاہتا تھا لیکن چپ رہا کیونکہ وہ روسی زبان کو فارسی سے بہتر سمجھتی تھی۔ شمالی سفید روسی کو اپنے سے شرف میں اعلیٰ جانتی تھی اور موسکاؤ اور لینن گراڈ کے شہر اس کی نظر میں بہشت سے کم نہ تھے۔ اس کا حال اس غریب پتوکی میں

نہ ہنسنے والی لڑکی کا تھا جو اسلام آباد کو اپنی زندگی کی معراج سمجھتی ہو۔ میں اسے بتانا چاہتا تھا کہ وطن کی سرحدوں سے آگے، رحمی رشتوں سے علاوہ بھی ایک رشتہ ہوتا ہے جس میں چودہ سو سالوں سے خود بخود جان پڑتی رہتی ہے۔ جب انسان اپنوں میں گھرا ہوتا ہے اس کے اردگرد رشتے ہی رشتے ہوتے ہیں تو اس چودہ سو سال پرانے پیوند کا احساس نہیں ہوتا لیکن جس وقت انسان کسی اجنبی فضا میں کسی مسلمان سے ملتا ہے تو دونوں قلب عجیب گرمی سے تازہ ہو جاتے ہیں اور آپس میں ایسے قرب کا احساس ہوتا ہے جو کسی اور کے ہمراہ محسوس نہیں ہوتا۔

دوشنبے سے قریباً ستر کلومیٹر شمالی پہاڑوں میں اس علاقے کا بجلی گھر تعمیر کیا گیا ہے اس کو دیکھنے کے لئے میں وہاں گیا تھا۔ دریا کافرنیاں کے ساتھ ساتھ سڑک بل کھاتی اوپر پہاڑوں کی طرف جاتی ہے۔ راستہ میں کھلے آراستہ کھیت، خرمانیوں سے لدے درخت اور زمین پر پھیلے ہوئے تاکستان نظر آتے ہیں۔ کافرنیاں کا نیلگوں پانی پتھروں سے ٹکراتا سر پھوڑتا نشیب کی جانب جاتا نظر آتا ہے۔ جس وقت میں ہائیڈرو الیکٹرک سٹیشن دیکھ کر لوٹ رہا تھا تو ہمارے ڈرائیور نے کار میں پانی بدلنے کے لئے گاڑی روکی۔ ہمارے پیچھے ہی ایک کھلی چھت والا ٹرک آ کر رک گیا۔ ڈرائیور اس چشمے پر پانی بھرنے کے لئے چلا گیا جو سڑک کے کنارے ہی بہہ رہا تھا۔

کھلے ٹرک میں دیہاتی لوگ گہرے رنگوں کے سواتی قسم کے کھلے کرتے ٹخنوں پر تنگ پائنچے والی شلوار پہنے ہوئے تھے۔ لڑکیوں کی شکلیں افغانی سواتی قسم کی تھیں۔ اور ان کے سروں پر چادریں تھیں۔ ہم بھی ٹیکسی سے اتر کر چشمے میں منہ ہاتھ دھونے لگے غالباً تمام دیہاتی لڑکیاں کسی شادی پر جا رہی تھیں کیونکہ ان کا لباس خوبصورت اور نیا تھا وہ دف بجاتی ہوئی گا رہی تھیں۔ جس وقت میں چشمے کے برفیلے پانی میں انگور کے کاسنی خوشے دھو رہا تھا۔ ایک بوڑھا آدمی شادی کے گروہ سے کٹ کر میری طرف آیا۔

"یہ کہاں سے آئے ہیں؟" باباجی نے ہمارے ڈرائیور سے سوال کیا۔

تھوڑی سی فارسی کے سہارے میں اس کی بات سمجھ گیا۔

"پاکستان ــــ آغا از پاکستان آمدم ــــ"

"بلے بلے..... ہندی نیست" باباجی نے پوچھا۔

"ناں ہندی نیست ــــ مسلمانم ــــ"

"الحمدللہ ــــ الحمدللہ ــــ"

بوڑھے کے چہرے پر چینی قسم کی داڑھی تھی۔ اس کا چہرہ میرے داداجان کی طرح جھریوں سے بھرا تھا۔ اس کی آواز دھیمی تھی لیکن اب یکدم وہ مجھے جوان نظر آنے لگا۔ اس کی چھاتی تن گئی۔ آنکھوں میں خوشی چمکنے لگی۔

"واللہ مسلمان میہمان ــــ"

اس نے کتنے سارے ترکی نام لئے اور سڑک کے پار کھڑی لڑکیوں کو پکارا۔

"مسلمان میہمان ــــ"

لڑکیوں نے جھولیاں پھیلا کر مجھے پھل پیش کئے۔ وہ ہمارے پہاڑی علاقوں میں بسنے والی لڑکیوں کی طرح شرمیلی اور کھی کھی کر کے ہنسنے والیاں تھیں۔

بوڑھے بابا نے میرے خالی بائیں ہاتھ کو اٹھایا۔ اپنے ہونٹوں سے لگایا اور آہستہ آہستہ کوئی سورت پڑھی۔ پھر اس کی آنکھ سے ایک آنسو ڈھلک کر میرے ہاتھ پر گرا۔

"مسلمان میہمان ــــ مسلمان میہمان"

پتہ نہیں کیوں اس آنسو نے میری ساری روح بھگو دی۔ ایک مرتبہ میری بڑی بہن سخت بیمار ہو گئی تھیں۔ میں جمعرات کی ساری رات شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کے دربار میں بڑے دروازے کا کنڈا پکڑ کر کھڑا رہا تھا ــــ اس رات میرے دل پر ایسا ہی گریہ طاری تھا جو اس آنسو سے موجزن ہوا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بابا جی نے اپنی پوتیوں نواسیوں بیٹیوں کو حکم دیا کہ وہ میرے گرد دائرہ بنا کر ناچیں اور دف بجائیں۔ پہلے تو لڑکیاں کچھ لجائیں شرمائیں لیکن جب بابا جی نے خود دف پکڑ کر بجانا شروع کر دیا تو تمام عورتوں لڑکیوں نے میرے گرد دائرہ بنا کر ناچنا شروع کر دیا۔ میں دم بخود تھا۔ بابا سورتیں پڑھ کر میرے سر پہ پھونک رہا تھا، مرد گا رہے تھے۔ ڈرامہ [illegible] کی ڈال رہا تھا۔

ہم سب مسلمان ہونے کے ناطے سے یکدم ایک گھرانہ ایک برادری بن گئے تھے۔ کافرِ خیال کے اس واقعے نے تمام نظریات، تمام ازم، تمام سیاسی سوجھ بوجھ کو خاک میں ملا دیا۔ اور میں دوشنبے کی اس سڑک سے مشرف بہ اسلام ہو کر ایسے لوٹا جیسے پہلی مرتبہ میں نے روشنی دیکھی ہو۔

آخری بار مجھے سونیا پشکن کے گھر کے سامنے ملی ــــ اچانک۔

"جنوبی روس دیکھ آئے ہو ــــ؟"

"ہاں۔ لیکن تمہیں کیسے معلوم ہوا؟ ــــ"

"مجھے منتظر رہنا تھا ــــ وہ تمہارا قصبہ اور اس سے متعلق ــــ"

"اچھا ــــ مجھے سمرقند پہ اپنا [illegible]"

"وہاں کا کیا پسند آیا؟ ــــ بی بی جان کی مسجد کہ علی شیر نوائی میوزیم ــــ؟"

"مجھے ایک بوڑھا ازبک پسند آیا جس کی داڑھی بالکل سفید اور جس کا سینہ داڑھی سے بھی زیادہ منور تھا ــــ"

"اور کیا پسند آیا؟"

"وہاں کے تربوز پسند آئے ــــ بے حد لذیذ تھے۔"

سونیا اہم تاریخی مقامات کے متعلق پوچھ رہی تھی۔ وہ انسان کے بنائے ہوئے مظہروں کے بارے میں جاننا چاہتی تھی۔

"تربوز، انگور، انار تو تم یہاں بیٹھ کر بھی کھا سکتے ہو ــــ" سونیا نے چڑ کر کہا۔

"اس طرح نہیں سونیا ــــ کئی سو سال پرانے ظروف میں سجے ہوئے ہیں۔ تازہ تل لگے نان ــــ سینڈوری قہوہ ــــ ساتھ تاشقندی ہوائیں ــــ سمرقندی ہوائیں ــــ مجھے لگتا تھا ہر لحظہ ــــ میں کسی کارواں کے ساتھ جنوب کو جانے والا ہوں ــــ فضا میں گھنٹیوں کی صدائیں تھیں ــــ ریت پر اونٹوں کے پیروں کے نشان تھے.....۔"

"تم دراصل انحطاط پسند ہو ــــ تم ہمیشہ ماضی کے رومان میں رہنا چاہتے ہو ــــ بغداد ہو یا بخارا ــــ سمرقند ہو یا دوشنبے ــــ تم میں اس جذبے کی کمی ہے جس سے انسان میں کچھ کرنے کی امنگ پیدا ہوتی ہے۔ جس کے طفیل وہ خود بھی بڑا ہوتا ہے ملک کو بھی قد آور کرتا ہے ــــ تم میں بڑائی کا احساس نہیں۔"

میں نے کسی نو مسلم کے جوش سے نعرہ لگایا ــــ "اللہ اکبر ــــ"

"کیا کیا کیا ــــ؟"

"میں نے کہا صرف اللہ بڑا ہے باقی سب بڑائیاں بڑائی کی کوششیں ہیں۔ انفرادی اور مجموعی ــــ"

کچھ دیر وہ چپ رہی۔ پھر اٹک اٹک کر بولی ــــ "اور یہاں ــــ؟ یہاں کا کیا اچھا لگا ــــ؟"

یہ ایسا ہی سوال تھا جیسے کوئی گاؤں کا چوہدری اپنے کمی سے پوچھے۔ "بتا بھئی تجھے ہمارے ڈیرے پہ کونسی چیز اچھی لگی ہے ــــ بس صرف ایک چیز بتانا، صرف ایک ــــ"

شاید وہ مجھ سے اپنا نام سننے کی آرزومند تھی لیکن میرے ہاتھوں پہ ابھی بابا جی کا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

آنسو تر تھا۔

"مجھے دوستوفسکی کا سادہ اور خوبصورت گھر پسند آیا ——— جانتی ہو اگر وہ صرف جہنم کی اتنی جامع تعریف ہی چھوڑ جاتا جو اس نے چھوڑی ہے تو ہمیشہ زندہ رہتا۔"

"کیا تعریف کی ہے اس نے جہنم کی؟" سونیا نے سوال کیا۔

"تمہارا دوستوفسکی کہتا ہے جس شخص میں محبت کرنے کی صلاحیت نہیں وہ دوزخ کی آگ میں جلتا رہتا ہے۔"

"اس کے علاوہ؟ ——— اور ———؟" اس نے پُرامید نظروں سے میری جانب دیکھ کر کہا۔

"پاکستان جانے سے پہلے ضرور بتاؤں گا سونیا ———"

"نہیں۔ ابھی بتاؤ ———"

"ابھی نہیں بتا سکتا ناں ورنہ پاکستان نہیں جا سکوں گا ———"

ہم دونوں اکٹھے پشکن کے گھر میں داخل ہو گئے جس کے پہلے کمرے میں ایک کھڑکی پر ایک چھیاسی برس کی بوڑھی عورت بیٹھی تھی۔ اس کے سر پر لیس کا سکارف تھا۔ وہ ہمیں سب سے پہلے پشکن کی لائبریری میں لے گئی ——— وہ ٹھہر ٹھہر کر انگریزی میں بولی ———

"یہ پشکن کی لائبریری ہے۔ پشکن روس کا وہ شاعر ہے جس نے روسی زبان کو ادبی بنایا۔ وہ ایک ایسا شعلہ نوا شاعر تھا جو حقیقت سے کبھی دور نہیں ہوا۔ یہ اس کی لائبریری ہے۔ یہ اس کا میز ہے ——— یہ اس کا وہ قلم ہے جس کے ساتھ اس نے جلاوطنی کے دور میں نظمیں لکھیں۔ یہاں اس صوفے پر اسے لٹایا گیا۔ جب وہ اپنی بیوی نتالیا کی خاطر ڈوئل میں زخمی ہوا ——— کیا آپ جانتے ہیں کہ پشکن کی موت کیسے واقع ہوئی؟"

"نہیں ———" میں نے نفی میں سر ہلایا۔

وہ ہمیں پشکن کے بیڈ روم میں لے گئی۔ پھر اس نے وہ چھوٹا سا کمرہ دکھایا جس میں پشکن، اس کی بیوی نتالیا، بیوی کی دو بہنیں اور ایک بہن کیتھرین کا فرانسیسی شوہر رہتا تھا۔ گھر اتنا بڑا نہ تھا جس میں اتنے سارے لوگ سما سکتے۔ شاید اسی طرح بہت قریب رہنے کے باعث ہی کیتھرین کا شوہر پشکن کی بیوی پہ عاشق ہو گیا۔ پشکن کو دربار سے منسلک رہنے کا شوق نہ تھا۔ وہ اپنی زندگی کسی دیہات میں ادبی سرگرمیوں میں گزارنا چاہتا تھا لیکن نتالیا دربار کی محفلوں کی جان تھی ——— اسی چھوٹے سے گھر سے یہ خوبصورت بہنیں خوبصورت گاؤن پہن کر دربار روانہ ہوتی ہوں گی اور پشکن اپنی لائبریری میں بیٹھا سکاٹ بائرن کا مطالعہ کرنے میں مصروف رہتا ہو گا۔

پھر دربار کے لوگوں نے پشکن کو ان باتوں سے آگاہ کیا ہو گا جو نتالیا اور جورجیس کے مابین لذت کا باعث تھیں۔ جورجیس کو پشکن نے غیرت کے باعث ڈوئل میں للکارا اور جورجیس جو فوج میں تھا پشکن پر غالب آیا۔ پشکن کو زخموں سمیت اس صوفے پر لا کر ڈال دیا گیا جس کے اردگرد کتابیں تھیں۔ ایسی کتابیں جن کو پڑھنے کا ابھی وقت نہیں آیا تھا۔

ایسی کتابیں جو پڑھی جا چکی تھیں لیکن ذہن سے اتر گئی تھیں۔ ایسی کتابوں کے درمیان جو اس کے ادبی تسلسل کا ایک حصہ تھیں۔ پشکن نے جان دیدی۔

پشکن جس میں ایسے سینا کے بسنے والوں کا لہو تھا کیونکہ اس کی ماں ہنی بال کی بیٹی تھی اور ہنی بال، پیٹر دی گریٹ کا غلام تھا ——— پشکن نے مرنے سے پہلے ضرور سوچا ہو گا کہ کبھی کبھی انسان کو ایسی باتوں کے لئے بھی مرنا پڑتا ہے جو اس کے لئے بالکل اہم نہیں ہوتیں۔

ہم تینوں بہت اداس بیرونی دروازے تک پہنچے۔ فضا میں پشکن کی آخری سانسیں تھیں۔ چھیاسی سالہ روسی عورت کی انگریزی ختم ہو چکی تھی۔ اب وہ سونیا کے

ساتھ روسی میں باتیں کر رہی تھی اور کبھی کبھی مجھے مسکرا کر دیکھ لیتی تھی۔

دروازے کے پاس پہنچ کر اس نے سونیا سے روسی میں پوچھا — ''اس سے پوچھو سونیا۔ کیا وہاں سردی پڑتی ہے جہاں یہ رہتا ہے؟ —''

میں نے اس کی بات سمجھ کر کہا — ''نہیں ماں۔ ہمارے ملک میں تو ہمیشہ سورج چمکتا ہے۔ قریباً سارا سال گرمی پڑتی ہے —''

تو پھر تمہاری ماں کے جوڑوں میں تو درد نہیں ہوتا ہوگا —''

''نہیں ماں — اللہ سائیں کی مہربانی ہے اس کے جوڑوں میں بھی درد ہوتا ہے۔ کیونکہ یہی بڑھاپے کا عمل ہے۔''

بوڑھی عورت نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا — ''بیٹے تو نے میرا بڑا دکھ دور کر دیا۔ میں سمجھتی تھی جو گرم ملکوں میں رہتے ہیں ان کے جسم میں درد نہیں ہوتا — میں انہیں خوش قسمت سمجھتی تھی۔ اب پتہ چلا کہ میرے حضرت عیسیٰ کا نظام ہر جگہ ایک سا چلتا ہے۔ ٹھنڈے گرم ملکوں میں ایک سا —''

''تسوے دانیا ماں —''

''تسوے دانیا — دیکھو ہر وقت خدا کو یاد رکھا کرو — دیکھتے نہیں خدا نے پشکن کو کیسی شہرت دی۔ لازوال، اور پھر اسے کیسی دکھ بھری موت کے حوالے کر دیا — وہ سب کچھ کر سکتا ہے کرتا ہے — ٹھنڈے ملکوں میں بھی اور گرم ملکوں میں بھی —''

جب ہم مڑنے لگے تو وہ اپنی لکڑی کی کرسی پر جا بیٹھی اور کسی اور سیاح کے انتظار میں گھٹنوں پر مکیاں مارنے لگی۔

''اب تو میں گھر جانے والا ہوں سونیا — کیا اب بھی تم مجھے نہیں بتاؤ گی تم کہاں رہتی ہو؟''

''اب کیا فائدہ ہمرو — اب تو تم گھر ہی چلے جاؤ گے —''

وہ میرے پاس سے اچانک ہاتھ ہلاتی روانہ ہو گئی۔ ایک دوسرے کو چھونے چومنے لپٹنے کا موقع قریب آ کر آگے چلا گیا جیسے رات کے وقت کار کی بتیاں کھمبے کو روشن کر کے آگے نکل جاتی ہیں۔

شاید اسے میخل سے میری فلائیٹ کا پتہ چلا کیونکہ وہ مجھ سے پہلے ائرپورٹ پہ موجود تھی۔ میرے ساتھ داریا اور میخل ٹیکسی سے اترے لیکن سونیا کو منتظر پا کر جلد ہی رخصت ہو گئے۔ ان دونوں نے جس وقت مجھ سے ہاتھ ملائے تو پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ وہ میرا ہاتھ اپنے ساتھ ہی لے جا رہے ہیں۔ میخل کی آنکھوں میں نمی تھی اور داریا اپنی مونچھوں کے بال منہ کے اندر رکھے انہیں چبا رہا تھا۔ ہم نے کوئی الوداعی جملے استعمال نہ کیے۔ خط لکھنے لکھانے کی فرمائش نہ کی اور چپ چاپ رخصت ہو گئے۔

سونیا کے پاس میں سامان بک کرنے، پاسپورٹ جمع کرانے اور فلائٹ کا ٹائم پوچھنے کے بعد پہنچا۔ شام کے وقت عمارتوں میں جلی بتیاں بہت اداسی پیدا کرتی ہیں۔ حسب معمول ائرپورٹ پر بہت رش تھا۔ کوئی فلائٹ نئی نئی آئی تھی۔ اس پر سے افریقہ کے حبشی کندھوں پر گٹار لٹکائے جینز پہنے پیروں میں فلیٹ پہنے کلارنٹ کے سروں میں ہنستے اوپر والی سیڑھیوں سے اتر رہے تھے۔ سونیا دونوں مٹھیاں بھینچے منہ پکائے صوفے پر آگے ہو کر بیٹھی تھی۔

''کبھی پاکستان آؤ تو میرے پاس ٹھہرنا سونیا۔ یہ میرا ایڈریس ہے —'' میں نے اسے اپنا پاکستانی کارڈ دیتے ہوئے کہا۔

''پھر روس آؤ گے — تو ..... تمہیں اس سے محبت ہو جائے گی۔ ایسے ہی ہوتا ہے ہمیشہ۔ میں نے دیکھا ہے۔''

''مجھے روس سے بڑی محبت ہے سونیا — روس نے دنیا کو بہت کچھ دیا ہے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کم از کم اس نے ڈیموکریسی کا وہ ظلم عام نہیں کرنے دیا جو جمہوریت کے خمیر میں موجود تھا ___"

"لیکن ابھی تم یہ نہیں مانتے ناں کہ اب ساری دنیا کا مستقبل سوائے کمیونزم کے اور کچھ نہیں ___" ایک دن آئے گا مان لوگے۔"

اگر کافرنیاں کے کنارے باباجی کا آنسو میرے ہاتھ پہ نہ گرا ہوتا تو شاید اس لمحے اور کچھ نہیں تو اس کا دل رکھنے کے لئے میں اس سے اتفاق کرتا ___ لیکن پتہ نہیں کیوں اب میں اس آنسو سے غداری نہیں کر سکتا تھا، ہمیشہ کے لئے اس نے میرے کئی اندیشے ختم کر دیئے تھے۔

"کچھ دیر کے لئے ہاں ___ ہو سکتا ہے چند صدیوں کے لئے کمیونزم ہی ساری دنیا کا واحد علاج ہو ___ پر کوئی انسان ساختہ ازم ہمیشہ کے لئے انسان کے دکھوں کا علاج نہیں ہو سکتا سونیا ___ آدمی جو کچھ اپنے لئے سوچتا ہے اس میں سقم ہوتا ہے نقص ہوتا ہے ___ ناپائیدار کوئی پائیدار حل نہیں سوچ سکتا ___ جب تک آدمی اپنی رضا سے خوشی سے بانٹنے کا فن نہیں سیکھتا ___ خدا کی راہ میں دینے پر راضی نہیں ہوتا تب تک برابری کا کمیونزم سے بہتر طریقہ کوئی نہیں ہے ___"

"کمیونزم ہمیشہ کے لئے آیا ہے اور ہمیشہ ٹھہرے گا دنیا کے ایک ایک کونے میں۔"

"بھولی لڑکی ___ معصوم روح ___ پہلے فرش دھلائے جاتے ہیں۔ قالین بچھتے ہیں۔ جھنڈیاں لٹکائی جاتی ہیں۔ اصلی دولہا آخر میں آتا ہے ___ حالانکہ بہت پہلے سے اس کے لئے تیاریاں شروع ہو جاتی ہیں ___ یہ تمام ازم تیاریاں ہیں۔"

"اور اصلی دولہا کون ہے؟"

"اسلام! ___" سفید چینی داڑھی والے خاموش باباجی نے مجھ سے کہلوایا۔

"جیسا اسلام پاکستان میں آیا ہوا ہے۔ افغانستان ایران میں رائج ہے ___ سعودی عرب

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

میں جیسے اسلام کی خبریں گرم ہیں ___ وہ؟ ___

میں نے پہلی مرتبہ اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھا۔ وہ ایسے بدکی جیسے میں چڑی مار تھا اور چڑیا پکڑ کر جال میں ڈالنے والا تھا۔

"سونیا ___ یہ بھی کوششیں ہیں ادھوری ادھوری ___ نقائص سے بھری لیکن جس نظام کی میں بات کر رہا ہوں اس میں انسان کسی انسان کے خوف سے، سزا کے ڈر سے، کسی خفیہ ایجنسی سے مغلوب ہو کر اپنے حقوق نہیں چھوڑے گا بلکہ اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لئے ہر قربانی دے گا۔ اسے علم ہو گا کہ مخلوق کے لئے اوّل و آخر خالق کا حکم ہی درست ہے۔ اس نظام میں عام آدمی کو معلوم ہو گا کہ سب کچھ تج کر ہی اللہ کا قرب حاصل ہو سکتا ہے۔ چھوٹے آدمی جنت کے لالچ میں سب کچھ چھوڑیں گے بڑے آدمی رضائے الٰہی کو مدِنظر رکھ کر سب کچھ قربان کریں گے ___ انسان کے بنائے ہوئے کسی نظام میں یہ امید نہیں ___ بغیر امید کے نیکی کا عمل مشکل ہو جاتا ہے۔ کمیونزم میں مالی منفعت جاتی ہے۔ اس کے عوض غریبی ضرور ملتی ہے لیکن کسی قسم کی جزا کی امید نہیں ہوتی ___ ایسے نظاموں میں جب آدرشی آدمی موجود ہوتا ہے تو نظام چلتا ہے پھر ایک جنریشن اپنی ملکیت کی قربانی دیتی ہے ___ دوسری جنریشن ڈھیلی پڑ جاتی ہے۔ اس کو دبا کر زبردستی منا کر آدرش پہ چلانا پڑتا ہے لیکن تیسری پود تک زنجیر کی کڑیاں ٹوٹنے لگتی ہیں۔ جگہ جگہ اختلاف رائے سر اٹھانے لگتا ہے۔ چوری چوری ___ جگہ جگہ سوال پوچھے جاتے ہیں لیکن جواب دینے والا کوئی نہیں ہوتا ___ بتاؤ سونیا ___ عام آدمی ___ معمولی آئی کیو کا آدمی لالچی حریص ___ اس دنیا کی آرزوؤں کا پتلا ___ وہ بھلا وعدے کے بغیر کیسے نیک ہو سکتا ہے۔ کتنی دیر تک نیک رہ سکتا ہے ___ چاہے وہ وعدہ وعدۂ فردا ہی کیوں نہ ہو ___"

وہ گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ رات کی بتیوں میں اس کا چہرہ بہت ہی زرد

www.iqbalkalmati.blogspot.com

نظر آنے لگا۔

"مجھے معلوم نہیں تم کیا کہہ رہے ہو ــــ لیکن اب اتنا ضرور ہوگا دنیا کو اپنے وسائل برابر کرنے پڑیں گے۔ غریب انسان ہمیشہ مظلوم نہیں رہ سکتا۔"

"انشاءاللہ ــــ"

"کمیونزم ہی واحد علاج ہے۔ ساری دنیا اس کی لپیٹ میں آئے گی۔"

"ہاں آئے گی ــــ"

"جب تم مانتے ہو تو پھر جھگڑتے کیوں ہو ــــ؟" اس نے بلی سی ناک سکوڑ کر کہا۔

"اس کی لپیٹ میں آئے گی ضرور لیکن ہمیشہ نہیں رہے گی۔ جب لینن جیسے آدمی آنے بند ہو جائیں گے۔ جب مثال باقی نہ رہے گی۔ پیغام بے اثر ہو جائے گا۔ . . ."

"ہم تمہاری طرح فرد پرست نہیں ہیں۔"

"تم بھی فرد پرست ہو سونیا ورنہ لینن لینن نہ ہو رہی ہوتی سارے روس میں۔"

"اچھا تمہارے پیغمبر کو گزرے تو چودہ سو سال ہوئے ــــ تمہارے پاس تو اب مثال موجود نہیں ہے ــــ"

میں نے محسوس کیا کہ باباجی نے میرے کندھے پہ ہاتھ رکھا اور نظروں میں مجھے اکسایا۔

"اول تو یہ انسان کا ساختہ ازم نہیں کہ یہ مثالوں کا محتاج ہو ــــ اور پھر ہمارے لئے تو قطب ابدال ولی ــــ اللہ کے نیک بندے ہر وقت آتے رہتے ہیں۔ پھر احیائے اسلام کے لئے مہدی آئیں گے۔ ہم سب حرص کے بندے مادہ پرستی چھوڑ دیں گے کیونکہ ہمیں معلوم ہوگا ــــ وہاں اوپر ہمارے لئے جنت میں کوٹھیاں بن رہی ہیں یہاں دنیا میں ہمیں تقویٰ کے شناختی کارڈ ملنے والے ہیں ــــ"

اس نے لمبی آہ بھری اور بولی ــــ "مجھے معلوم تھا کہ مسلمان ہمیشہ متعصب ہوتا ہے۔"

"جہاں کہیں یقین کامل ہو وہاں تعصب نہیں ہوتا فقط نظر آتا ہے ــــ"

وہ چپ ہو گئی اور اس وقت تک چپ رہی جب تک میری روانگی کی اناؤنسمنٹ نہیں ہو گئی۔

ہم دونوں بنچ سے ایک ساتھ اٹھے۔

"میرا خیال تھا ــــ" سونیا نے آہستہ سے کہا۔

"میرا بھی خیال تھا ــــ" میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

"میرا خیال تھا تم مجھے پاکستان چلنے کو کہو گے؟" اس کی آنکھوں میں ہلکی سی گلابی نمی تھی۔

"میرا خیال تھا تم مجھے ہمیشہ کے لئے روس میں رہنے کو کہو گی۔"

"آدمی کی زندگی بڑی سہولت سے گزر رہی ہوتی ہے۔ ہر طرح کا آرام میسر ہوتا ہے میخل ٹھیک کہتا ہے کہ جب بہار باغ میں پورے جوبن پر ہوتی ہے تو کہیں سے ایک کالا ناگ نکل کر آتا ہے اور سب سے اونچی شاخ پر بنے ہوئے گھونسلے تک پہنچ جاتا ہے۔ پھر پھولوں کی خوشبوؤں میں، پھلوں کے بوجھ سے لدی ڈالیوں پہ رنگ ہی رنگ کے درمیان وہ گھونسلے کے تمام انڈے پی جاتا ہے۔" سونیا بولی۔

"کالا ناگ میں ہوں سونیا ــــ؟"

"تم نہیں ــــ نہیں تم نہیں ــــ وقت!"

ہم دونوں کے ہاتھ ایسے پیوستہ تھے جیسے ڈالی کے ساتھ پتے۔ پھر میں نے اسے ہلکا سا جھٹکا دے کر اپنی طرف گھسیٹا۔ وہ میرے سینے سے آ لگی جیسے وہ اسی شکل کی بنی ہوئی تھی۔ چند ثانیے وہ میرے ساتھ لگی رہی۔ یہ وقفہ ہر قسم کے اختلافات سے پاک تھا۔ ہم دونوں اتنے قریب تھے جتنا فطرت نے ہمیں پیدا کیا تھا۔ پھر اس نے اپنا توازن درست کیا۔ میں نے اس کے روسی بالوں کو بوسہ دیا۔ اس نے اپنی گھڑی کو

www.iqbalkalmati.blogspot.com

درست کرتے ہوئے کہا:

'جاؤ سمرو ___ بہت دیر ہو گئی ہے ___'

ہوائی جہاز کی آخری سیڑھی پر پہنچ کر میں نے ایئر پورٹ کی طرف دیکھا ___ میں روس سے پی ایچ ڈی کی ڈگری اور ایک گہری الجھن لے کر اپنے وطن لوٹ رہا تھا۔ ساری طرف روس نہ تھا۔ ایک اداسی تھی۔ آمد و رفت کی اداسی۔

میں نے لمبی سانس کے ساتھ اپنی سیٹ پر بوجھ ڈالا۔

حجابات کی بھی کوئی انتہا نہیں ___ یہ پردے ہمیشہ دلوں کے درمیان حائل رہے۔ رسم و رواج ___ مذاہب ___ ماں باپ اور بیسویں صدی کے نیم پختہ مرد و عورت کے لئے نظریات ___ شاید وہ ایسی کمیونسٹ نہ تھی جس کا عمل پختہ ہو۔ میں ایسا مسلمان نہ تھا جوشالی کہلائے ___ ہم دونوں کے مسلک فقط نظریے تھے ___ لیکن بیسویں صدی میں نظریے کی شکست میں سارے انسان کی شکست تھی۔

ہم دونوں اپنے اپنے نظریے کی وجہ سے لہروں کی طرح ٹکرائے اور پھر لوٹ گئے ___ لیکن پتہ نہیں کیوں مجھے لگ رہا تھا جیسے وہ ترکی بڈھا کافرنیل کے کنارے خم ٹھونک رہا ہو ___ داد دے رہا ہو کہ بچے خوب لڑے تم!

طیارہ رات کے اندھیرے میں روس کو بہت پیچھے چھوڑ چکا تھا۔ نیچے کہیں اکا دکا روشنیاں شہر کی سرحدوں پر روشن رہ گئی تھیں ___ سونیا کہیں اس اندھیرے میں کسی بس پہ کھڑکی میں بیٹھی گھر لوٹ رہی تھی۔ اس کا چھوٹا سا گیلا رومال مٹھی میں بند تھا اور وہ سوچ رہی تھی شکر ہے آج میں نے تھرڈ ورلڈ کے اس آدمی سے اتفاق نہیں کیا جو میرے نظریے سے محبت نہیں کرتا تھا ___

اس شک کے باوجود جو میرے دل سے اٹھ رہا تھا اور اس اعتراف کے باوصف جو سونیا کے دل سے نکل رہا تھا، مجھے مینگل کی ایک نظم آہستہ آہستہ یاد آ رہی تھی۔ واریا، مینگل اور

میں "اجنبی شہید" کی قبر دیکھنے گئے تھے۔ قریب ہی ایک نوبیاہتا جوڑا کھڑا قبر سے نکلنے والی چھوٹی سی جوالا مکھی کو دیکھ رہا تھا۔ یہ خوبصورت شعلہ قبر کے اوپر چھوٹے سے ستارے میں جل رہا تھا۔ واریا نے مجھے بتایا تھا کہ نوبیاہتا عموماً اس قبر پہ خراج تحسین ادا کرنے آیا کرتے ہیں۔ پھر دلہن نے اپنی شادی کا گلدستہ قبر کی پائنتی رکھا اور وہ دونوں بڑی عقیدت سے رخصت ہو گئے۔

مینگل نے اس گلدستے سے ایک پھول توڑ کر مجھے دیا اور اپنی نظم سنانے لگا:

"سمرو ___ سنو یہ نظم میں نے کسی کو نہیں سنائی۔ اس کا مسودہ بھی میں پھاڑ چکا ہوں ___ لیکن یہ نظم نذرانہ ہے ___ نوحہ ___ سنو"

میں تمہاری یاد کو اس طرح پیار کرتی ہوں
جیسے ایک چھوٹی سی لڑکی اپنی مردہ بلی کو گود سے نہیں اتارتی.....
بلی جو مر چکی
یادیں جو ختم ہوئیں
لیکن ابھی دفن نہیں ہو سکیں
انسان کی بدقسمتی ہے کہ اسے
ٹوٹتے ہوئے گلاسوں سے
ایئر پورٹ کے مسافروں سے
اور لینن گراڈ کے ان پھولوں سے محبت ہو
جو کسی سپاہی کی قبر پر مرجھائے پڑے ہوں ___"

میں نے سونیا کو کبھی کوئی تحفہ نہ دیا ___ اس کی سالگرہ پر بھی نہیں۔ لیکن اب مجھے لگا جیسے وہ میرے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھی ہو۔ میں دیر تک اسے یہ

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

یہ نظم کا تحفہ بار بار اُسے سناتا رہا کہ سارا روس گہرے اندھیرے میں ایسے ڈوب گیا جیسے رات میں سمندر کا وجود اور اس میں سونیا کا وجود تیرتا رہا — برچ کی لکڑی کا چھوٹا سا سفید بجرا — ہولے ہولے ڈولتا — ہچکولے کھاتا — بے پتوار — میں نظم سناتا رہا —

اور — وہ میرے ساتھ والی سیٹ پر سوگئی —